غالب، شخصیت اور عہد

تصنیف

پون کمار ورما

ترجمہ

اُسامہ فاروقی

ناشر

ادارۂ ادبیاتِ اردو

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۸۲ (انڈیا)

(سلسلہء مطبوعات ادارہء ادبیاتِ اردو شمارہ ۱۳۴)

GHALIB, SHAKHSIYAT AUR AHD

[Ghalib: the Man, the Times]

By

Pavan Kumar Varma

Urdu translation: M. Osama Faruqi

اشاعت	:	نومبر ۱۹۹۹ء
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	دو سو روپے Rs 200/-
ناشر	:	ادارہء ادبیاتِ اردو ۔ حیدرآباد ۔ (انڈیا)
سرورق	:	سعادت علی خاں
کمپیوٹر کتابت	:	جے جے کمپیوٹرس ۔ حیدرآباد ۔ Ph: 3511131
مطبع	:	او ۔ ایس ۔ گرافکس ۔ نارائن گوڑہ ۔ حیدرآباد ۔
کتاب ملنے کا پتہ	:	"سب رس کتاب گھر" ایوانِ اردو ، پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ، Pin-500082 (اے ۔ پی) ، انڈیا ۔

انتساب

اپنے پِتاجی کی یاد میں

جن کو اس کتاب کی اشاعت پر سب سے زیادہ خوشی ہوتی

اپنی ماتاجی اور بچھڑے بھیّا کے نام

○●○

فہرستِ مضامین

دیباچہ ء عمومی

اردو میں غالب شناسی کو فروغ دینے میں ادارہ ء ادبیات اردو نے بھی اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ "سب رس" میں غالب پر وقتاً فوقتاً مضامین شائع کیے جاتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر زور کی دو کتابیں روحِ غالب اور سرگزشتِ غالب ادارے نے شائع کیں۔ غالب کی پیدائش کی دو سو سالہ تقاریب ادارے کے زیرِ اہتمام منائی گئیں۔ اس سمینار میں جو مقالے پیش کیے گئے انھیں "سب رس" کے غالب نمبر میں شائع کیا جائے گا۔

دو سال قبل روسی اسکالر ڈاکٹر نتالیا پری گارنا کی تصنیف "مرزا غالب" کا اردو ترجمہ پہلے "سب رس" میں بالاقساط شائع کیا گیا بعد ازاں کتاب کی صورت میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس کتاب کا ترجمہ جناب اسامہ فاروقی صاحب نے کیا تھا جو روسی زبان کے ماہر اور اردو کے صاحبِ طرز نثر نگار ہیں۔ اس سے پہلے انھوں نے سوخاچوف کی کتاب "مخدوم محی الدین" کا ترجمہ بھی بہ راہ راست روسی زبان سے کیا تھا۔ ڈاکٹر پری گارنا کی کتاب مرزا غالب کے ترجمے کو اردو دنیا میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی خاص طور پر ترجمے

کی زبان اور اسلوب کو سراہا گیا۔ غالب کی دوسو سالہ تقاریب کے دوران ہم چاہتے تھے کہ غالب شناسی کے سلسلے کو سب رس میں جاری رکھا جائے۔ ہماری نگاہِ انتخاب پون کمار ورما صاحب کی کتاب Ghalib: the Man, the Times پر پڑی جو غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ پون ورما صاحب نے غالب کے سوانحی حالات کو فراہم کرنے کے سلسلے میں ایسے بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کی ہے جن پر اردو کے محققین نے توجہ نہیں دی تھی۔ پون ورما نے غالب کی سیرت اور شخصیت کا جائزہ اس عہد کے سیاسی سماجی سیاق میں بڑی ژرف نگاہی سے لیا ہے۔

ہم نے اسامہ فاروقی صاحب سے درخواست کی کہ وہ پون ورما صاحب سے اجازت لے کر اس کتاب کا ترجمہ کریں اسے ہم پہلے "سب رس" میں بالاقساط شائع کریں گے، یہ سلسلہ تکمیل پا جائے تو علاحدہ سے کتاب شائع کی جائے گی۔ پون ورما صاحب نے ازراہ عنایت ترجمے کی اجازت مرحمت کی۔ اسامہ فاروقی صاحب نے بڑی لگن سے یہ کام شروع کیا۔ "سب رس" میں اس کتاب کے ابواب بالاقساط شائع ہوتے رہے۔ اب یہ ترجمہ ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔ امید کہ اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

مغنی تبسم

(معتمدِ عمومی)

ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد۔

پیش لفظ

مجھے انتہائی مسرت ہے کہ میری تصنیف "غالب، شخصیت اور عہد" کا اردو ترجمہ ٹھیک اسی وقت شائع ہو رہا ہے جب ہمارے ملک کے اس عظیم شاعر کی پیدائش کی دوسو سالہ یادگاری تقاریب منائی جا رہی ہیں۔ یہ کتاب انگریزی میں پہلی بار ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ میں اس کتاب کو اردو میں لکھنے کو ترجیح دیتا لیکن جیسا کہ میرا ہمیشہ ادعا رہا ہے بد قسمتی سے میری پیڑھی کے بہتیرے افراد ثقافتی اعتبار سے یتیم ہیں: انھوں نے نہ ہی اردو کی تعلیم پائی اور نہ ہی سنسکرت کی اور اس وجہ سے وہ اپنی ثقافتی جڑوں تک پہنچنے کے لیے انگریزی کا بہ طور واسطہ سہارا لینے پر مجبور ہیں۔

انگریزی میں یہ کتاب کام یاب رہی۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، لیکن اس کے قارئین کا حلقہ انگریزی دانوں تک محدود تھا۔ یہ میرے لیے انتہائی آزردگی کا مقام تھا۔ چناں چہ جب اسامہ فاروقی صاحب نے اس کے اردو ترجمے کی تجویز پیش کی تو مجھے بے حد

مسرت ہوئی ۔ خصوصاً اس لیے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ شخص اور ممتاز مترجم بھی ہیں ۔

میں ادارہ ء ادبیاتِ اردو ، حیدرآباد کے اربابِ حل و عقد کا بھی انتہائی شکر گزار ہوں جو اردو ترجمے کو اپنے ماہ نامہ "سب رس" میں بالاقساط اور پھر اس کو کتابی شکل میں شائع کرنے پر رضامند ہوئے ۔ مجھ پر پروفیسر نصیر احمد خاں ، استاد اردو ، صدر مرکز السنہ ء ہند ، جواہرلال یونیورسٹی ، نئی دہلی کا شکریہ بھی واجب ہے جن کی اس تجویز کی کام یابی کے بارے میں مسرت بخش خوش امیدی میرے لیے ہمیشہ بڑی تسکین کا باعث رہی ۔ اور بھی حضرات ہیں جن کا میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گا ، علی سردار جعفری کا شکریہ ان کے مشفقانہ آشیرواد کے لیے اور پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی ، استاد و صدر شعبہ ء اردو ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شکریہ کہ انھوں نے پہلے پہل اس کتاب کے اردو ترجمے کی تجویز پیش کی ۔

میں اردو کا عالم نہیں ہوں ۔ میں مستند غالب شناسوں کے حضور میں بہ صد احترام سرِ تسلیم خم کرتا ہوں ۔ میں نے محض یہ سعی کی ہے کہ اس عظیم شاعر کی غیر معمولی بصیرت اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ عظیم شخص کی انسان دوستی کو اس ہنگامہ خیز عہد کے سیاق و سباق میں سمجھنے کی کوشش کروں جس میں اس کی زندگی بسر ہوئی ۔

پون کمار ورما

باب : ایک

روبہ زوال مملکت

مرزا محمد اسد اللہ خاں بنیادی طور سے ایک غیر سیاسی شخص تھے ۔ ان کی فارسی یات اور اردو دیوان دونوں میں صریحاً سیاسی نظم تقریباً نہیں کے برابر ہے ۔ گو کہ ۱۸۵۷ء ا بغاوت کے بعد ان کے خطوط میں سیاسی واقعات کا حوالہ ملتا ہے ، اس کی وجہ بیش تر یہ ، واقعہ ہے کہ اس تغیرِ عظیم اور اتھل پتھل کے ضمنی سیاسی نتائج اتنے واضح تھے کہ اس پر صرہ غیر سیاسی نہیں ہوسکتا تھا ۔ ۱۸۵۷ء سے قبل کے عہد میں قابلِ لحاظ تغیرات اور دیلیاں عمل میں آئیں ۔ جاگیردار اشرافیہ کے ایک رکن اور اپنے عہد کے شاعرِ اعظم کی یثیت سے غالب کے لیے ان واقعات کا چشم دید گواہ ہونا اور ساتھ ہی ساتھ ان میں شریک نا ناگزیر تھا ۔ ان پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ شاید ہی سیاسی واقعات سے کسی طرح کے تعلق کے اہش مند ہوتے ۔ شاعر اور فلسفی کی حیثیت سے وہ اپنی توجہ ان واقعات کی بجائے سرے دائرہ ہائے نظر ، دوسرے اہم امور اور انسان کو درپیش تکلیف دہ صورتِ حال کے

لیے مخصوص کہیں زیادہ دل کش ذرائع تفریح پر مرکوز رکھنے کو ترجیح دیتے ۔ لیکن نوشتۂ تقدیر یہی تھا کہ وہ ایک ہنگامہ خیز عہد کے چیدہ و چشم دید گواہ بنیں ۔ حالات ایسے تھے کہ ان کے لیے خود کو اپنے عہد کے ماحول سے جدا کرنا ناممکن تھا ۔ خود اسے چاہے وہ تسلیم نہ بھی کرتے رہے ہوں ان کا ردِ عمل اکثر سیاسی ماحول کا ساختہ پر داختہ ہوتا تھا ۔ اور مختلف مواقع پر ان کے طرزِ عمل کے تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے کتنی شدت سے اسے اپنے باطن کا ایک جزو بنالیا تھا ۔ سیاسی پس منظر سے ان کا تعلق نہ صرف غالب کی شخصیت کو سمجھنے میں بلکہ گذشتہ صدی کے دوران دہلی اور ہندستان کو اپنے نرغے میں لے لینے والے تغیرات کے چکر میں پھنسے سارے جاگیردار طبقے کے ردِ عمل کی تفہیم میں ہماری مدد کرتا ہے ۔

غالب کے سالِ پیدائش ۱۷۹۷ء سے قبل ہی مغلیہ سلطنت روبہ زوال ہوچکی تھی ۔ ایک صدی کے دوران اورنگ زیب کی وسیع و عریض مملکت دہلی اور اس کے اطراف چند مربع میل کے علاقے تک محدود ہوچکی تھی ۔ ۱۷۸۸ء میں مغل بادشاہ شاہ عالم کو روہیلہ فوجی قسمت آزما غلام قادر نے ، جس نے دہلی پر عارضی طور سے قبضہ کر لیا تھا ، اندھا کر کے قید کرلیا ۔ غلام قادر کی پس پائی کے بعد مرہٹوں نے شہر کو اپنے قبضے میں لے لیا اور شاہی خاندان کی خودداری کو برسرِ عام صدمہ پہنچانے میں روہیلوں سے سبقت لے گئے ۔ ۱۸۰۳ء میں افق پر حال میں نمودار ہونے والے فرماں روائی کے دعوے دار انگریزوں نے مرہٹوں کو دہلی کے قریب واقع گاؤں پت پر گنج میں شکست دی ۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ عالم لال قلعے کے ایک بالا خانے میں بیٹھے اس لڑائی کی پیش رفت کی خبر لے رہے تھے ۔ انگریز سپہ سالار لارڈ لیک کو شاہ عالم نے ۱۶ / ستمبر ۱۸۰۳ء کو اپنے دربار میں باریاب کیا ۔ بہت جلد برطانوی تسلط کا زیریں ڈھانچہ مستقل بنیاد پر قائم ہوگیا ۔ مغل بادشاہ کو انگریزوں کا وظیفہ خوار بنادیا گیا اور ان کے گزارے کی رقم سالانہ ساڑھے گیارہ لاکھ روپیے مقرر ہوئی ۔ کشمیری دروازے کی بیرونی حدود میں برطانوی حکومت پر نگرانی کے لیے ایک انگریز رزیڈنٹ سکونت پذیر ہوگیا ۔ سیاسی اقتدار بالفعل انگریزوں کو منتقل ہوگیا ، ساتھ ہی ساتھ مغل بادشاہ کو ازروئے قانون فرماں روائی کی خوش فہمی میں مبتلا رہنے کی اجازت دے دی گئی ۔

یہ وہ سیاسی نیم ظلمات کا ماحول تھا جس میں غالب پیدا ہوئے ۔ قانونی مفہوم میں

ـغل بادشاہ ہی مقتدرِ اعلیٰ تھا۔ بکسر میں اپنی فتح کے بعد انگریز مغل بادشاہ سے ۱۷۶۵ء میں ـض دیوانی بنگال کے حصول میں کام یاب ہوئے تھے۔ یہ معاہدہ خود اس امر کی شہادت تھا ۔ مغل بادشاہ بلاشبہ اس سیاسی اقتدار کا حامل تھا جس کی رو سے مراعات بخشی اور عطا کی ـاتی ہیں۔ قانوناً ۱۷۶۵ء کے بعد اس کے برخلاف طے ہونے والے کسی معاہدے کی غیر ـجودگی میں بادشاہ کا مقتدرِ اعلیٰ کا یہ موقف برقرار تھا۔ چناں چہ نظری اعتبار سے انگریز ـغل بادشاہی کے چوکھٹے میں ماتحت لگان داروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن لارڈ ولزلی کی ـسلمہ پالیسی یہ تھی کہ برائے نام مغل اقتدارِ اعلیٰ کا وقتاً فوقتاً زبانی اعتراف انگریزوں کے ـل سیاسی تسلط کے قیام کے اہم کام میں ہرگز مخل نہ ہو۔ یہاں اس کا اور اس کے ـنشینوں کا مقابلہ شاہ عالم کے زمانے سے چلی آرہی، قانونی اقتدارِ اعلیٰ کو دوام بخشنے والے ـام دستوری لوازم سے مضبوطی کے ساتھ چمٹے رہنے کی پالیسی سے تھا۔ شاہ عالم اور ایک حد ـ اس کے جانشین برائے نام مغل اقتدارِ اعلیٰ کی انگریزوں کی طرف سے قبولیت کو اشتباہ ـں ڈالنے والی تمام کوششوں کے خلاف جان توڑ کر لڑے۔ اگر چہ کہ انگریز خود کو فرماں ـائی کی مستحق فاتح نسل کا نمائندہ سمجھتے تھے، مغل بادشاہ اپنی وظیفہ خوار حیثیت سے واقف ـتے ہوئے بھی جماعتِ وابستگان اور لگان داروں سے متوقع مراسمِ دربار سے انحراف کی ـریزوں کی تمام کوششوں کو بے ادبی اور شوخ چشمی پر محمول کرتے رہے۔

مغل شاہی خاندان کا اب بھی ذہنوں پر ایک دبدبہ تھا جو صدیوں تک غیر منقطع ـ پر حکومت کرنے والے شاہی سلسلے ہی کو میسر ہوتا ہے۔ مرہٹوں اور یہاں تک کہ ـریزوں کو بھی اپنی بالفعل حکومت کو سیاسی و قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے مغل بادشاہ ـ نام کی ضرورت تھی۔ عام آدمی کے لیے بادشاہ سلامت اپنے محدود اختیارات کے ـجود حضرت ظلِ سبحانی، صاحب قرانِ ثانی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہٗ جہاں پناہ تھے۔ لال قلعے ـدیوار کے اندر ان کا فرمان سب سے برتر تھا۔ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کو قانونِ ـن الاقوام کے تحت سفرا کے لیے مخصوص استثنائی حقوق حاصل تھے اور مراسمِ دربار پہلے ـطرح برقرار تھے۔ برطانوی رزیڈنٹ بادشاہ کے دربار میں ویسے ہی حاضر ہوتا تھا جیسے ـسرے درباری: وہ نقار خانے کے پاس سواری سے اترتا تھا اور بقیہ فاصلہ پیدل طے کرتا

تھا۔ فرحت اللہ بیگ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے عہد کے ایک مشاعرے کی اپنی معتبر تشکیلِ جدید میں بیان کرتے ہیں کہ کیسے اس وقت کے ایک عالم کریم الدین کے، جن کے مکان میں مشاعرہ منعقد ہورہا تھا، پسینے چھوٹ گئے، جب انھیں بادشاہ کے حضور میں پیش ہونے کے لیے کہا گیا۔ "مجھے کیا خبر تھی کہ بارگاہِ جہاں پناہی میں یاد ہوگی ۔۔۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔" مولوی کریم الدین کو اندر پہنچاتے ہوئے چوب دار نے آواز دی: "ادب سے، نگاہ روبہ رو، حضرت جہاں پناہ سلامت، آداب بجا لاؤ۔" اور مولوی کریم الدین جو اس ملاقات کی تیاری میں درباری آدابِ مجلس کا سبق اچھی طرح پڑھ کر آئے تھے دہرے ہوکر سات تسلیمات بجالائے۔ اختیارات سے محروم آخری مغل بادشاہوں نے شاہی طور طریق برقرار رکھے تھے۔ ایک انگریز کے روز نامچے میں، جو ۱۸۲۸ء میں شاہ اکبر ثانی کے دربار میں برطانوی سپہ سالار لارڈ کومبرمیر کی حاضری کے وقت موجود تھا، ہمیں یہ اندراج ملتا ہے:

> "اپنے بلند رتبے کا لحاظ رکھتے ہوئے معمّر بادشاہ نے سپہ سالار پر اس وقت جب وہ نذر پیش کرنے کے لیے پاس آئے ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر بھی اظہارِ التفات نہیں کیا ۔۔۔ ہماری جماعت کے بقیہ افراد کو بھی اس وقت جب ہم ایک ایک کرکے آگے بڑھے، سلام کیا اور تین تین طلائی مہریں پیش کیں، بادشاہ نے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ۔۔۔"

اس میں شک نہیں کہ گذشتہ شان و شوکت کا فقدان تھا۔ نذر کی رقم پہلے سے کم تھی، بادشاہ کی طرف سے مرحمت کی جانے والی خلعتیں کم قیمت تھیں اور شاہی جلوس جاہ و جلالِ خسروی کے مظاہرے کی بہ جائے ایک تماشا ہوکر رہ گیا تھا۔ لیکن بادشاہ اب بھی سماجی اور سیاسی نظام کا محور تھا۔ عید تیوہار اور جشن کے موقعوں پر اسے اب بھی اناج کی سات اقسام، مونگے اور چاندی میں تولا جاتا تھا گو کہ مالی مجبوریوں کی وجہ سے بادشاہ کو سونے اور ہیرے جواہرات میں تولنے کی پرانی روایت کو برقرار رکھنا دشوار ہوگیا تھا۔ بقرعید کے موقعے پر عید گاہ یا دیوانِ عام میں رسمی طور سے اونٹ کی قربانی دینا اب بھی ان کے

فرائض میں شامل تھا اور ان کی سال گرہ اب بھی سرکاری جشن کی تقریب سمجھی جاتی تھی ور اگر بادشاہ بیمار پڑیں تو ان کی شفایابی کی خوشیاں پُر تکلف غسلِ صحت کے موقع پر دھوم سے منائی جاتی تھیں ۔ عہدِ گذشتہ کی طرح لوگوں کو بادشاہ کی مصروفیات سے واقف کرانے کے لیے روزانہ درباری اطلاع نامہ اب بھی جاری کیا جاتا تھا ۔ رؤسا اب بھی ان کے عطا کیے ہوئے خطابوں سے مخاطب کیے جاتے تھے ۔ دہلی والوں کے لیے جہاں پناہ اب بھی حکم رانی کرتے تھے چاہے اس تخت سے ہی سہی جس کی چمک دمک ماند پڑتی جارہی تھی ۔ ان کے دنیوی اختیارات کم ہوگئے تھے لیکن وہ " پیرو مرشد " اب بھی تھے ۔ ان کا حکم رانی کا دعویٰ اب بھی شک و شبہے سے بالاتر تھا گو کہ ماننا پڑتا تھا کہ ان کے برے دن آگئے تھے ۔ یہ احساس دہلی کی دیواروں کے باہر بھی عرصہ ء دراز تک برقرار رہا ۔ چھوٹے والیانِ ریاست کے جانشینوں کی توثیق کی درخواستیں اب بھی مغل بادشاہ کے حضور میں پیش کی جاتی تھیں ۔ ہول کروں یعنی ان مرہٹہ سرداروں کے سکوں پر ، جو اب زیر دست نہیں رہے تھے ، تکاجی راؤ دوم (۱۸۴۴ء تا ۱۸۸۶ء) کے عہد تک شاہ عالم ثانی کا نام کندہ رہتا تھا ۔ اسی طرح ایک اور سابقاً زیرِ دست ریاست یعنی گوالیار کے سندھیار جواڑے کے سکوں پر شاہ اکبر ثانی کا سجع ۱۸۸۶ء تک یعنی مغل شاہی سلسلے کے انگریزوں کے ہاتھوں خاتمے کے دو دہوں سے بھی زاید عرصے تک کندہ رہتا تھا ۔

غالب کے لیے جو جاگیردار اشرافیہ کے ایک رکن ہونے اور اس ترکی نسل سے ہونے کے دعوے دار تھے جس نے مغل حکومت کے قیام میں ہاتھ بٹایا تھا مغل حکومت کا ظاہری تسلسل اعلیٰ ترین سطح پر شاہانہ و جاگیردارانہ طرزِ زندگی کی مناسبت اور جواز کی توثیق تھا ۔ اس توثیق سے ان تبدیلیوں کے پیشِ نظر جو جاگیرداری کی سیاسی و معاشی بنیادوں کو تیزی سے کھوکھلا کر رہی تھیں ایک اہم نفسیاتی ضرورت کی تکمیل ہوتی تھی ۔ دہلی کے دوسرے باشندوں کی طرح غالب بھی مغل حکومت کے جواز کو امرِ بدیہی مانتے تھے ۔ وہ مغل دربار سے رسائی کے آرزو مند تھے اور ناکامی کی صورت میں دوسروں کے رسوخ پر کشیدہ خاطر ہوتے تھے ۔ وہ مغل دارالحکومت کا اپنا اصلی حلقہ ، عمل سمجھتے تھے اور فی الحقیقت اس کا کوئی ثبوت نہ ہونے کے باوجود اس بات کے دعوے دار تھے کہ یہ شہر " میرے اجداد کا

اصل مسکن " ہے۔ دربار سے ان کا تعلق واضح تھا۔ ۱۸۵۴ء میں شیخ محمد ابراہیم ذوق کی وفات کے بعد انھیں سرکاری طور سے شاعری میں بادشاہ کا استاد مقرر کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ پہلے ہی سے ولی عہد کے استاد تھے۔ چار سال قبل بہادر شاہ نے انھیں مغل شاہی خاندان کی فارسی نثر میں تاریخ لکھنے کا کام تفویض کیا تھا۔ ملک الشعرا کی حیثیت سے اور ویسے بھی غالب نے مغل بادشاہ کی مدح میں بے شمار مبالغہ آمیز قصیدے لکھے تھے۔ شاعری میں بہادر شاہ سے اپنے اختلافات کے باوجود انھوں نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں لکھی جسے شاہی حکومت یا خود بادشاہ کی بے احترامی پر محمول کیا جاسکے۔ غالب کے بالارادہ اور شدت کے ساتھ برطانیہ نواز روزنامچے " دستنبو " تک میں بادشاہ کا کوئی تحقیر آمیز ذکر نہیں ملتا۔ کچھ بھی ہو مغل بادشاہ آخر کار اس سماجی نظام کا ضامن تھا جس میں غالب کی جڑیں پیوستہ تھیں۔ اشرافیہ کے ایک رکن کی حیثیت سے مقررہ نظامِ حیات میں غالب کا اپنا مقام شاہی کے واضح تسلسل پر منحصر تھا اور اس تعلقِ باہمی سے حاصل ہونے والی طاقت بالفعل حکم رانوں یعنی انگریزوں کے تئیں ان کے رویے اور طرزِ عمل کے تعین میں ایک کلیدی عنصر کی حیثیت رکھتی تھی۔

بلاشبہ انگریزوں کو وقوع میں آنے والی قلبِ ماہیت کے ناقابلِ تنسیخ ہونے کے بارے میں درحقیقت کبھی کوئی شک نہیں تھا۔ انگریز صحافی ولیم نائٹن جو بہادر شاہ ظفر کے عہدِ بادشاہی میں دہلی آیا تھا۔ بے مُہر وضاحت کے ساتھ لکھتا ہے:

> " شاہی شان و شوکت کی باضابطہ نقل کرتے ہوئے موجودہ جانشین، جو ظاہر میں بادشاہ لیکن دراصل غلام ہے، شاہی کا بے معنی تزک و احتشام برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس کے پاس تختِ شاہی بھی ہے اور عصائے شاہی بھی، محل بھی ہے اور نوکر بھی ہیں، وزرا اور امرا بھی ہیں جب کہ اس کی سلطنت انگریزوں کے قبضے میں ہے۔ وہ اپنے غیر ملکی مہمانوں کی پذیرائی ایک بادشاہ کی طرح کرتا ہے اور جھوٹے گوٹے کناری کے بھدے اور بھڑکیلے بے مصرف گلوبند سے ان کو مزین کرتا ہے۔ وہ

جواہرات اور خلعت شاہی زیب تن کرتا ہے اور منصبِ شاہی
کے تمام لوازم اس کے پاس موجود ہیں لیکن حقیقی صفات
رخصت ہو چکی ہیں صرف دکھاوا رہ گیا ہے۔"

انگریزوں کے لیے مغل بادشاہ اگر برقرار تھا تو محض مروت کی بنا پر۔ اس کے دشاہی کے دعوے کو ایک حد تک شرفِ قبولیت بخشا جاسکتا تھا، وہ بھی صرف اس لیے ، نام کی بادشاہی کے مفروضے کی تائید کرنا ہی فائدہ مند ہے۔ اس چھوکھٹے کے اندر اختر لونی ر سیٹن جیسے اولین برطانوی رزیڈنٹ قلعہ، معلیٰ کے احساسات سے نبٹنے میں نک چڑھے ں کا مظاہرا کم کرتے تھے اور دربارِ شاہی کے مقررہ آدابِ مجلس کی پابندی کا زیادہ لحاظ لھتے تھے۔ تاہم جلد ہی اس محتاط خوش خلقی کی جگہ ایک نیا "مستقل مزاجی" کا رویّہ لینے لگا، دراصل مغل اقتدارِ اعلیٰ کے مفروضے کو برقرار رکھنے کے اس سارے تماشے سے لحظہ بہ ہ بڑھتی ہوئی صریح بےزاری کا ایک دوسرا، خوش نما نام تھا۔ رویّے کی یہ تبدیلی طامس نکاف اور کول بروک کے عہدِ رزیڈنسی میں آہستہ آہستہ بہ روئے کار آنے لگی اور ہاکنس لے زمانے میں زیادہ وضاحت کے ساتھ۔ برطانیہ کو اپنے سیلاب میں بہالے جانے والے ریہ، افادیت کے آئینہ دار ہندوستان کے نئے اربابِ اقتدار کی رگ و پے میں وہ روح زا اور تجدیدی جارحانہ وطن پرستی سرایت کیے ہوئے تھی جس کی رو سے برطانوی اقتدار لاقی طور سے درست تھا، انگریزوں کی تہذیب بنیادی طور سے دوسری تہذیبوں سے برتر ں اور عیسائیت نوعِ انسان کی واحد نجات دہندہ تھی۔ ایک ملحد اور پس ماندہ سماج کے ربراہ دیسی بادشاہ کے سامنے دہرے ہوکر تسلیمات بجالانا، خاص طور سے اس صورت ں جب کہ وہ بادشاہ اور یہ سماج دونوں ہی اپنے دفاع کی قدرت نہیں رکھتے تھے، اب لیف دہ بلکہ اخلاقی طور سے نامناسب بھی ہوتا جارہا تھا۔ کم و بیش اسی زمانے میں دہلی نے والا ایک برطانوی افسر، برہمی سے لکھتا ہے:

" ان " سلاطین" میں سے ہر ایک (اشارہ ظاہر
ہے مغل شہزادوں کی طرف ہے) جس کی اپنے اور اپنے خاندان
کے گذارے کے لیے ماہانہ آمدنی دس شلنگ سے زیادہ نہیں

ہے ۔ برطانوی حکومت کے نمائندے کو خطوط میں اپنے فدویِ
خاص کی حیثیت سے مخاطب کرے گا اور جواب میں اسے لکھا
جائے گا کہ " حضورِ والا کا حکم نامہ فدوی کو ملا " ۔

نوشتہ ، دیوار واضح تھا ۔ مغلوں اور بہ حیثیت مجموعی پرانی جاگیردار اشرافیہ کے برتری کے دعووں کے دن بس اب گنتی کے رہ گئے تھے ۔

اشرافیہ کے ایک فرد اور شہر کے ممتاز شاعر کی حیثیت سے غالب کی متعدد انگریز رزیڈنٹوں سے جان پہچان تھی اور ان کے بعض ماتحتوں سے غالب کے ایک حد تک دوستانہ مراسم بھی تھے ۔ تاہم مغلوں اور انگریزوں کے باہمی تعلقات کے متوازی خود غالب کے انگریزوں کے ساتھ تعلقات کی واضح تصویر پنشن کے مقدمے میں ان کی طویل جدوجہد کے دوران سامنے آگئی ۔ غالب بہ مشکل چار سال کے تھے جب ان کے والد عبداللہ بیگ خاں الور کے پاس جہاں کے راجہ کی ملازمت میں وہ تھے ، ایک جھڑپ میں مارے گئے ۔ ان کے والد کے چھوٹے بھائی نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی ملازمت میں تھے اور ترقی کرتے ہوئے مہاراجہ گوالیار کے ملازم کراتے کے سپاہی جنرل پیرون کے تحت آگرے کی قلعہ داری پر مامور ہوئے ۔ جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے آگرہ فتح کیا نصراللہ بیگ نے ہوشیاری کے ساتھ قلعہ انگریزوں کے حوالے کردیا ، جس کے لیے وہ انگریزوں کی طرف سے انعام کے بھی مستحق قرار پائے ۔ انھیں سترہ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پر چار سو سواروں کے رسالے کا افسر مقرر کیا گیا اور تاحینِ حیات بھرت پور کے قریب سونک اور سرسہ کے پرگنے جاگیر میں دیے گئے ۔ بد قسمتی سے اس کے کچھ ہی دنوں بعد نصراللہ بیگ ہاتھی پر سے گر کر مرگئے ۔ اس وقت غالب کی عمر نو سال کی تھی ۔ چوں کہ نصراللہ بیگ لاولد مرے تھے ان کی جاگیر پہلے انگریزوں کو واپسی کے بعد ان کے خسر نواب احمد بخش خان کی جاگیر میں ضم کردی گئی ۔ شرط یہ تھی کہ وہ نصراللہ بیگ خاں کے پس ماندگان یعنی بھتیجے غالب ، غالب کے چھوٹے بھائی ، نصراللہ بیگ کی والدہ (یعنی غالب کی دادی) اور نصراللہ بیگ کی تین بہنوں (غالب کی پھوپھیوں) کو گذارے کی رقم دیں ۔ یہ انتظام لارڈ لیک کے ۴ / مئی ۱۸۰۶ء کو جاری کیے ہوئے اور کلکتہ میں گورنر جنرل اور ان کی کونسل کے منظورہ ایک پروانے میں کیا گیا تھا ۔ اس پروانے کی رو سے

ب احمد بخش خاں اپنی حال میں وسعت دی ہوئی جاگیر سے انگریزوں کو واجب الادا لگان
پچیس ہزار روپے کی رقم سے دس ہزار روپے کی تخفیف کے مستحق قرار دیے گئے تھے
۔ وہ نصراللہ بیگ کے پس ماندگان کو گذارے کی ادائگی کا انتظام کرسکیں ۔ نزاع اس لیے
روع ہوئی کہ احمد بخش خاں کا کہنا تھا کہ لارڈ لیک نے ان کو جون ۱۸۰۶ء میں ایک اور
انہ عطا کیا تھا جس میں صراحت کے ساتھ نصراللہ بیگ کے پس ماندگان کے گذارے کی
صرف پانچ ہزار روپے سالانہ مقرر کی گئی تھی ۔ غالب نے اس دوسرے پروانے کو ماننے
، انکار کیا کیوں کہ ان کے خیال میں یہ یا تو جعلی دستاویز تھی یا پھر اسے احمد بخش خاں
، دھوکے سے حاصل کیا تھا ۔ خصوصاً اس لیے کہ اس کی رو سے گذارے کے مستحقین
ں سے ایک فرد ، خواجہ حاجی ، کو دراصل پس ماندگان کی فہرست میں شامل کرنے کا کوئی
ز ہی نہیں تھا ۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فورٹ ولیم میں اس دوسری دستاویز کا کوئی
راج نہیں تھا ، خصوصاً اس لیے کہ سپہ سالاروں کے لیے ضروری تھا کہ میدانِ کارزار میں
یے گئے اپنے تمام احکام کی صدر سے توثیق حاصل کریں ۔

غالب کا مقدمہ برحق تھا اور انھوں نے اسے جیتنے کی جان توڑ کوشش کی ، یہاں
ک کہ ۱۸۲۸ء میں کلکتے کا دشوار گذار سفر بھی کیا تاکہ انگریز حکام کے سامنے شخصی طور پر
ـمے کی پیروی کرسکیں ۔ اگلے دو دہوں کے دوران انھوں نے یاد دہانیوں ، عرض داشتوں
درخواستوں کا تانتا باندھ دیا ۔ ہر سطح پر مقدمہ لڑے ، دہلی کے رزیڈنٹ ، آگرہ کے لفٹنٹ
ز ، کلکتہ میں گورنر جنرل اور ان کی کونسل ، لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلسِ نظما اور
رکار خود ملکہ وکٹوریہ کی سطح پر ۔ لیکن سب بے کار ۔ یہ نہیں کہ انگریزوں میں ان کے کوئی
ں نہیں تھے ۔ گورنر جنرل کا قائمِ مقام سکریٹری سائمن فریزر اور سابق میں دہلی میں انگریز
یڈنٹ کا مددگار اور بعد میں گورنر جنرل کا پرشین سکریٹری اینڈ ریواسٹرلنگ دونوں ادیب
، تھے اور فارسی زبان کے عالم بھی ۔ انفرادی سطح پر غالب کے تعلق سے ان کا رویہ
فت کا نہیں تھا ۔ فی الحقیقت گورنمنٹ کے چیف سکریٹری جارج سونٹن نے غالب کے
ید مطلب ایک غیر معمولی نوٹ لکھا تھا ۔ لیکن اپنے انفرادی محسنوں کے باوجود غالب
ـمہ ہار گئے کیوں کہ انگریزوں کے ذہن میں بالعموم پرانے جاگیردار طبقے کے احساسات کے

تعلق سے بے اعتنائی کا ایک نیا رجحان جاگزین ہوگیا تھا ، جو دراصل خود مغل بادشاہی کے تعلق سے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی بے زاری کا ایک حصہ تھا ۔ یہ بات نہیں تھی کہ احمد بخش خاں یا بعد میں ان کے بیٹے شمس الدین کے انگریزوں کے ساتھ بہتر تعلقات تھے یا یہ کہ انھوں نے زیادہ جان توڑ کوشش کی ۔ مقدمے کا فیصلہ غالب کے خلاف انگریزوں کی ان افراد کے تعلق سے بنیادی بے زاری کی وجہ سے ہوا جن کی کوئی مالی افادیت نہیں تھی اور ساتھ ہی ساتھ جن کی سیاسی افادیت میں روز بہ روز کمی ہوتی جارہی تھی ۔ عام رجحان یہ تھا کہ اس " مفت خور طبقے " کے افراد کے مطالبوں سے سختی سے نپٹا جائے اور ان کے سماجی برتری کے دعووں کو تو بالکل درخورِ اعتنا نہ سمجھا جائے ۔ مقدمے کے حق و باطل کی کوئی اہمیت نہیں تھی ۔ سونٹن کا مفصل تجزیاتی نوٹ شاید مقدمے پر اس کی حقیقت حال کی بنیاد پر سنجیدگی سے غور کرنے کی واحد کوشش تھی ۔ باقی سب روا روی میں لکھی ہوئی مختصر تحریریں تھیں ، جن سے برطانوی مفاد سے کلیتہً غیر متعلق معاملے پر جہاں تک ہو سکے کم سے کم وقت ضائع کرنے کی پالیسی کا اظہار ہوتا تھا ۔

اس امر کو ذہن نشین کرلینا بہت اہم ہے کہ اول سے آخر تک غالب اپنے بزرگوں کی انگریزوں کے تئیں بجالائی ہوئی خدمات کے صلے میں پنشن پانے کے حق کو بدیہی مانتے تھے ۔ یہ بات خدمت اور صلے کے تعلقِ باہمی کے جاگیردارانہ تصوّر سے کلیتہً ہم آہنگ تھی ۔ لیکن انگریز عہدے داروں کی نئی نسل نے اس پشت در پشت تعلّقِ باہمی کی افادیت ہی پر اعتراض کرنا شروع کردیا تھا اور پنشن کا یہ مقدمہ بنیادی طور سے اس صورتِ حال سے نبٹنے کی غالب کی کوششوں کے اس ادراک کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے جو ہمیں اس سے حاصل ہوتا ہے ۔ لاعلاج طور پر مقروض غالب کو پنشن میں اضافے کی سخت ضرورت تھی لیکن ان کی کوشش یہ تھی کہ انھیں ان کا حق انھیں وقار کے ساتھ ملے ، سماجی نظامِ مراتب میں ان کے مقام کو دھکا پہنچائے بغیر اور اشرافیہ کے ایک رکن کی حیثیت سے ان کی کسرِ شان کے بغیر ۔ جب سائمن فریزر نے کلکتے میں ان کی پذیرائی تواضع کے ساتھ کی ، عطر اور پان پیش کیا اور وقتِ رخصت پھاٹک تک ان کی مشایعت کی تو انھیں مسرت ہوئی ۔ انھیں اتنی ہی مسرت اس وقت ہوئی جب فریزر نے گورنر جنرل کے دربار میں معزز جگہ کی

ی درخواست کو فوراً قبول کرلیا۔ غالب کو سلسلہء مراتب میں دسویں جگہ ملی جہاں وہ
ب علی اکبر خاں جیسے ممتاز شخص کے برابر اور بادشاہِ دہلی کے وکیل، بادشاہ اودھ کے
ں اور مہاراجہ نیپال کے وکیل جیسے نام ور اشخاص سے بس ایک درجہ نیچے کی نشست پر
، تھے۔ لیکن سبھی انگریز عہدے دار اتنے شائستہ نہیں تھے۔ فرانسس ہاکنس جو ۱۸۲۹ء
قائمِ مقام رزیڈنٹ کی حیثیت سے دہلی میں تعینات تھا خصوصاً نہایت گستاخ تھا۔ وہ
ماہیت کے اعتبار سے کمپنی کے نئے عہدے داروں میں سے ایک تھا جو اس حقیقی
ار کے تعلق سے جو انھیں حاصل تھا بڑا جارحانہ رویہ رکھتے تھے اور مقامی جذبات سے
ن کے لیے مجبوراً اس کے محدود کیے جانے کی صورت میں سخت ناراض ہوتے تھے۔
، بادشاہ کے علاوہ کسی اور کا بھیجا ہوا شقہ وصول کرنے سے انکار تھا۔ اس نے ولی عہد کا
ہوا گل دستہ قبول کرنے سے اس لیے صاف انکار کردیا کہ اسے ایک ادنیٰ مالی لے آیا
وہ بادشاہ کو رواج کے مطابق نذر پیش کرنا اپنے لیے باعثِ ذلت اور شرم ناک سمجھتا
تعجب کی بات نہیں کہ ہندستانی شرفا کے تئیں اس کا یہ رویّہ اور بھی تحکمانہ تھا اور
ہی سے وہ غالب کے اس دستاویز کے بارے میں محض قیاس پر مبنی شک کا مخالف تھا
بہ ظاہر لارڈ لیک کی دست خط اور مہر کا تقدس حاصل تھا۔ اس نے اس مضمون کی
ٹ کلکتہ بھیجنے میں دیر نہ لگائی کہ "مستغیث کو لارڈ لیک کے صریحاً مقرر کیے ہوئے
ے سے زیادہ کا کوئی حق نہیں پہنچتا" اور لامحالہ کلکتے کے حکام نے اس کی رائے سے
ن کیا۔ غالب نے فیصلے کے خلاف مرافعہ کیا اور سونٹن کو اس ادعا کے ساتھ مراسلہ بھیجا
کنس نے نواب شمس الدین کی طرف داری کی ہے۔ سونٹن، جو شاید غالب کی عرض
ت کو سنجیدگی سے پڑھنے والا واحد انگریز عہدے دار تھا اس نتیجے پر پہنچا کہ دعوے میں
ہے اور ہاکنس کو لکھا کہ وہ لارڈ لیک کا دوسرا پروانہ جانچ کے لیے روانہ کرے۔ طے شدہ
ے کی پھر سے جانچ پڑتال سے ہاکنس کو خوشی نہیں ہوئی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ
کے حکام اس بے حقیقت مسئلے پر اپنا اتنا بہت سارا وقت کیوں ضائع کررہے ہیں۔
ں چہ مطلوبہ پروانہ کلکتہ بھیجتے ہوئے اس نے اپنی رائے وضاحت کے ساتھ ظاہر کردی تاکہ
کو اس بارے میں کوئی شک وہ شبہ نہ رہے۔ اس نے لکھا:

" نواب (شمس الدین) نے مطلوبہ فارسی شقہ ، جس پر لارڈ لیک کی مہر کلاں اور دست خط ثبت ہیں ، ابھی ابھی بھیجا ہے اور اسے اس مراسلے کے ساتھ ملاحظے کے لیے پیش کرتے ہوئے مجھے امید واثق ہے کہ جانچ پڑتال کے بعد حکومت کو اس کے اصلی ہونے کا اسی طرح سے یقین آجائے گا جیسا کہ گذشتہ مئی میں مجھے ، اس وقت جب کہ میں نے اسد اللہ خاں کے دعوے کی بابت رپورٹ پیش کی تھی ۔ مجھے امید واثق ہے کہ حکومت اس شخص کے ادعائے باطل کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھے گی جس نے آپ کو اور مجھے اتنا پریشان کیا ہے اور نواب مذکور الصدر کو اتنا صدمہ پہنچایا ہے کہ سزا دیے بغیر اس کی اس حرکت کو نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا ۔ "

جب تک فرانسس ہاکنس اپنی رائے کا اظہار مراسلوں میں کرتا رہا کوئی وجہ نہیں تھی کہ غالب شخصی سطح پر اس کا برا مانتے ۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد ہاکنس اس وقت جب غالب اپنے مقدمے کے سلسلے میں اس سے ملاقات کو گئے ان سے بدتہذیبی کے ساتھ پیش آیا ۔ یہ بات ناقابلِ برداشت تھی ۔ غالب خود کو کوئی معمولی درخواست گذار ، جس کی خودداری کا سودا کیا جاسکے ، نہیں بلکہ انصاف کا طلب گار مدعی سمجھتے تھے ۔ ہاکنس کو مقدمے کے حق و باطل کے بارے میں اپنی ذاتی رائے رکھنے کا حق تھا لیکن ہندستانی اشرافیہ کے ایک رکن کے ساتھ پیش آتے ہوئے اسے شائستگی اور مسلمہ آدابِ مجلس سے انحراف کا کوئی حق نہیں تھا ۔ غالب نے بہت واضح الفاظ میں احتجاج کیا ۔ کلکتہ میں حکومت کے چیف سکریٹری کے نام اپنے مراسلے میں انھوں نے لکھا :

" چوں کہ میرا مقدمہ عزت مآب نائب صدرِ کونسل کے زیرِ غور ہے اور بہت ممکن ہے کہ میرا دعویٰ جلد ہی غور و خوض اور جانچ کے لیے رزیڈنٹ کے پاس دہلی بھیجا جائے گا میرے لیے یہ درخواست کرنا موجبِ فخر ہے کہ آپ

ازراہِ مہربانی میری یہ استدعا گورنمنٹ کے ملاحظے میں پیش فرمائیں کہ رزیڈنٹ دہلی مسٹر مارٹن سے میرا تعارف اس طرح کرایا جائے کہ نتیجتہً وہاں میرے ساتھ بہ حیثیت خلف نصراللہ بیگ خاں مرحوم ، جاگیردار سونک و سرسہ ضلع آگرہ ، اسی تواضع اور خوش خلقی سے پیش آئیں جس سے میرے قیام کلکتہ کے دوران دربارِ عام کے موقعوں پر عزت مآب گورنر جنرل نے مجھے سرفراز فرمایا تھا ۔

میں رزیڈنسی میں مسٹر ہاکنس کے دور میں اپنی پہلی آمد کے نتیجے میں آپ سے ایسی غیر معمولی درخواست کرنے پر مجبور ہوا ہوں جب کہ کلکتے سے واپسی پر رزیڈنسی میری پذیرائی اس طور سے ہوئی جو ایشیائی سماج کے سلسلہء مدارج میں میرے مرتبے اور مقام سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی اور میرے جذبات کے لیے حد درجہ غیر اطمینان بخش تھی ، خصوصاً اگر اس کا مقابلہ اس شائستگی اور خوش خلقی سے کیا جائے جس کے مظاہرے سے عزت مآب گورنر جنرل نے مجھے شرف بخشا ۔"

مراسلہ اس روشنی کے پیشِ نظر جو اس وقت وقوع پذیر ہونے والے تاریخی عمل پر اس سے پڑتی ہے بے حد لائقِ توجہ ہے ۔ مناسب اور شائستہ برتاؤ کے لیے انگریزوں کی تعریف اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں ان کی شکایت کرتے ہوئے غالب دراصل جاگیردار طبقے کے ان بہتیرے افراد کی تشویش کی ترجمانی کررہے تھے جو انگریزوں کی ان کے روایتی رتبے کو حقیر کرنے کی سوچی سمجھی پالیسی کے علی الرغم اسے برقرار رکھنے کی کوشش کررہے تھے ۔ اس مفہوم میں " ایشیائی سماج کے سلسلہ ، مدارج میں ان کے رتبے اور مقام " کے چبھتے ہوئے ذکر کے دو ٹوک ہونے میں کوئی شک نہیں ۔ انگریز البتہ شائستگی کی تعلیم پانے کے موڈ میں بالکل نہیں تھے ۔ ایسی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی کہ " ہدایات " جیسی کہ غالب چاہتے تھے مارٹن کے پاس بھیجی گئیں یا ان کی دوسری عرض داشتوں اور مراسلوں کے برخلاف اس

مراسلے کی وصول یابی کی انھیں اطلاع بھی دی گئی۔ اس اثنا میں پنشن کے مقدمے
سے بری خبر وصول ہوئی۔ اصلیت کی جانچ کے لیے مابہ النزاع پروانہ بمبئی کے گور
میلکم کے پاس بھیجا گیا تھا جو ۱۸۰۶ء میں لارڈ لیک سے منسلک تھے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔
نہیں تھی کہ سر جان غالب کی اس مفصّل اور نہایت مدلل عرض داشت پر غور
کرتے جو انھوں نے گورنر جنرل بین ٹنک کو الگ سے بھیجی تھی اور جسے سوئٹن
مرُوت پروانے کے ساتھ منسلک کردیا تھا۔ ہاکنس کی طرح میلکم کو بھی دیسیوں
کے ایک فرد کو، سماج میں چاہے جس رتبے کا بھی وہ دعوے دار کیوں نہ ہو،
دستاویز پر شک کرنے کی اجازت دینا قطعی نامناسب لگا ہوگا جس پر بہ ظاہر لارڈ
دست خط اور مہر ثبت تھی، خصوصاً اس صورت میں جب کہ نتیجتہً اس
انگریزوں کو کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچتا تھا۔ ایسے دعوے کی ہمت افزائی سے جاگیردار
دوسرے بے مصرف اخلاف کو بھی شہ ملتی اور انگریزوں کے خزانے پر ان کے
دعووں کے لیے دروازہ پھر سے کھل جاتا۔ ایک پیراگراف پر مشتمل نوٹ میں،
نمایاں خصوصیت سارے مقدمے کی سرسری، غیر متعلق جانچ اور اسے بے بنیا
کرنے کا رجحان تھا، میلکم نے دستاویز کی صحت کی تائید کی۔ ۳۰ / نومبر ۱۸۳۰ء کی تار
جب غالب اپنا مقدمہ ہارے۔

مقدمہ ہارنے کا غالب کی پہلے ہی سے ڈانواڈول مالی حالت پر فطری طور پر ناموا
پڑا۔ لیکن اس جاگیر دارانہ ماحول میں جس کا وہ ایک حصہ تھے یہ ہار مساوی طور پر ان
وری کی اہانت بھی تھی۔ ایک ایسے امیر زادے کی حیثیت سے جس کے اسلاف ص
اختیار اور خوش حال تھے اور استحقاق کے مطابق انگریزوں کے التفات سے مستفید
رہے تھے اس سے سماج میں ان کی وقعت بھی متاثر ہوئی۔ ان کے ہم سروں کی نظر میں
بات یہ نہیں تھی کہ ان کا مقدمہ قانونی دلائل کی روشنی میں کم زور ثابت ہوا، اہم بار
تھی کہ فرنگیوں کے ہاں ان کا اثر رسوخ برائے نام رہ گیا تھا۔ چناں چہ غالب کے لیے مق
سے یوں ہی دست بردار ہوجانا ممکن نہ تھا۔ دسمبر ۱۸۳۱ء میں، دہلی میں دربار کے موقع
غالب نے شخصی طور پر گورنر کو ایک عرض داشت پیش کی اور سکریٹری پرنسپ کے ذ

بھی ایک عرضی بھیجی۔ اپریل ۱۸۳۲ء میں انھوں نے گورنر جنرل کو اپنے مقدمے پر دوبارہ غور کرنے کے لیے لکھا۔ ایک سال بعد انھوں نے چیف سکریٹری سوئٹن کو لکھا:

"آپ کے علم میں یہ بات ضرور ہوگی کہ میرے والد عبداللہ بیگ خاں مرحوم نے ہندستان میں انگریزی حکومت کے قیام سے قبل انتقال کیا، جب کہ میں نو سال کا تھا اور میرے چچا نصراللہ بیگ خاں آں جہانی جنرل پیروں کی طرف سے آگرہ کے حاکم تھے اور برطانوی حاکموں کی فرماں برداری میں بھی اسی عہدے پر برقرار رہے اور چار سو سواروں کے رسالے کے ساتھ انھوں نے آں جہانی لارڈ لیک کی رفاقت کی اور آنریبل کمپنی کی بیش بہا خدمات انجام دیں جس کے صلے میں انگریزی حکومت کی طرف سے انھیں سونک اور سرسہ کے پرگنے جاگیر میں عطا کیے گئے جن کی تفصیل سرکاری کاغذات میں درج ہے۔ میں عاجزانہ توقع رکھتا ہوں کہ آپ براہِ کرم سرکاری کاغذات سے نصراللہ بیگ خاں مرحوم کی نیک نامی اور منصب کے بارے میں پتہ چلائیں گے اور مجھے اس مضمون کا ایک صداقت نامہ عطا فرمائیں گے تاکہ اس کے ساتھ میں ان انگریز صاحب بہادر کی خدمت میں حاضر ہوں جو میرے مقدمے کی سماعت فرمائیں گے اور تاکہ وہ میرے ساتھ عزت کا سلوک فرمائیں۔"

اس امرِ واقعہ ہی سے کہ غالب کو اپنے رتبے کے ثبوت میں ایک صداقت نامہ درکار تھا، انگریزوں کے ہندستانی شرفا کے ساتھ باہمی تعلقات کی بڑھتی ہوئی نااستواری کی نشان دہی ہوتی ہے۔ انگریز عہدے دار اپنی حکومت کے ابتدائی سالوں میں "دیسی اعلیٰ طبقے" کے افراد سے شخصی طور پر واقف رہتے تھے اور یہ واقفیت اکثر محض صاحب سلامت تک محدود نہیں ہوتی تھی۔ مگر اب رتبے کے بارے میں مقامی طور سے میسّر واقفیت، تعلیم و تربیت کی واضح نشانیاں اور زبانی تعارف کافی نہیں تھا۔ اب دہلی کے اعلیٰ عہدے داروں کو خوش

خلقی کے ساتھ برتاؤ پر راغب کرنے کے لیے انگریزوں کے صدر مقام کلکتے سے تحریر صداقت نامہ درکار تھا۔ ہاکنس کی حیثیت اب استثنائی نہیں رہ گئی تھی۔ بدسلوکی کے کہ ایک واقعے کے خلاف شکایت مسئلے کا حل نہیں تھا، خود حاکموں کی طرف سے حسب نسد کی تصدیق ضروری تھی۔

اور پھر اس امر کی کوئی تحریری شہادت نہیں ہے کہ غالب کو مطلوبہ صداقت ناہ مل گیا۔ اسی سال کچھ دنوں بعد انھوں نے چیف سکریٹری کو ایک اور خط لکھا، جس کے سا اس بار گورنر جنرل کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ بھی منسلک تھا۔

"خدا کا شکر کہ حاکمِ وقت کلیتہً انصاف پسند ہے اور حق و باطل میں فرق کرنا جانتا ہے لیکن مجھے یہ عرض کرتے ہوئے افسوس ہے کہ اس عہدِ مبارک میں میرے معاملے کی یک سوئی ابھی تک نہیں ہو پائی ہے اور میرے اوصاف کی قدر نہیں ہوئی ہے۔

میں نے آپ کی شان میں ایک غزل اور عزت مآب گورنر جنرل کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ پہلے بند میں میں نے اپنی خواہشات کا اظہار کیا ہے اور نیاز مندانہ توقع رکھتا ہوں کہ کسی مناسب وقت اسے گورنمنٹ ہاؤس میں عیدِ نصاریٰ (کرسمس) کے موقع پر بہ طریقِ احسن پڑھا جائے گا۔ امید کرتا ہوں کہ جناب والا اس عرض داشت کے جواب میں مجھے اپنے دست خطی پروانے سے نوازیں گے اور اگر جناب والا مذکورہ غزل اور قصیدے کے بند کو کسی فارسی اخبار میں شائع کرنے کی ہدایت دیں تو میں اسے اس امر کے معتد بہ ثبوت پر محمول کروں گا کہ مذکورہ اشعار جنابِ والا کو پسند آئے اور اس سے میری ہمت افزائی ہوگی کہ جناب والا کے مزید لطف و کرم کی طرف سے پر امید رہوں۔"

خط دو وجوہ سے نہایت دل چسپ ہے: اول یہ کہ جواب میں غالب چیف سکریٹری

کے دست خطی پروانے کے خواہش مند تھے۔ دوم یہ کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ چیف سکریٹری غزل اور قصیدے کے بند کو کسی فارسی اخبار میں شائع کروائیں۔ چوں کہ دو ٹوک صداقت نامہ جاری ہونے کے آثار نہیں تھے ضروری تھا کہ اسی مقصد کے حصول کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کیے جائیں۔ اگر چیف سکریٹری درخواست منظور کرتے ہیں تو امید تھی کہ ان انگریز عہدے داروں پر جن سے اپنے مقدمے کے سلسلے میں غالب کا سابقہ پڑتا تھا اس کا خاطر خواہ اثر پڑے گا۔ اس سے ان کے اپنے ہم سروں کو ان کے پہلے جیسے رسوخ اور رتبے کا ثبوت بھی مل جائے گا۔ بعض انگریز ناشائستہ تھے، لیکن بالذات صاحبِ اختیار تھے، چناں چہ ان کا ایسا لطف و کرم جو سب کو دکھائی دے اہمیت رکھتا تھا۔ گورنر جنرل کی شان میں لکھا ہوا قصیدہ جس کی وصول یابی کی اطلاع چیف سکریٹری کے دست خطی پروانے سے ملے، ان کے لطف و کرم کا ثبوت ہوگا۔ خود چیف سکریٹری کی ایما سے کسی فارسی اخبار میں شائع ہونے والی غزل سے بھی وہی مقصد پورا ہوگا (ملحوظ خاطر رہے کہ وہ چند فارسی اخبار جو اس زمانے میں شائع ہوتے تھے ہندستانی علمی حلقوں اور حلقہ، امرا میں بہ کثرت پڑھے جاتے تھے)۔ اصل مقصد وہی تھا: اس مقررہ نظام مراتب میں اپنے روایتی مقام کو برقرار رکھنا، جس کا توازن انگریزوں اور سماجی و معاشی تغیرات کی وجہ سے دن بہ دن بگڑتا جارہا تھا۔ پنشن کے مقدمے کا موافقِ مطلب فیصلہ اس میں شک نہیں کہ اس روایتی مقام کی برقراری کی بہترین شہادت ہوتا لیکن چوں کہ معاملے کی یک سوئی میں وقت درکار تھا تو فی الوقت دوسرے ذرائع سے کام لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ، کار نہ تھا۔

دہری مشکل لامحالہ یہ تھی کہ خودداری کی قربانی دیے بغیر انگریزوں سے کچھ حاصل کیسے کیا جائے۔ درخواست کرنا ناگزیر تھا لیکن کسی بھی معمولی جویائے لطف و کرم کی مانند فرومایگی سے استدعا کرنے سے تو اس کام کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔ غالب کو اس کا پورا احساس تھا اور انھوں نے پوری احتیاط سے کام لیا کہ صحیح توازن برقرار رہے۔ انگریزوں کو مراسلہ لکھنے والے غالب نہیں بلکہ " نصراللہ بیگ خاں مرحوم، جاگیردار سونک و سرسہ، ضلع آگرہ کے بھتیجے اسداللہ خاں " تھے۔ مراسلے حد سے زیادہ خوشامدانہ ہرگز نہیں ہوتے تھے۔ تمہیدی عبارت میں روایتی تحسین و آفرین کے فقرے مختصر اور اکثر، مثلاً محولہ،

بالامراسلے میں، بے ڈھنگے پن کی حد تک مختصر ہوتے تھے۔ بعض اوقات یہ با
غائب رہتے تھے۔ جب انگریز عہدے دار جیسا کہ ہاکنس کے معاملے میں ہم دیکھ چکے
استحقاق کے مطابق شائستگی سے پیش نہیں آتے تھے تو غالب شکایت کرتے تھے۔ جب
کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا تو وہ پھر بھی فورٹ ولیم سے اپنے رتبے کی توشیق کے طلب گا
کوشش کرتے تھے کہ ان کے ساتھ زیادہ شائستگی کا برتاؤ کیا جائے۔ وہ گورنر جنرل
راست مراسلت کو نامناسب نہیں سمجھتے تھے۔ مدحیہ قصائد لکھتے ہوئے وہ کسی نہ کسی
ذہن نشین کردیتے تھے کہ گورنر جنرل کو اپنی مشقِ سخن کا موضوع بناکر وہ اس پر ا
کررہے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے تھے کہ حکومت کے چیف سکریٹری سے اپنے قصیدے کی و
یابی کی اطلاع اسکے دست خطی پروانے کے ذریعے پانے کی درخواست کرتے ہوئے وہ
حدود سے متجاوز ہورہے ہیں، نہ ہی انھیں اس بارے میں کوئی شک تھا کہ ان کا قصیدہ
اہم ہے کہ گورنمنٹ ہاؤس میں کرسمس کے دن اسے پڑھا جائے۔ ۱۸۴۶ء میں لارڈ ہارڈن
شان میں لکھے ہوئے مدحیہ قصیدے میں وہ ممدوح کو نام ور ایرانی سپہ سالار افراسیاب
مماثل قرار دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ خود کو شاہِ قلم روِ ناظمان بھی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی
ایسا لہجہ بھی اختیار کرسکتے تھے جو ان کے ملتجیانہ موقف سے شاید ہی توافق رکھتا تھا۔ ۳۲
میں ان کی درخواست پرکہ ان کے مقدمے پر دوبارہ غور کیا جائے نوکر شاہی کے لیے مخصو
داؤپیچ کا مظاہرہ کرتے ہوئے گورنر جنرل نے حکم دیا کہ اس مقدمے کی جانچ پڑتال پہلے لفٹن
گورنر، آگرہ کے ہاں ہونی چاہیے۔ غالب لفٹننٹ گورنر کے ساتھ مراسلت کرتے رہے
سات سوالوں کی ایک فہرست پیش کی جن کے جواب انھیں مطلوب تھے۔ لفٹننٹ گورنر
جواب تو فراہم نہیں کیے البتہ ۱۸ جون ۱۸۳۶ء کو فیصلہ غالب کے خلاف صادر کیا۔ ا
وقت تک غالب راست گورنر جنرل کے ہاں مرافعہ کرچکے تھے۔ لیکن گورنر جنرل اور ان
کونسل نے لفٹننٹ گورنر کے فیصلے کی توشیق کی اور اس کی اطلاع دہلی میں متعینہ ایجنٹ
ذریعے بہ تاریخ ۱۷ / اکتوبر ۱۸۳۶ء غالب کو ملی۔ ایک مہینہ بھی نہیں گذرا تھا کہ غالب نے
لارڈ آک لینڈ کو، جو بینٹنک کی جگہ پر گورنر جنرل مقرر ہوئے تھے، مخاطب کیا۔ سخت کلامی
کی حدوں کو چھوتا ہوا تو نہیں لیکن درشت شکایتی لہجے کا حامل یہ مراسلہ اس تجزیے کے تعلق

سے اتنا بر محل ہے کہ یہاں اس سے از اول تا آخر نقل کرنا مناسب ہوگا۔

نہایت مؤدبانہ عرض ہے :

۱) کہ حضور والا کے اس درخواست گذار کو ایجنٹ متعینہ دہلی کے ذریعے مسٹر میک ناٹن سکریٹری کا ماہ گذشتہ کی ۱۷ تاریخ کامراسلہ اس مضمون کا موصول ہوا ہے کہ " حضورِ والا اور ان کی کونسل کا خیال ہے کہ اس درخواست گذار کے اس دعوے پر جس کو صوبہ جات شمال مغربی کے لفٹنٹ گورنر کے گذشتہ جون کی ۱۸ / تاریخ کو صادر شدہ حکم کی روسے باالآخر فیصل کردیا گیا ہے ، دوبارہ غور کرنے کی کافی وجوہ نہیں ہیں۔ "

۲) کہ یہ درخواست گذار مؤدبانہ یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ آگرہ کے لفٹنٹ گورنر کے ہاتھوں چند درچند ناانصافیوں کا مورد ہونے پر اس درخواست گذار نے مذکورہ ، صدر حاکم کے فیصلے کے خلاف جناب والا معہ کونسل کے حضور میں مرافعہ کیا تھا اور بعد ازاں گذشتہ جولائی کی ۱۴ تاریخ کو اس کے مقدمے کی ایک توضیحی روداد پیش کی تھی اور سات نکات یا استفسارات اس التجا کے ساتھ پیش کرنے کی جراءت کی تھی کہ ان کے جواب آگرہ کے لفٹنٹ گورنر سے حاصل کیے جائیں اور یہ کہ ان استفسارات اور عزت مآب لفٹنٹ گورنر ، آگرہ کے ہاں سے موصولہ ان کے جوابات پر مناسب غور و خوض کے بعد حضور والا اس درخواست گذار کے مقدمے کا فیصلہ صادر فرمائیں اور یہ درخواست گذار نہایت مؤدبانہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ یہ طریقہء کار حضور والا کی توجہ کا سزا وار تھا۔

۳) کہ یہ درخواست گذار نہایت مؤدبانہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ آگرہ کے لفٹنٹ گورنر کے ہاں سے ان سات استفسارات کے جواب حاصل کرنے اور انھیں تسلیم کرنے کی صورت میں یہ درخواست گذار نہایت مؤدبانہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ اسے ان کی ایک نقل عنایت کی جانی چاہیے تھی اور اسے ان وجوہ سے واقف کیا جانا چاہیے تھا ، جن کی بنا پر حضورِ والا نے انھیں تسلیم کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن اگر حضور والا نے آگرہ کے لفٹنٹ گورنر سے ان سات استفسارات کے جواب طلب نہیں فرمائے ، تو یہ درخواست گذار نہایت ادب سے یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ حضور والا کو ان کے

تعلق سے اس درخواست گذار کی التجا پوری کرنی چاہیے تھی۔

۴) کہ اس درخواست گذار کے لیے اب یہ التجا کرنا موجبِ فخر ہے کہ حضورِ والا ازراہِ کرم اس کے مقدمے کو ان تمام متعلقہ کاغذات کے ساتھ، جنھیں حضور کی ہندستان میں آمد کے بعد وقتاً فوقتاً پیش کرنے کا اس درخواست گذار کو شرف حاصل ہوا تھا، صدر دیوانی عدالت، کلکتہ کو منتقل فرمادیں، ان احکام کے ساتھ کہ اس درخواست گذار کے مقدمے کی جانچ پڑتال عدالت میں معینہ عمل درآمد کے مطابق کی جائے اور اگر اس درخواست گذار کا دعویٰ عدالت کی نگاہ میں حق بہ جانب قرار پائے تو اس عدالت میں حیثیت جج صدر نشینی کرنے والے حکام حضورِ والا کو ازسرِ نو مطلع کریں تاکہ حضورِ والا اس درخواست گذار کو اس کا قانونی اور جائز حق دیں، لیکن اگر وہ اس درخواست گزار کے مقدمے میں آگرہ کے لفٹننٹ گورنر کے احکام کو درست اور انصافاً جائز قرار دیتے ہیں تو وہ اس درخواست گذار کو باقاعدہ روب کاری کے ذریعے وہ تمام وجوہ سمجھائیں جن کی بنا پر انھوں نے لفٹننٹ گورنر کے احکام کی توثیق کی۔

۵) کہ یہ درخواست گذار مؤدبانہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ اگر حضورِ والا اس کے مقدمے کو دیوانی عدالت کلکتہ کو منتقلی کی مذکور الصدر التجا کو شرفِ قبولیت نہیں بخشتے ہیں تو اس کے لیے نہایت مؤدبانہ یہ التماس کرنا لازمی ہوگا کہ حضورِ والا ازراہِ کرم اس کے مقدمے کو تمام متعلقہ کاغذات کے ساتھ انگلستان منتقل فرمادیں تاکہ اس کی تحقیقات بادشاہ اور ان کی کونسل کے حضور میں ہوسکے اور حضورِ والا کا یہ درخواست گذار اپنے اخلاقی فریضے کی طرح حضورِ والا کی درازیِ عمر اور اقبال مندی کے لیے ہمیشہ دست بہ دعا رہے گا۔

اس بےریا اور موضوعِ بحث سے قطعاً انحراف نہ کرنے والے مراسلے کے بین السطور میں مراسلہ نگار کی دبی ہوئی خفگی کو آسانی سے تاڑا جاسکتا ہے۔ اس میں غالب خبردار کرتے ہیں کہ وہ رحم کے نہیں دادرسی کے طلب گار تھے، لطف و کرم کی ستدعا نہیں کررہے تھے بلکہ خود برطانوی قوانین کی رو سے جس طریقِ کار کو اختیار کرنے کا انھیں حق تھا اسی کے ذریعے اپنے جائز حق کا مطالبہ کررہے تھے۔ یہ گورنر جنرل کی اہلیتِ عدل گستری کے تعلق سے

عدم اعتماد کا اظہار تھا اور یہ بات مراسلے کی عبارت سے روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ مراسلے میں حضورِ والا کو ان کی فروگذاشتوں پر فہمائش کی گئی ہے۔ ان کو ہدایت دی گئی ہے کہ آئندہ انھیں کون سا طریقِ عمل اختیار کرنا چاہیے اور انھیں مطلع کیا گیا ہے کہ بہ صورتِ دیگر درخواست گذار کا مصمم ارادہ شاہ انگلستان کے حضور میں مرافعہ کرنے کا ہے۔ ہندستانی طبقۂ امرا کا ہر ایک فرد گورنر جنرل کو راست مخاطب کرنے کی جراءت نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن اتنے واضح برہم لہجے میں، روایتی طولانی تمہید اور مدح و ستائش اور دعائے خیر پر مشتمل اختتام سے عاری مراسلہ لکھنے کے لیے ہمت درکار تھی۔ یہ مراسلہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ غالب بھلے ہی انگریزوں کے وظیفہ خوار اور ان کے سامنے محض ایک درخواست گذار رہے ہوں لیکن ان کے خوشامدی نہیں تھے۔

قرینِ قیاس ہے کہ یہ مراسلہ انگریزوں کو برہم کرنے سے زیادہ ان کے لیے باعثِ تفنن رہا ہوگا۔ مسلمہ عمل درآمد کے مطابق درخواستِ مرافعہ لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلسِ نظما کو بھیجی جاتی تھی۔ فیصلے کے انتظار کے دوران غالب نے دسمبر ۱۸۳۶ء میں حکومت کے چیف سکریٹری میڈاک کے نام کچھ اشعار بھیجے۔ اشعار میں انھوں نے مطلع کیا کہ "میں نے حضورِ والا (گورنر جنرل) کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھا ہے۔" لامحالہ مدحیہ قصیدے کے ساتھ "وظیفے کے تعلق سے میرے مطالبات کی بابتہ" ایک عرض داشت بھی منسلک تھی۔ نہ ہی عرض داشت اور نہ ہی قصیدے کی وصول یابی کی اطلاع غالب کو دی گئی۔ اپریل ۱۸۳۷ء میں انھوں نے انگریزوں کو یاد دہانی کی کہ انھیں جواب کا انتظار ہے۔ انھیں اس مضمون کا ایک شائستہ مگر ٹکاسا جواب موصول ہوا کہ "حضورِ والا اس التفات کے تعلق سے جس کا اظہار اپنے اشعار کا ایک نسخہ بھیج کر آپ نے کیا ہے، مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔" مجلسِ نظما نے فروری ۱۸۴۲ء میں یعنی مقدمے کو ان کے ہاں فیصلے کے لیے بھیجے جانے کے چھے سال بعد، اپنی رائے کا اظہار اس ایک سطری فیصلے میں کیا: "اس دعویٰ کو جاگیر کی ضبطی * کے قبل ہی اور

---

* دہلی کے انگریز رزیڈنٹ ولیم فریزر کے قتل کی سازش کے الزام میں ۱۸۳۵ء میں فیروزپور اور جھرکہ کے نواب شمس الدین کو پھانسی دی گئی تھی۔ اس وقت ان کی جاگیر انگریزوں نے ضبط کرلی تھی اور تب سے غالب کو پنشن کی ادائگی راست برطانوی محکمۂ خزانہ سے ہورہی تھی۔

معقول وجوہ کی بنا پر مسترد کیا جاچکا ہے۔" تب ہار نہ مانتے ہوئے غالب نے خود ملکہ وکٹوریہ کے حضور میں مرافعے کی درخواست گذرانی انھوں نے گورنر جنرل لارڈ ایلن برو کو لکھا اپنے مقدمے میں صادر شدہ حکم سے غیر مطمئن یہ درخواست گذار مشفق و مہربان ملکہ ء معظمہ کے حضور میں مرافعہ کا شرف حاصل کرتا ہے۔ چناں چہ وہ نہایت مؤدبانہ یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ حضور والا ازراہ تلطف منسلکہ عرض داشت کو مشفق و مہربان ملکہ معظمہ کی خدمت میں ہم دردانہ و کریمانہ ملاحظے کے لیے بھیج دیں۔"

انگریز حیرت کے ساتھ سوچتے رہے ہوں گے کہ آیا وہ اس مستقل مزاج درخواست گذار سے کبھی چھٹکارا بھی پاسکیں گے۔ ان کے مرافعے کی متعدد عرض داشتوں پر ضروری کارروائی کرنے میں ان کا مقصد غالب کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے سے زیادہ "دیسیوں" کے فائدے کے لیے برطانوی عدل و انصاف کے "روشن خیال" بنیادی ڈھانچے کو برقرار رکھنا تھا۔ لیکن یہ درخواست گذار کبھی مطمئن ہوتا ہی نہیں تھا۔ انگریزوں کے جواب جتنے زیادہ رسمی اور سرسری ہوتے تھے غالب اتنا ہی زیادہ ان کو انھیں کے قوانین اور ضابطوں کی رو سے زچ کردیتے تھے۔

اب انھوں نے ملکہ کے حضور میں راست مرافعہ کرنے کی جراءت کی تھی۔ لامحالہ غالب نہیں سمجھتے تھے کہ ایسا کرکے انھوں نے ذرہ برابر بھی بےادبی کا مظاہرہ کیا ہے۔ طبقہ ء امرا کے ایک فرد اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے انھیں حضرت اقدس، ظل اللہ مغل بادشاہ کے دربار میں راست تقرب اور باعزت مقام حاصل تھا۔ وہ نہیں سمجھتے تھے کہ مشفق و مہربان ملکہ ء معظمہ وکٹوریہ کے ساتھ معاملہ دوسری طرح کا کیوں ہونا چاہیے۔ ان کی تہذیب میں جلیل القدر فرماں روا نام ور شاعروں کی نازبرداری کرتے اور انھیں عطیوں سے نوازتے تھے۔ وہ توقع رکھتے تھے کہ ملکہ ء معظمہ بھی ایسا ہی کریں گی۔ اس نظامِ حکومت میں جس سے وہ واقف تھے سلطنت کے ہر باشندے کو بادشاہ کے حضور میں راست مرافعہ کرنے کا حق حاصل تھا۔ نتیجتہً وہ خود کو ان کے معاملے میں دل چسپی نہ لینے والی برطانوی افسر شاہی کو نظر انداز کرتے ہوئے ملکہ سے راست مراسلت کا حق دار سمجھتے تھے۔ اسے ہم تناظر کا صریح فرق کہہ سکتے ہیں۔ انگریزوں نے، جن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مرافعے کا کیا کیا جائے اور

جن کا اسے ملکہ ٔ معظمہ کے علم میں لانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے دوبارہ کمپنی کی مجلس نظما کے حوالے کیا تاکہ "عالی وقار مجلس جیسا مناسب خیال کرے اسے طے کرے۔" جہاں تک غالب کا تعلق ہے انھوں نے سمجھا کہ ان کا استدلال صحیح مانا گیا ہے۔ چناں چہ انھوں نے بہ تاریخ ۱۵ / اگست ۱۸۴۲ء چیف سکریٹری میڈاک کو لکھا:

"میں خلوصِ دل کے ساتھ ممنون ہوں اور والاشان گورنر جنرل ہندستان اور جناب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ حضورِ والا لاٹ صاحب اور جنابِ عالی پر خداوند تعالیٰ کی رحمتِ خاص کا نزول ہو اور آپ کی تمام مساعی کو کام یابی نصیب ہو۔"

غالب کی عرض داشت کبھی ملکہ ٔ وکٹوریہ کی نظر سے نہیں گزری۔ جب غالب نے اپنی یاد دہانیوں کا سلسلہ جاری رکھا تو انھیں مطلع کیا گیا کہ: "ملکہ ٔ معظمہ کی طرف سے اس سلسلے میں ہمیں کوئی اطلاع نہیں موصول ہوئی ہے۔" غالب کے مقدمے میں مزید کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ عرض داشت پر لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتر کی کسی الماری کے خانے میں دھول جمتی رہی۔ معاملے کا تصفیہ ایک آسان سی تدبیر کے ذریعے کردیا گیا جس پر سبھی نوکر شاہیوں کو عبور حاصل ہے، یعنی اسے معلق رکھ کر۔ غالب اپنی عرض داشتیں لکھتے رہے۔ انھیں بیش تر ان کی وصول یابی کی اطلاع بھی نہیں ملی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ایک سال قبل تک وہ گورنر جنرل کیننگ کے پاس سے اپنے مقدمے کے بارے میں اطلاع کے لیے درخواست کرتے رہے تھے۔ انگریزوں کے پاس بس یہی جواب تھا کہ کاغذات انگلستان بھیج دیے گئے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد غالب کو سب سے زیادہ فکر ان کی پنشن کی بحالی کی تھی۔ اس میں اضافے کا سوال جس کے لیے وہ کم و بیش تیس سال سے مسلسل لڑتے آئے تھے، ہمیشہ کے لیے دفن ہوچکا تھا۔

غالب کی لڑائی اس بات کے لیے تھی جسے وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ ان کا ارادہ برطانوی اقتدار کے جواز کے متعلق شک ظاہر کرنے کا نہیں تھا۔ مخالف استعمار سیاق و سباق میں قوم پرستی کو معرض وجود میں آنے کے لیے ابھی وقت درکار تھا۔ انیسویں صدی

عیسوی کے ہندستان کے تغیر پذیر حالات میں بالفعل صاحبانِ اقتدار کو تسلیم کرنے ۔
، چاہے وہ افغان ہوں یا مرہٹے، جاٹ ہوں یا انگریز، وفاداریوں کی کتر بیونٹ عام دستور
بھاڑے کے سپاہیوں کی قدیم روایات کے مطابق ان کے والد نے مغل بادشاہ شاہ عالم،
کے نواب آصف الدولہ، حیدرآباد کے نظام علی خاں اور الور کے راجہ بختاور سنگھ
ملازمت کی تھی ۔ ان کے چچا نے لچکیلے پن کے ساتھ اپنی وفاداری مرہٹوں سے انگریزوا
طرف منتقل کردی تھی ۔ دہلی ہو یا لکھنو، حیدرآباد ہو، الور ہو یا آگرہ اس خاندان
وفاداریاں اتنے ہی آقاؤں کو منتقل ہوتی رہیں ۔ یہ ایسا زمانہ تھا جب وجود کا قائم رہنا وفاد
کو حرکت پذیر رکھ سکنے والی سیاسی پھرتی پر منحصر تھا ۔ غالب کے لیے بالفعل اقتدار
غاصب کو تسلیم کرنا اس لیے جائز تھا کہ یہ امر معمول کے عین مطابق تھا ۔ مزید برآں غالب
مشکل چھے سال کے تھے جب انگریزوں نے دہلی میں اپنی حکومت قائم کی ۔ جب وہ سنِ بلوغ
پہنچ رہے تھے تو اس تمام عرصے میں انگریزوں کی موجودگی ان کے لیے ایک امرِ بدیہی تھی
انگریزوں کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں ولیم فریزر جیسے بعض انگریز عہدے داروں کو
اپنا دوست اور محسن سمجھتے تھے ۔ اس غیر ملکی وجود کو خود اپنے معاشرتی ماحول کے جا۔
بوجھے تسلسل میں شامل کرکے انھیں مسرت ہوتی ۔ ایک مختلف سطح پر صریحاً سیاسی و:
کے مدِّ نظر مغل بادشاہ بھی بالکل یہی چاہتے تھے ۔ لارڈ لیک خود کو تیموریوں پر قطعی تسلط
نقیب خیال کرتا رہا ہوگا لیکن شاہ عالم نے شاہانہ، گو کہ پُر فراست عالی ظرفی کے سا؛
لارڈ لیک کو خانِ دوراں، خان بہادر سپہ سالار جیسے جانے بوجھے خطاب سے نواز کر ایسی
جسارت کے خلاف پیش بندی کی کوشش کی ۔ اسی انداز میں غالب نے اس سے نااتفاقی
سے پہلے فرانسس ہاکنس کی توصیف ناظم الملک بہادر ہیبت جنگ جیسے القاب سے کی ۔
صنعتی انقلاب سے راست مستفید ہونے والوں کی حیثیت سے انگریز سائنسی اور صنعتی دونوں
میدانوں میں طرح طرح کی ترقیوں کو بڑھاوا دے رہے تھے ۔ اپنے بہت سے ہم عصروں کے
برخلاف غالب ان کی قدر کرتے تھے ۔ کلکتے سے ایک خط میں ایک موقع پر انھوں نے لکھا تھا:
" مخفی مباد کہ دخانی کشتی ان لوگوں کی ایجادات میں سے ایک ہے ۔ یہ نسبتاً تیز رفتا رہوتی
ہے اور بارہا دخانی کشتیوں نے کلکتے سے الہ آباد کے درمیان کا فاصلہ دو ہفتوں میں

طے کیا ہے۔" وہ انگریزوں کے قائم کیے ہوئے ڈاک اور لاسلکی کے نظام کی بھی اتنی ہی قدر کرتے تھے۔ اس لیے غالب برطانوی اقتدار کو تسلیم کرنے کو راضی ضرور تھے لیکن موروثی امیر زادے کی اپنی مسلمہ حیثیت کی نفی کے بدل میں ہرگز نہیں۔ وہ ان کی جائز قانونی حیثیت پر شک کرنے کا میلان نہیں رکھتے تھے لیکن ان کی اس حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے وہ اپنی جائز قانونی حیثیت جتانے کے بھی آرزو مند تھے۔ ابتدا ہی سے وہ اس ادعا پر قائم رہے کہ اگر انگریز ان کے مقدمے میں عدالتِ عالیہ کا اختیار رکھتے ہیں تو وہ مقدمے کی حقیقت حال کی بنیاد پر دادرسی کے لیے ان سے رجوع ہوں گے لیکن ہمیشہ "ایشائی معاشرے کے نظام مراتب میں اپنے رتبے اور مقام" سے مطابقت کے ساتھ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ درخواست گزار تھے لیکن خوشامدی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ان کی مدح میں قصیدے لکھتے تھے۔ یہ شاعر کی ریاضت تھی اور غالباً اس کے لیے روزی کمانے کا واحد ذریعہ۔ قصیدہ صاحب اختیار کی سرپرستی اور اس کی طرف سے مالی فائدے کی امید میں ایک طرح کی سرمایہ کاری تھی اور اس وقت مروج مسلمہ قاعدوں کی رو سے اسے جواز بھی حاصل تھا اور قابلِ عزت مقام بھی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حکم راں شاعروں سے اس کی توقع رکھتے تھے اور اگر انگریزوں کی افتادِ مزاج ایسی نہیں تھی تو غالب ان تک رسائی کے کسی دوسرے طریقے سے واقف نہیں تھے۔ قصیدہ لکھنے کا مطلب پست غلامانہ ذہنیت کا اظہار نہیں تھا۔ یہ لازمی طور سے کاسہ لیسی کی علامت نہیں تھا بلکہ یہ تعارف کا ایک ذریعہ تھا، روایتی پیش کش تھا جس کا مقصد سرپرست اور زیرِ سرپرستی فرد کے درمیان مناسب اور باعزت تعلق کے لیے زمین ہم وار کرنا ہوتا تھا۔ بلاشبہ قصیدے میں مدح مبالغہ آمیز ہوتی تھی لیکن اس کی لفظی یا سنجیدہ تعبیر مقصود نہیں ہوتی تھی۔ غالب قصیدے بغیر کسی خاص کوشش کے ایسے لکھتے تھے جیسے کوئی بندھا ٹکا کام کیا جاتا ہے اور اکثر ان کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ اودھ کے نواب امجد علی شاہ کی شان میں قصیدہ لکھا تھا جو بعد میں معزول ہوئے۔ قصیدہ پیش ہونے سے پہلے امجد علی شاہ کا انتقال ہوگیا۔ چناں چہ باپ کی جگہ غالب نے ان کے بیٹے واجد علی شاہ کا نام شامل کردیا اور فقرہ چُست کیا "آخر تو یہ خدا ہی کی کرنی تھی۔" اس طرح کی غیر سنجیدہ حرکت کے جواز میں بہت اونچی نظیر بھی موجود تھی۔ غالب دعوے سے کہتے

تھے کہ نام ور شاعر انوری کے لیے ایک ہی قصیدے کو باری باری مختلف ممدوحوں کی خدمت میں پیش کرنا معمول میں داخل تھا ۔

غالب اپنا مقدمہ اس لیے ہارے کہ انگریزوں کا کبھی ارادہ تھا ہی نہیں کہ مقدمے کا نفس معاملہ کے لحاظ سے فیصلہ کیا جائے ۔ ان کا کام اپنے سیاسی اقتدار کو استوار کرنا اور وہ وظیفہ خوار ہندستانی امرا کی حد سے زیادہ ناز برداری کو مفید مطلب بالکل نہیں سمجھتے تھے ۔ یہ نظریاتی مغائرت تھی جس نے مرور زمانہ کے ساتھ مسلمہ پالیسی کی شکل اختیار کی۔ غالب کی کوشش یہ تھی کہ اپنی دست نگری کو خدمت اور صلے کے نظریے کا جامہ پہنائیں۔ انگریز چاہتے تھے کہ بنیادی سوالات سے سروکار رکھا جائے چاہے وہ کتنے ہی کڑے کیوں نہ ہوں ۔ مثلاً کیا یہ واقعی ضروری ہے ؟ کتنی رقم اور کتنی مدت کے لیے ؟ جاگیردارانہ طبقاتی کردار سے بالکل میل نہ کھاتا ہوا یہ نقطہ ٔ نظر غالب کے لیے سخت ناگوار تھا ۔ " روبہ زوال طبقہ ٔ امرا کے ایک رکن کی حیثیت سے ان کی آزردگی کی وجہ انگریزوں کی بہ طیب خاطر داد و دہش کی عدم صلاحیت تھی اور یہی عدم صلاحیت جو کچھ دیا جائے اسے ایک شریف آدمی کی طرح خوش اسلوبی سے قبول کرنے کی ان کی صلاحیت کو بہ روئے کار نہیں آنے دیتی تھی ۔ خلعتِ فاخرہ ، قصیدے کا مناسب صلہ یا دربارِ عام میں صحیح جگہ نہ صرف شخصی نمود و نمائش کے نقطہ ٔ نظر سے اہمیت رکھتی تھی بلکہ اس امر کے اشارے کے طور سے بھی کہ انگریز ان کے مرتبہ ، شریف زادگی کو اور نتیجتہً اس سیاسی و سماجی نظام کو قبول کرتے ہیں جس میں ہی ایسے کسی رتبے کی اہمیت تھی ۔ اس نظام کے منتہائے کمال پر مغل بادشاہ تھے ۔ وہ بھی اپنی جائز ممتاز حیثیت کے لیے لڑرہے تھے اور غالب کی طرح ان کے ہتھیار بھی وہی تھے : ادعا ، یادداشتیں ، عرض داشتیں اور مرافعے ۔ ۱۸۰۵ ء میں لارڈ ویلزلی نے اکبر شاہ ثانی کو سالانہ پندرہ لاکھ روپے بہ طور وظیفہ ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا ۔ بعد میں انگریزوں نے گیارہ لاکھ روپے سے زائد ادا کرنے سے انکار کردیا ۔ اکبر شاہ نے وعدے کی اس خلاف ورزی پر احتجاج کیا اور جب یہ بے اثر ثابت ہوا تو انھوں نے راجہ رام موہن رائے کو اپنے سفیر کی حیثیت سے مجلسِ نظما میں راست شکایت پیش کرنے کے لیے انگلستان بھیجا ۔ اگلی بار ایسی ہی اپیل بادشاہِ انگلستان کے حضور میں کی گئی جب انگریزوں نے مغل بادشاہوں کے اپنے کسی

بھی بیٹے کو جانشین نام زد کرنے کے حق میں قطع دبرید پر اصرار کیا۔ نذر پیش کرنے کے مسئلے پر بھی لڑائی ایک عرصہ ء دراز تک لڑی گئی۔ قانوناً انگریزوں کا شمار مغلوں کے وابستگان اور زیر دستوں میں تھا اور باریابی یا تقاریب کے موقع پر اپنے اس موقف کو تسلیم کرتے ہوئے وہ جہاں پناہ کی خدمت میں نذر پیش کرتے تھے۔ جب نذر کی پیش کشی کے اس دستور کو موقوف کرنے کی کوشش کی گئی تو بہادر شاہ نے پُر زور طریقے سے احتجاج کیا۔ ایک بار پھر معاملہ کمپنی کی مجلس نظما سے رجوع کیا گیا جن کا بہ ظاہر یہ منشا نہیں تھا کہ معاملہ قبل از وقت ایسی نازک شکل اختیار کرے۔ بہادرشاہ جانتے تھے کہ اس مضمون کا ایک مراسلہ لندن سے فورٹ ولیم آچکا ہے۔ غالب کی بہت سی عرض داشتوں اور درخواستوں کے بالکل مشابہ اسلوب میں انھوں نے گورنر جنرل کو لکھا:

> " جناب والا کے علوئے مزاج اور نام وری سے میں انصاف اور فراخ دلی کی اور اس امر کی توقع رکھتا ہوں کہ آپ ازراہِ مہربانی کلکتے میں سرکاری کاغذات میں تلاش کروائیں گے اور یہ پتہ چلنے پر کہ اس طرح کے احکام یورپ سے موصول ہوئے تھے ازراہ عنایت ایجنٹ کے نام گزشتہ دو سال کی واجب الادا نذر کی رقم پیش کرنے اور آئندہ بہ پابندی اس دستور پر عمل کرنے کے لیے ضروری احکام صادر فرمائیں گے۔ ایسا کرنے سے میری دل جوئی ہوگی اور آپ کی نام وری میں اضافہ ہوگا۔"

لیکن اس لکھنے لکھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، نذر پیش کرنے کا دستور ۱۸۵۱ء میں باقاعدہ موقوف کردیا گیا۔ سالانہ وظیفے میں کبھی اضافہ نہیں کیا گیا اور جانشین کے انتخاب کے حق سے مغلوں کو بالکل محروم کردیا گیا۔

غالب جس چیز کے لیے اپنی سطح پر لڑے اور ناکام رہے، بہادر شاہ اسی چیز کے لیے اپنی سطح پر لڑے اور ناکام رہے۔ اپنا حق منوانے کے لیے دوسرے ذرائع کی عدم موجودگی میں دونوں قانونی دادرسی کے لیے جم کے لڑے۔ دونوں کے مقدمے ازروئے قانونِ حق بہ جانب تھے۔ دونوں نے دہلی میں انگریز عہدہ داروں کو نظر انداز کرتے ہوئے لندن میں مجلسِ

نظما کے پاس مرافعہ کیا۔ جب یہ بے سود ثابت ہوا دونوں نے راست فرماں روائے بر کے حضور میں مرافعہ کیا۔ برطانوی شعورِ عدل و انصاف سے اپیل کرتے ہوئے دونوں نہ ہی فرومایگی کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی چاپلوسی کا۔ انھوں نے علانیہ وہ روش اختیار کی جو حیثیت اور رتبے سے مطابقت رکھتی تھی جس کے وہ دعوے دار تھے۔ درخواستوں اور عر داشتوں کے شائستہ طرزِ بیان کے پسِ پردہ بہادر شاہ جانتے تھے کہ وہ اپنی بقا کے لیے سیا لڑائی لڑ رہے ہیں۔ غالب انگریزوں کی نظر میں مغل چوکھٹے میں اپنی صحیح جگہ تسلیم کروانے کے لیے لڑائی لڑ رہے تھے۔ بہادر شاہ اور غالب کی قسمت اور تقدیر باہم دگر مضبوطی کے ساتھ مر تھی۔ انگریزوں کی طرف سے برائے نام مغل اقتدارِ اعلیٰ کے اعتراف کا مفہوم بالکنایہ ا جاگیردارانہ نظام کو تسلیم کرنا تھا جس کا مغل بادشاہ صدر تھا۔ غالب اس اعتراف کی بنا پر خود اپنے رتبے کے پورے احساس کے ساتھ انگریزوں سے رجوع ہوئے تھے۔ لیکن مغ بادشاہ اور غالب ایک ہی تاریخی عمل کے کشتگان میں سے تھے۔ وہ اس حکومت سے قانو دادرسی کے خواست گار تھے جو جان بوجھ کر ان کے قانونی حقوق کی قطع و برید کے درپے تھ۔ یہ ایک سیاسی لڑائی تھی جو مغل بادشاہ صریحی طور پر ہار رہے تھے اور غالب کا بنیادی المیہ یہ ہے کہ وہ اس صورتِ حال سے لازمی طور پر واقف بھی رہے ہوں گے۔ ان شاہی لوازم سے جو لال قلعے کی چاردیواری میں مغل بادشاہ نے ابھی تک ترک نہیں کیے تھے شاید عام آدمی کو اس مغالطے میں مبتلا رہنے کی تحریک ملی ہو کہ تماشا تو ابھی ختم نہیں ہوا۔ لیکن چوں کہ وہ ایک شاعر نیز غیر معمولی حساس اور حد درجہ زود فہم شخص تھے یہ تقریباً یقینی ہے کہ بہ روئے کار حقیقی عوامل کو نہ سمجھتے ہوئے بھی غالب اس امر سے آگاہ تھے کہ شان دار مغل عمارت اور اس کے متلازم اداروں کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ ملک کے دوسرے باشندوں کی طرح سے یہ بات ان کی بھی گرفت میں نہ آئی کہ انقلاب سر ہی پر منڈلا رہا ہے لیکن عام آدمی کے برعکس ان کو یہ سمجھنے کا شعور بھی تھا اور موقع بھی حاصل تھا کہ انقلاب وقوع پذیر ہو رہا ہے اور وہ سیاسی نظام، جس سے وہ واقف تھے، شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہا ہے۔

وہ یہ ضرور جانتے رہے ہوں گے کہ مغل اقتدار کو کچھ ہی عرصہ پہلے ایسی ذلت

اٹھانی پڑی ہے کہ اس سے پہلے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں مغل بادشاہ کو جاٹوں، مرہٹوں، افغانیوں اور نادرشاہ کے ہاتھوں جو مصائب برداشت کرنے پڑے وہ قصص و روایات کا ایک حصہ اور زبان زد خاص و عام تھے۔ قلعے میں پابندی سے حاضری دینے والے ایک فرد اور بعد میں شاعری میں استادِ شاہ کی حیثیت سے غالب انگریزوں کو متاثر کرنے کی بہادر شاہ کی لاحاصل اور باعثِ ذلّت کوششوں سے ضرور واقف رہے ہوں گے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ قلعۂ معلیٰ اپنی گزشتہ شان و شوکت کے مقابلے میں مادی طور پر کس حد تک زوال پذیر ہوچکا ہے۔ جیسے ہی سیاسی اقتدار کی جوش اور ہیجان میں لانے والی لہریں خشک ہونا شروع ہوئیں شاہی محل ایسے مرجھایا جیسے ایک پودا پانی کی کمی سے مرجھاجاتا ہے۔ نادرشاہ کا تختِ طاؤس کو لے جانا اس کی ویرانی کی وجہ نہیں تھی اور نہ ہی جاٹوں اور غلام قادر روہیلہ کی غارت گری سے پہنچنے والا نقصان ناقابلِ تلافی تھا۔ لال قلعے کی خستہ حالی کی وجہ یہ تھی کہ اب مغل خود سلطنت کے فرماں روا نہیں رہے تھے۔ ان کے اختیارات ایک بےحقیقت صوبے دار کے اختیارات سے بھی کم تھے اور ان کے ذرائع آمدنی اکبر کے زمانے کے کسی اوسط درجے کے منصب دار کے ذرائع آمدنی سے بھی کم تھے۔ استف ہیبر، جسے ۱۸۲۴ء میں محل دیکھنے کا موقع ملا تھا، لکھتا ہے کہ کسی زمانے میں شان دار دیوانِ عام "ہر طرح کے کاٹ کباڑ، ٹوٹی ہوئی پالکیوں اور خالی صندوقوں سے اٹا ہوا تھا اور تختِ شاہی پر کبوتروں کی بیٹ کا ایسا ردا جما ہوا تھا کہ اس کے نقش و نگار بہ مشکل قابلِ شناخت رہ گئے تھے۔" ہیرے جیسی موتی مسجد "بھی اسی کس مپرسی کی حالت میں اور خستہ حال تھی، اس کی دیواروں سے پیپل کے پیڑ اگ رہے تھے اور کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔" کم و بیش اسی زمانے میں سیر کے لیے آنے والے ایک اور شخص نے دیکھا کہ دیوانِ خاص میں جواہر کی جگہ نقلی جواہر نے لے لی ہے جو چمک دمک کے فریبِ نظر کا باعث تو ہوتے ہیں لیکن جن میں جواہر کی اصلی درخشانی کا فقدان ہے۔ یہ ایسا فرق تھا جو مغل بادشاہوں کی حقیقی قلبِ ماہیت کو علامتی طور سے ظاہر کرتا تھا۔ غالب اس بربادی اور بوسیدگی کو بہ آسانی محسوس کرسکتے تھے، اس لیے نہیں کہ وہ اس کا زیادہ اقبال مندی کے دنوں سے موازنہ کرسکتے تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ بچپن ہی سے مغلوں کے شاہانہ تمول اور شان

و شوکت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے والی کہانیاں سنتے آئے تھے۔ ہیرے اور زمرد، لعل اور نیلم جیسے قیمتی پتھر اور خالص سونے کے نقش و نگار کے ساتھ لاجورد، عقیق اور فیروزے وغیرہ وغیرہ کی نفیس مرصع کاری، نہایت بیش قیمت ریشمی پردے، پُر تکلف قالین اور تختِ طاؤس اتنے زیادہ قریب زمانے میں معرضِ وجود میں تھے کہ ان کو بھلانا ممکن نہیں تھا۔ غالب اپنے بادشاہ کو دہرے ہو کر تسلیم بجالاتے ہوئے بھی لامحالہ گرد و پیش کی بوسیدگی پر غور کرتے رہے ہوں گے اور انگریز رزیڈنٹ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے سامنے بادشاہ کی گھٹتی ہوئی اہمیت کا احساس بھی انھیں لازمی طور پر ہوتا رہا ہوگا۔

ایک شاعر کی حیثیت سے آشوبِ زمانہ کا شدید احساس رکھنے میں غالب انوکھے نہیں تھے۔ پچھلی صدی کے تین نام ور شعرا، سودا، خواجہ میر درد اور میر تقی میر کی اپنے عہد کے واقعات کے تعلق سے تاثر پذیری بھی ایسی ہی تھی۔ اپنی متعدد تحریروں میں سودا نے اس وقت کی افراتفری اور تاراج پر اور مغل بادشاہ کی بے کسی و بےچارگی پر ماتم کیا ہے۔ سودا کے ہم عصر میر نے بھی ایسے ہی کرب کا اظہار کیا۔

۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ کے ہاتھوں شاہ عالم ثانی کے اندھے کیے جانے سے دہلی کے ہر باشندے کے ہوش گم ہوگئے تھے لیکن یہ میر تقی میر تھے جنھوں نے شعر کے ذریعے اس المیے کو زندہ جاوید بنایا۔

غالب کے زمانے میں اتھل پتھل اور ذہن کو متوحش کر دینے والے واقعات زیرِ زمین ہوگئے تھے۔ پچھلی صدی کی افراتفری اور تاراج کی جگہ "امنِ برطانوی" کی منجمد بے انصافی نے لے لی تھی۔ قسمت آزما لٹیرے اور دغاباز دیوان برطانوی حکومت کے بہ زور وجود میں لائے ہوئے استحکام سے مغلوب ہو چکے تھے۔ غلام قادر روہیلہ یا نادرشاہ کی طرح انگریز لوٹ مار کر جلد از جلد رخصت ہو جانے کی مہم پر دہلی نہیں آئے تھے۔ استعماری حکومت کا تقاضا نظم و ضبط کا قیام اور سیاسی غیر یقینی کیفیت کا اختتام تھا۔ انگریزوں کے پاس اپنے سیاسی اقتدار کی پشتی بانی کے لیے مادی طاقت تھی اور انھوں نے اس امر کو ذہن نشین کرنے کے لیے کہ ان کی حکومت چاردن کی چاندنی نہیں ہے ان دونوں کو نظم و نسق کے ایک بنیادی نظام کے قیام کے لیے استعمال کیا۔ محاصل کی موثر طریقے سے وصولی سیاسی مخالفت

کو سختی سے نیست و نابود کرنے کے بعد ہی روبہ عمل لائی جاسکتی تھی نیز ادا کنندہ کو اچھی طرح سے یہ یقین دلانے کے بعد کہ وصول کنندہ استواری کے ساتھ صاحبِ اختیار و اقتدار ہے۔ یہی وہ استعماری طریقِ عمل تھا جس نے دہلی کے ہر طرف سے مصیبتوں کے نرغے میں پھنسے باشندوں کے لیے معمول کی زندگی کا بھرم بحال کیا۔ لیکن اس مغالطے میں ڈالنے والے سکون کے نیچے غالب کو ایک گہری پیش اندیشگی کا احساس تھا کہ کوئی بنیادی تغیر واقع رہا ہے اور قوانین، قابلِ اعتماد سہارے اور معتبر شہادتیں، جیسا کہ وہ انھیں جانتے تھے، ناقابلِ تنسیخ طور پر تغیر پذیر ہیں:

ہوا مخالف و شبِ تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است

(بادِ مخالف چل رہی ہے، رات اندھیری ہے اور سمندر میں طوفان
آیا ہوا ہے۔ جہاز کا لنگر ٹوٹ چکا ہے اور ناخدا سو رہا ہے۔)

برطانوی اقتدار کے استحکام و توسیع اور مغل اقتدارِ اعلیٰ کے زوال کے مابین توافقِ زمانی اتنا واضح تھا کہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس پر نظر نہ پڑے۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ غالب ان دو کے باہم دگر تعلق کا ادراک ایک زوال پذیر جاگیردارانہ نظام اور اس کو مغلوب کرنے والی استحصال کنندہ استعماری طاقت کے مفہوم میں نہ کرتے رہے ہوں۔ وہ برطانوی وجود کو تسلیم کرنے کو راضی تھے کیوں کہ ان کے خیال میں یہ کوئی اخلاقی مسئلہ بالکل نہیں تھا۔ ان کے زمانے کے سیاق و سباق میں جہاں پناہ کے حضور میں دہرے ہوکر تسلیمات بجالانے اور انگریز رزیڈنٹ کو سلام عرض کرنے میں کسی تضاد یا تناقض کا پہلو نہیں نکلتا تھا۔ عمل درامد کی اہمیت اور بے یقینی کے دباؤ نے ان دونوں کو ترتیب دے کر خدا اور قیصر والے اس فارمولے کے ہم آہنگ اطلاق کی تشکیل کی تھی: دونوں کو وہ ادا کرو جو ان میں سے ہر ایک کو واجب الادا ہے، ایک کو وہ تعظیم دو جو ازروئے قانون اقتدارِ اعلیٰ کا حق ہے، دوسرے کو وہ قبولیت دو جو بالفعل حکومت کی حیثیت سے اس کا حق ہے۔ لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ اور پنشن کے مقدمے میں خود اپنے تجربے کی روشنی میں غالباً انھوں نے سمجھ ہی لیا کہ انگریز موجودہ نظام میں غیر جذب پذیر بھی ہیں اور اس سے متناقض بھی۔ اس

احساس نے کلیتہً استدلالی کبیدگی کی شکل کبھی نہیں اختیار کی ، یہ ادراک کی محض خفیف سی ایک جھلک تھی ، استعماری طریقِ عمل کے حقیقی نتائج و عواقب کا ابتدائی نیز مبہم تصور تھا ۔ اس ادراک کی شہادت میں ان کی تحریروں میں ، کم از کم ۱۸۵۷ء سے قبل کے عہد میں ، ہم کو وضاحت سے کوئی بات نہیں ملتی ۔ لیکن ارادتہً مبہم پیکر تراشی کے باوجود حسبِ ذیل اشعار کا گہرا طنز کافی واضح اشارے فراہم کرتا ہے :

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہ زن کو
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوتے ہیں قرض رہ زن پر

کبھی کبھی یہ پیکر تراشی خطرناک حد تک واضح بھی ہو سکتی تھی :

آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلے نہیں
ایرا٭ ہی دے کے ہم نے بچایا ہے کشت کو

" رہ زن " اور " دزد " جیسے الفاظ بار بار استعمال میں آتے ہیں ۔

سپہر را تو بہ تاراجِ ما گماشتہ ء
نہ ہرچہ دزد زما برد در خزانہ ء تست

(چرخِ گردوں کو تو نے ہمیں تاراج کرنے پر مقرر کیا ہے ۔ لیکن
جو کچھ راہ زن نے ہم سے چھینا وہ تیرے خزانے میں تو نہیں پہنچا ۔)

اس ڈھٹائی سے جمے رہنے والے رہ زن کے سامنے شاعر خود کو بے بس اور سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور محسوس کرتا تھا اور اسے ایسا لگتا تھا کہ سبھی وسائل اس کی دست رس سے باہر ہیں اور وہ جو بھی کرے نتیجہ صفر ہی رہے گا :

غالب کچھ اپنی سعی سے لینا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

ایک اور شعر میں انھی جذبات کا اظہار ملتا ہے لیکن غیر معمولی باموقع پیکر تراشی کے ساتھ :

٭ ایرا : وہ مُہرہ جس کی قربانی دے کر شاہِ شطرنج کو مات سے بچایا جائے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

بڑی حد تک بے بسی کا یہ احساس نتیجہ تھا خود جہاں پناہ کی اس بے بسی کا جس کا سبھی کو شدت سے احساس تھا۔ اپنے فارسی اشعار میں سے ایک میں غالب خود اپنی حالت کو میرِ کارواں سے مربوط کرتے ہیں:

براہِ خفتنِ من ہر کہ بنگرد داند
کہ میرِ قافلہ در کارواں سرا خفت است

بعض اوقات صورتِ حال کے تعلق سے وہ غیر سنجیدہ بھی ہو سکتے تھے:

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بنیادی طور سے جاگیردارانہ شاہی نظام کے ساختہ پرداختہ فرد کی حیثیت سے انھیں ایک ایسے مستحکم شاہی مرکز کی غیر موجودگی کا شدید احساس تھا، جس سے وہ اپنی شناخت کا رشتہ جوڑ سکیں۔

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے!
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی۔۔۔؟

یا پھر

سخن نیست در لطفِ ایں قطعہ غالب
بہشتے بود ہند کا دم ندارد

(غالب اس قطعے کی لطافت میں کوئی شبہ نہیں۔
ہندستان ایک بہشت ہے جس میں آدم کا وجود نہیں۔)

ایک سطح پر شاہی مرکز کی اس غیر موجودگی کو ایک سیاسی تصور مجرد کی حیثیت سے اپنے داخل کا ایک جزو بنالیا گیا اور دوسری سطح پر اس کے نتائج و عواقب ٹھوس اور مادی بھی تھے۔ عہد وسطیٰ کی روایت میں ایک پیشہ ور شاعر کی اہم ترین وجہ معاش شاہی سرپرستی تھی۔ اگر شاعر کی زندگی شاہانہ فیاضی کے عہد میں بسر ہوتی تو اس کے شاہی سرپرست کی داد

و دہش بے حساب بھی ہوسکتی تھی۔ غالب کی توقعات جن کا سرچشمہ یہ روایت تھی، اس عہد کے سیاسی حقائق سے بری طرح ٹکرائیں۔ مغل دربار کی جھوٹی ٹیپ ٹاپ کسی سے چھپی نہیں تھی۔ بہادر شاہ ظفر خود شاعر اور شاعری کے سرپرست تھے لیکن سیاسی حالات نے مغلوں کے پاس صرف شاعری کی قدر پہچاننے کی حِس چھوڑی تھی لیکن شعر لکھنے والوں کی مالی اعتبار سے دل جوئی کے لیے کافی وسائل نہیں چھوڑے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق شاعری میں استادِ تھے اور اپنی خدمات کا مالی صلہ بھی بے شک پاتے تھے۔ مغل داد و دہش کی خلعت بوسیدہ صرف اس قابل رہ گئی تھی کہ اس پر دکھاوے کے لیے بہ مشکل ایک رتن ٹانکا جاسکے، وہ اکبرِ اعظم کے برعکس جس نے بے تکلف و بہ سہولت تمام شان و شوکت کے ساتھ ایسا کیا، نورتنوں کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ ذاتی سطح پر ظفر کے ذوق کو بہ حیثیت ملک الشعرا منتخب کرنے پر غالب ناراض تھے۔ تاہم مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے بادشاہ کو ان کی پسند کے لیے معاف کیا جاسکتا ہے مگر اس دور کے حالات کو کیسے معاف کیا جائے جنھوں نے شاہی داد و دہش پر اس شدت سے روک لگادی تھی کہ غالب جیسے نام ور شاعر کے حصے میں نام وری کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں آسکتا تھا۔

غالب کی اس مخفی کبیدہ خاطری کی جھلک ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ مغلیہ شاہی خاندان کی مجوزہ تاریخ کی پہلی جلد " مہرِ نیم روز " کی تمہید میں وہ ظفر کو شاہ جہاں کے عہد کی یاد دلاتے ہیں جب شاعر کلیم کو اکثر سونے چاندی، لعل اور موتیوں میں تولا جاتا تھا۔ شکایت کی شدت میں اس وقت اضافہ ہوتا ہے جب وہ آگے در پردہ تعریض کرتے ہیں کہ کلیم کے اشعار خود ان کے اشعار کے سامنے پھیکے دکھائی دیں گے۔ اگر مغل غالب کی توقعات کو پورا کرنے سے قاصر تھے تو انگریز انھیں پورا کرنے کے لیے رضامند نہیں تھے۔ ملکہ ء وکٹوریہ کی شان میں ایک قصیدے میں غالب نے اس کا ذکر کر کے کہ ایران کے شہنشاہ اور دوسرے فاتح بادشاہ معمولاً اپنے شاعروں کو گاؤں جاگیر میں عطا کر کے اور ان پر سونے موتی کی بوچھاڑ کر کے مالا مال کردیتے تھے بہ صراحت بتایا کہ ان کی توقعات کیا ہیں۔

ماضی کے اس تصوّر اور زمانہ ء حال میں غالب کی تنگ دستی کا فرق روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ زمانہ ء حال سے اظہار ناخوشی کے لیے

وہ ماضی کی دہائی دینے کو ترجیح دیتے تھے اور یہ ممکن ہے کہ ان کے اردو پر فارسی کو پرزور اور علانیہ طور پر ترجیح دینے کی اصل یہی علت تھی۔ اردو ان کے زمانے کی عام پسند زندہ زبان تھی، اس میں اس نوخیز زبان کا جوش اور زور تھا جس نے ادبی نقطہ ٔ نظر سے اپنا شایانِ شان مقام حاصل کرلیا تھا۔ لیکن اردو پر ایک داغ تھا۔ وہ سیاسی افراتفری اور زوال کے عہد کی پیداوار تھی، اکبر یا شاہ جہاں کے درباروں جیسے کسی مقتدر اور نام ور دربار کی زبان نہیں تھی۔ یہ تو کم زور پڑ جانے والے اور بڑھتی ہوئی تنگ دستی کے شکار طبقہ ٔ امرا کی اشک شوئی کا ایک ذریعہ تھی۔ یہ ادب میں بہارِ نو کی علامت رہی ہوگی لیکن یہ فارسی کی طرح ایک طاقت ور جاگیردارانہ شاہی نظام کی رابطے کی زبان نہیں تھی۔ ایک مورخ کی حریت فکر کو بروئے کار لاتے ہوئے دیکھیں تو صورتِ حال بلاشبہ نہایت دل چسپ تھی: ایک روبہ تنزل اور ناکام جاگیردارانہ نظام کی حدود میں ایک جدید زبان میں ادب کی نشاۃ ثانیہ عمل میں آرہی تھی۔ گو کہ اس سے زمانہ ٔ مابعد میں اردو ادب کی ترقی کی بنیاد پڑی، اس صورتِ حال نے ساتھ ہی ساتھ بنیاد ڈالنے والوں کو مادی صلے یا فائدے کے وسائل سے بیش تر محروم ہی رکھا۔ غالب کے لیے اردو کو تسلیم کرنا اس صورتِ حال کو حق بہ جانب قرار دینے کے مترادف ہوتا۔ اس کو قبول نہ کرنا ان کے احساسِ محرومی و ناکامی کی علامت تھی اور ان کے غلط وقت پر اور غلط جگہ پیدا ہونے کے احساس کی۔ غالب کے ہم عصر اور سوانح نگار حالی نے، جو اعلیٰ درجے کی ذہنی قابلیت کے شاعر بھی تھے، ذکر کیا ہے کہ غالب اردو میں شاعری کو کوئی کارِ نمایاں نہیں سمجھتے تھے۔ فی الحقیقت وہ اس زبان میں لکھنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے۔

فارسی کا، جسے تاریخی وجوہ کی بنا پر خود مغلوں نے ایک گنگا جمنی ہندستانی ثقافت کی تخلیق سے مربوط کردیا تھا، اب زندہ زبانوں میں شمار نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن غالب کے لیے یہ امرِ واقعہ کہ اس کو سمجھنے اور اس کی قدر پہچاننے والے اب معدودے چند ہی رہ گئے ہیں ان کے زمانے کی خرابی کا کھلا ثبوت تھا۔ وہ اکثر افسوس ظاہر کرتے کہ ان کی اردو غزلوں کے مداح تو کافی ہیں لیکن ان کے فارسی کلام کی قدر پہچاننے والا کوئی بھی نہیں۔ انھوں نے علانیہ اپنے اردو کلام کی مذمت کی اور بادشاہ کے لیے لکھی گئی ایک مشہور نظم میں یہ بھی تصریح کی کہ انھیں اردو شاعر ہونے کا دعویٰ ہی نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ اردو بہت نفیس لکھتے

تھے اور آگے چل کر انھوں نے بہ شمول خطوط اپنی ساری نثر اسی زبان میں لکھی ۔ ان کی طرف سے اردو کی بہ بانگِ دہل ناقبولیت غالباً ایک ایسے تاریخی دور سے غیر استدلالی رو گردانی کی محض ایک تقریب تھی، جس کی یہ زبان ایک غیر معمولی طور پر نمایاں علامت بن چکی تھی ۔ جیسا کہ انھوں نے کہا :

بود غالب عندلیبے از گلستانِ عجم
من زغفلت طوطیِ ہندوستاں نامیدش
(غالب گلستانِ عجم کا عندلیب تھا ۔ اپنی لاعلمی
کی وجہ سے میں نے اسے طوطیِ ہندستان کہا)

ماضی سے چمٹے رہنا ، زمانہ ء حال کے کسی بھی پہلو سے جو ماضی کے تسلسل کی ضمانت دے کھینچ تان کر تسکین حاصل کرنا ایک ڈھتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کے ملبے میں پھنسے افراد کا کم و بیش فطری ردِ عمل ہے ۔ غالب کا اپنی عالی نسبی کے بارے میں باربا دہرایا جانے والا اور مبالغہ آمیز ادعا غالباً اسی ردِ عمل کا مرہونِ منت ہے اور جب اسے مدِ نظر رکھا جائے تو بلاشبہ زیادہ قابلِ فہم ہے ۔ ان کے اجداد بھاڑے کے سپاہی تھے جو اپنے میدانِ عمل میں اس حد تک کام یاب ہوئے تھے کہ غالب بجا طور پر اشرافیہ کے رتبے کے دعوے دار ہوسکتے تھے ۔ انگریزوں کو اس امر کا قائل کرانا غالب کے لیے وقار کا مسئلہ تھا اور تدبیر کا بھی ۔ لیکن اس بات کی شہادت ہے کہ غالب نے اپنی عالی نسبی کے بارے میں باربار دہرائے جانے والے مبالغے کو واقعی سچ ماننے کے لیے خود کو قائل کرلیا تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بالفعل برطانوی اقتدار کی چھتر چھایا تلے ایک بےبس بادشاہ اور بےدست و پا امرا کے پاس اپنی شاموں کو اپنے جنگ جویانہ ماضی کی یادوں سے رنگین بنانے کے علاوہ اور کچھ بچا ہی نہیں تھا ۔ ان کی وظیفہ خواری کی زندگی ان کے اجداد کے زمانے سے ، جب سلطنتیں قائم کی گئی تھیں اور مال و دولت کی فراوانی تھی ، جتنی زیادہ دور ہوتی جاتی تھی ، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے فرصت کے اوقات اپنی عالی نسبی کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف میں صرف کرتے تھے کہ ہمارے اجداد ایسے نام ور امیر اور ایسے بہادر سورما تھے ۔ یہ انہماک اور ذہنی کیفیت اتنی واضح تھی کہ اتفاقاً ملک کی سیر کو آنے والا بھی اسے محسوس کرسکتا تھا : " یہ محض

عہدے کی خواہش نہیں ہے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ہندستان کے پرانے ادوار کی یاد کو سینے سے لگائے رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ " ہم بادشاہ اور اس کے خاندان کی سلامتی کے لیے ہر رات دعا کرتے ہیں کیوں کہ ہمارے آبا و اجداد نے اس کے آبا و اجداد کا نمک کھایا تھا۔" یعنی ان کے باپ دادا اس کے باپ دادا کی ملازمت میں تھے اور نتیجتاً ان کا شمار ملک کے طبقۂ امرا میں ہوتا تھا۔ آیا یہ واقعی ایسا تھا اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ انھوں نے خود کو اور اپنے بچوں کو باور کرادیا کہ صورتِ حال ایسی ہی تھی۔"

دہلی پر انگریزوں کے فوجی قبضے نے ان سیاسی آرزوؤں اور امیدوں کا جن کی جاگیردار امرا لَو لگائے رہے ہوں گے گلا گھونٹ دیا۔ ساتھ ہی ساتھ مگر محض اتفاقاً نہیں، سماج کا یہ طبقہ مالی پریشانیوں میں بھی مبتلا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں موروثی طور پر اور سونے پر سہاگہ یہ کہ خود اپنی طبیعت کی افتاد کے لحاظ سے غالب کا نظریۂ زندگی جاگیردارانہ تھا۔ وہ خاندانی امرا کے دائرۂ اقتدار میں کمی سے اور عوام کالانعام کی طرف سے اس جامۂ پُر تکلف کے، جو ہمیشہ سے مغل اقتدار کی زینت تھا، تار تار کیے جانے پر برہم تھے۔ ان کا ردّ عمل زمانے سے مناسبت رکھتا تھا: زمانۂ حال کی ناخوش گواری سے بچنے کے لیے اپنے ماضی کو آسمان پر چڑھانے کی کوشش اور اس کے اب بھی برمحل اور مفید مطلب ہونے کا ادعا۔ چناں چہ برطانوی سرپرستی کے دباؤ سے خمیدہ کمر اور اختیارات سے محروم بادشاہ کے سایۂ عاطفت میں تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے ہوئے غالب باربار تیمور کے نام ور خاندان کا خلف اور قدیم ایران کے اساطیری بادشاہ فریدون کی نسل سے ہونے کا اور ترکی فرماں رواؤں پشنگ، سنجر وغیرہ کے مشہور زمانہ خانوادوں سے تعلق کا دعویٰ کرتے ہیں:

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم			لا جرم در نسب فرہ مندیم
ایبکیم از جماعت اتراک			در تمامی زماہ وہ چندیم

(غالب ہم توران کی خاکِ پاک سے ہیں۔ بلاشبہ بہ اعتبارِ نسب ہم نہایت خوش بخت ہیں۔ ترکوں کے ایبک قبیلے سے ہمارا تعلق ہے اور کمال میں چاند سے بھی دس گناہ بڑھ کر ہیں)

یا پھر

ساقی چو من پشنگی و افرا سیابیم
دانی کہ اصل گوہرم از دودہ، جم است
میراث من کہ مے بود اینک بہ من سپار
زیں پس رسد بہشت کہ میراثِ آدم است

(ساقی میں پشنگ اور افرا سیاب کی نسل سے ہوں اور تو جانتا ہے
میرے گوہر کی اصل خانوادہ، جم سے ہے۔ میری میراث شراب ہے
اور باغِ بہشت، یہ تو آدم کا ورثہ ہے، جو مجھے ملنا ہی چاہیے۔)

خاندان کی اصل اور حسب نسب کے بارے میں اس طرح کے اذکار غالب کی تحریروں میں اکثر ملتے ہیں۔ یہ ٹیپ کا مصرعہ ان کے ہاں اس بلند آہنگ ترتیل سے دہرایا گیا ہے کہ حالی جیسے ہم عصروں نے بھی اس پر خاص طور سے توجہ دی ہے اور اس کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرزِ زندگی کو ترک کرنے کی بجائے جس کی ان کے امیرانہ اور سپہ گرانہ ماضی کے ان کے اپنے تصور سے توقع کی جاتی تھی وہ مقروض رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

واقعی اس صورت میں جب کہ انگریزوں کے فوجی دستے دہلی کو اپنی زد میں لیے ہوئے پہاڑی سلسلے پر مرکوز تھے یہ بات قابلِ فہم ہے کہ غالب ترجیح اس بات کو دیتے تھے کہ ان فوجی دستوں کے پرے اس زمانے کو نظر میں رکھیں جب خود ان کے آبا و اجداد کامران فاتحوں کی حیثیت سے ہندستان آئے۔ کیوں کہ اگر وہ زمانہ ء حال کی طرف لوٹتے تو حقیقت واقعہ یہ تھی کہ برطانوی فوجی قبضے نے سیاسی میدانِ عمل میں جاگیردار طبقے کی آرزوؤں اور تمناؤں پر قطعی طور سے پانی پھیر دیا تھا۔ اس بارے میں، شاید تحت شعوری طور پر کہیں حسرتِ جاں کاہ البتہ رہ گئی تھی۔ اپنے فارسی مجموعہ ء کلام میں انگریزوں کی طرف واضح اشارہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ دوسری تلافیوں کا ذکر کرتے ہیں:

گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند　　بہ عوض خامہ ء گنجینہ ء فشانم دادند
افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بردند　　بہ سخن ناصیہ ء فرِّ کیانم دادند

(شاہانِ عجم کے جھنڈوں سے لعل و گہر نوچ لیے گئے اور اس کے عوض میں مجھے گنجینہ

فشاں قلم دے دیا گیا۔ ترکانِ پشنگی کے سر سے تاج چھین لیا گیا اور اس کے عوض میں میرے سخن کو کیانی بادشاہوں کا کرّ و فر دیا گیا۔)

زیادہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنے ایک خط میں وہ افسوس ظاہر کرتے ہیں:
" وائے قسمت کہ مجھے زیاں زدہ و سوختہ ساماں بناکر پیدا کیا گیا۔ میری تخلیق اپنے اجداد کی طرح جنگی کارناموں کے لیے نہیں ہوئی۔۔" اس آہ و زاری میں غالب کی طرف سے ماضی کی مبالغہ آمیز حمد و ثنا کا اصلی نفسیاتی سبب مضمر ہے، وہ مبالغہ آمیز حمد و ثنا جس نے انھیں اپنی ایک مشہور نظم میں یہ اعلان کرنے پر مجبور کیا کہ:

سو پشت سے ہے پیشہ ء آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ ء عزت نہیں مجھے

حقیقت اور اسطور تاریخ کے عبوری دور میں بہ آسانی گھل مل جاتے ہیں۔ مغل سلطنت جاں بہ لب تھی لیکن اس کا خاتمہ ابھی نہیں ہوا تھا۔ انگریز نئے فرماں روا تھے لیکن اس کا کھلے بندوں اعلان انھوں نے ابھی نہیں کیا تھا۔ اس دھندلکے میں ماضی کے قوانین برقرار تھے، طرزِ زندگی میں بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لیکن نئے واقعات و رجحانات ان دونوں کی بیخ کنی کر رہے تھے۔ یہ حالات میں تغیر کا، غیر یقینی اور منقسم وفاداریوں کا، واہمے اور حقیقت کے معنی خیز اور پیچیدہ عملِ باہمی کا دور تھا۔ تبدیلی کی معروضی قوتیں اور عوامل موجود تھے لیکن ابھی وضاحت کے ساتھ قابلِ شناخت نہیں تھے۔ سیاسی شعور ماضی کے زورِ حرکت اور بوجھ سے سحر زدہ تھا۔ نیچے کی طرف جاتی ہوئی ڈھلان کا آخری مرحلہ شروع ہوچکا تھا لیکن ان لوگوں کے لیے جو اس کا ایک حصہ تھے سفر کے اختتام پر روشنی کی کوئی سبیل نہیں تھی۔
"خطاب اور بعض حقوق کی برقراری کے ساتھ ملحقہ سلطنت کی یہ دنیا، خستہ حالی اور نا امیدی کے پس منظر میں ویمر جیسی نفاست و شائستگی کی یہ دنیا، مغلوں کے غروبِ آفتاب کی یہ روشنی شاید بہ تدریج خود ہی گم نامی کے اندھیرے میں گم ہوجاتی۔" لیکن انگریز واقعات کی رفتار بڑھانے کے لیے بے قرار تھے۔ ۱۸۵۴ء میں انھوں نے طے کیا کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد شاہی خاندان کو لال قلعہ چھوڑنا اور شہر کے باہر قطب مینار کے پاس کسی عمارت میں منتقل ہونا پڑے گا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ بہادر شاہ کے جانشین کا خطاب "شاہ" نہیں

بلکہ " شاہ زادہ " ہوگا اور انگریزوں کی طرف سے دیے جانے والے وظیفے کی رقم بھی کم ہو جائے گی۔ مغل بادشاہ کے درباری، انگریزوں کے وظیفہ خوار، تنگ دست امیرزادے، رئیس زادے اور دہلی کے باشندے مرزا محمد اسداللہ خاں غالب نے زودفہمی سے نظر آتے ہوئے انجام کا اندازہ لگالیا۔ ۱۸۵۴ء میں انھوں نے اپنے شاعر دوست جنون کو لکھا

> " قلعے میں معدودے چند شاہ زادے اکٹھا ہوتے اور اپنے اشعار پڑھتے ہیں۔ کبھی کبھی میں بھی محفل میں شریک ہوجا تاہوں۔ یہ صحبت بھی کچھ ہی دنوں کی ہے۔ کون جانتا ہے شعرا پھر کب اکٹھا ہوں گے یا اکٹھا ہوں گے بھی۔"

تین سال بعد دربار، اس تمام طرزِ زندگی کے ساتھ جس سے غالب واقف تھے اور غالب کی شناخت تھا ایسی اتھل پتھل اور ایسے تشدد کے درمیان تہس نہس ہوگیا جس کی پہلے کوئی نظیر نہ تھی۔ مغل شاہی خاندان کا خاتمہ ہوگیااور بہادر شاہ جلاوطن کردیے گئے لیکن اس وقت بھی جب شان و شوکت اور دھوم دھام کے ساتھ امنِ برطانوی کا ڈھنڈورا پیٹا جارہا تھا پیش بین اور واقعات پر نظر رکھنے والا شاعر غالب ایک طرف کھڑا ہونے اور ازلی و ابدی حقیقت کے اظہار کی صلاحیت رکھتا تھا:

غرّہ اوج بنائے عالم امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

○●○

باب : دو

شہرِ ناز و نعمت

" رات کے کم و بیش ایک بجے میں نے اپنی پالکی میں سے جھانک کر دیکھا تو چٹکی ہوئی فرحت بخش چاندنی میں مجھے جامع مسجد کے مینار دکھائی دیے ۔ اسی عظیم الشان اسلامی عبادت گاہ کے مینار جس کا شمار دہلی اور شمالی ہندستان کی دل کش ترین عمارتوں میں ہوتا ہے ۔ جب ہم لوگ اور قریب پہنچے مجھے شہر کے گرد سرخ رنگ کی نہایت عمدہ فصیل دکھائی دی ۔ ۔ ۔ ایسی شان دار چاندنی اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی اور جب ہم ندی پار کررہے تھے اور یہ عالی شان شہر ہمارے سامنے پھیلا ہوا تھا تو دونوں جانب منظر قابلِ دید تھا ۔ اسلامی عبادت گاہوں کے بہت سارے خوش نما مینار آسمان سے باتیں کررہے تھے ۔" سال ۱۸۴۸ء تھا اور دن ۲۰ / جنوری کا ۔ ان سطور کی لکھنے والی دہلی کے انگریز رزیڈنٹ سر طامس مٹکاف کی بیٹی ایمیلی بے لی تھی ۔ منظر ، جس کی اس سرخوشی کے عالم میں وہ تصویر کشی کررہی تھی ، غالب کی دہلی کا تھا ، جیسا کہ اسے دہلی آتے وقت جمنا ندی کو کشتیوں کے

پل پر سے پار کرتے ہوئے دکھائی دیتا تھا۔ کشمیری دروازے کے باہر انگریز رزیڈنٹ کی عا
شان کوٹھی پہنچ جانے پر اپنے باپ کے مشفقانہ اصرار پر ایمیلی اپنے مشتعل جذبات کو قابو میں
لائی اور کچھ دیر کے لیے سو گئی۔ لیکن اگر وہ اور کچھ دیر جاگتی تو شاید شہر میں طلوعِ صبح کا منظر
بھی دیکھ سکتی اور یہ بھی مشاہدہ کر سکتی کہ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں شہر کے ا
مقامات کو کیسے چھانٹتی اور انھیں نمایاں کرتی ہیں۔ یہ اہم مقامات تھے جمنا کے کنارے
مشرق کی طرف واقع اور قلعہء معلیٰ کے نام سے مشہور لال بھربھرے پتھر کا بنا ہوا بلند و با
لال قلعہ، اس کے سامنے مغرب کی جانب واقع ۶۶۶۴ گز لمبی چار گز چوڑی اور نو گز اونچی اینٹ
پتھر کی فصیل سے گھرا ہوا قوس کی شکل کا شہر، اس فصیل کے بہت سارے دروازے
شمال میں کشمیری دروازہ، مغرب کی طرف موری، کابلی، لاہوری اور اجمیری دروازے او
جنوب میں ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ، شہر سے گزرنے والی اور زاویہء قائمہ پر ایک
دوسرے کو کاٹنے والی دو بڑی سڑکیں: چاندنی چوک اور فیض بازار، شمال مشرق میں واقع
لال قلعے کی شان و شوکت کا برابری سے مقابلہ کرنے والی، اپنی عالی شان بلندی، وسعت او
سر بہ فلک میناروں سے متاثر کرنے والی جامع مسجد اور شہر کے باہر پہاڑی سلسلہ جس کی
درختوں سے ڈھکی چوٹیوں کو شہر کی فصیل سے درختوں، جھاڑیوں، میوہ باغوں اور ٹوٹے
پھوٹے کھنڈروں کا ایک سپاٹ اور مختصر درمیانی فاصلہ جدا کرتا تھا۔

شہر کی گنگا جمنی تہذیب کی خاص الخاص ہستی اور ملجا و ماویٰ مغل بادشاہ تھے۔ حالاں
کہ غالب کے عنفوانِ شباب کے دنوں میں اکبر شاہ ثانی مغل بادشاہ تھے، ان سے زیادہ ان
کے جانشین بہادر شاہ کی شخصیت کو شہر کے مزاج و خصوصیات کا صحیح معنوں میں مظہر اور
لبِ لباب کہا جاسکتا ہے۔ وہ پسندیدہ آدابِ مجلس کی کسوٹی تھے، اپنے زمانے کے مقبول
عام نظریات، اس کی کام یابیوں، اس کی کم زوریوں اور اس کے دل بہلاووں کی علامت تھے۔
وہ ایک اچھے نشانہ باز اور ممتاز شہ سوار تھے۔ وہ ایک باکمال شاعر تھے، جن کا تخلص ظفر
تھا۔ وہ ایک اہلِ علم تھے جنھوں نے سعدی کی گلستاں کی ایک عالمانہ شرح لکھی تھی۔ وہ
"شوق رنگ" کے قلمی نام سے خیال اور ٹھمریاں تصنیف کرتے تھے۔ وہ ایک باکمال ماہرِ
خطاطی اور مصوری کے قدردان و سرپرست تھے، بیش تر دربار کی دل چسپی ہی کی بہ دولت

دہلی کا دبستانِ مصوری زندہ تھا، جہاں راجہ جیون رام اور حسین نذیر جیسے فن کاروں نے تربیت پائی۔ خزانہ خالی ہونے کے باوجود انھوں نے باغات سے مغلوں کی محبت کے جس طرح سے بھی ہو اظہار کے لیے وسائل فراہم کیے اور ایک باغ شاہ درا میں اور دوسرا محل کی دیوار کے نیچے ترتیب دیا۔ وہ شطرنج اور تاش کھیلتے تھے، پتنگ بازی سے لطف اندوز ہوتے تھے اور مرغ بازی سے دل چسپی لیتے تھے۔ ان کی اپنی بلبل، بلبلِ ہزار داستان، عوام کو بے حد پسند تھی۔ وہ اچھی غذا اور خوب صورت عورتیں پسند کرتے تھے۔ شاہی پسند کی بہ دولت خصوصیت کے ساتھ آم، شہر کا مرغوب ترین پھل بن گیا تھا۔ وہ تنگ دست لیکن خوددار تھے، سیاسی طور سے بے دست و پا لیکن پھر بھی جہاں پناہ تھے۔ دہلی کی تہذیب کو ایک خاص استناد حاصل ہوگیا تھا۔ مرور زمانہ کے ساتھ مختلف عناصر کے امتزاج سے اس شہر کے باشندوں کا ایک گنگا جمنی طرزِ زندگی معرضِ وجود میں آیا تھا جو نہ ہی بناوٹی تھا اور نہ ہی عملِ جراحی و پیوند کاری کا نتیجہ تھا، بلکہ بے ساختگی کے ساتھ شہر کی اپنی شخصیت کا ایک جزو بن گیا تھا۔ یہ اس کی سماجی اور ثقافتی خصوصیات تھیں (جن کی امتیازی حیثیت شہر کی ٹھٹول کو بھی صریحاً دہلی کے لیے مخصوص رنگ روپ عطا کرتی تھی) جنھوں نے ذوق کو "کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر" کہنے پر اکسایا۔ بہادر شاہ ظفر جو اب عظیم الشان سلطنت کے فرماں روا باقی نہیں رہے تھے، اس روحِ عصر کی علامت تھے۔

بادشاہ دین دار مسلمان تھے لیکن معاشرتی ماحول صریحاً غیر فرقہ پرستانہ تھا۔ دربار رکھشا بندھن، دسہرہ، ہولی، دیوالی اور بسنت پنچمی جیسے ہندو تہوار جوش سے مناتا تھا۔ یہ سوچ بچار کے بعد اپنایا ہوا سیکولرزم کا رویّہ نہیں تھا، یہ تو اس حقیقی امتزاج کی ایک فطری توسیع تھی جو اکبرِ اعظم کے عہد میں شروع ہوا جب مغل معاشرتی ماحول میں ہندو عناصر کے اخذ و قبول نے نمایاں شکل اختیار کی۔ اکبر نے ایک راج پوت راج کماری سے شادی کی اور ہندوؤں کو اپنی سلطنت میں اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا۔ عوام کے لیے اکبر بادشاہ جہاں پناہ بھی تھے اور مہابلی بھی۔ شاہ جہاں کے بیٹے داراشکوہ نے یوگ وششٹ، گیتا اور اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ خود اس نے "مجمع البحرین" نام کی ایک کتاب لکھی، جس کا موضوع ہندومت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ تھا۔ اورنگ زیب صرف عارضی طور پر اس عمل کو روک

سکا ، مستقل طور پر نہیں ۔ ظفر شاہ کے عہد تک یہ گنگا جمنی تہذیب ایک ورثے میں ملنے والی طرزِ زندگی بن چکی تھی ، جسے بادشاہ شاید تقویت تو پہنچا سکتا تھا لیکن اس پر اعتراض نہیں کرسکتا تھا ۔

جب کسی روایت کے استحکام کے لیے ماحول سازگار ہو تو معمولی واقعات کو بھی جو اسے مزید تقویت پہنچا سکتے ہوں غیر شعوری طور پر بڑھا چڑھا کر دستور کی شکل دے دی جاتی ہے ۔ چناں چہ رکھشا بندھن کے تیوہار کو منانے کی رسم کو شاید بادشاہ نے اسی طرح باقاعدہ دستور کی شکل دی ۔ قصہ یوں ہے کہ صبح سویرے جمنا ندی سے اشنان کے بعد لوٹتی ہوئی رام جنی گوڑ نامی ایک برہمن خاتون نے مقتول بادشاہ عالم گیر ثانی کی راستے میں پڑی ہوئی لاش کو پہچان لیا ۔ بادشاہ کے سپاہیوں کو پتہ چلنے اور اسے اپنی تحویل میں لینے تک بغیر چون و چرا کے اس نے لاش پر پہرہ دیا ۔ عالم گیر ثانی کے بیٹے اور جانشین شاہ عالم نے خاتون کو اس کے اس کام کا صلہ دینا مناسب سمجھا ۔ چناں چہ اس کے بعد سے ہر سال رکھشا بندھن کے موقع پر رام جنی ایک نہایت آراستہ پیراستہ پالکی میں قلعے کو جاتی اور اپنے احسان مند شاہ بھائی کو راکھی باندھتی ۔ بدلے میں بادشاہ اس پر تحفے تحائف کی بھرمار کردیتے ۔ اس رسم نے سالانہ جشن کی صورت اختیار کرلی ، جسے شاہ عالم کے جانشین اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ اور رام جنی کے گھرانے کی خواتین غرض سبھی پابندی سے مناتے ۔

ہر سال برسات میں دہلی کے سبھی فرقوں کی طرف سے " پھول والوں کی سیر " کے نام سے معروف پھولوں کا جشن منایا جاتا جس نے ظفر کے عہد میں ایک سالانہ تقریب کی شکل اختیار کرلی ۔ جشن کی ابتدا دل چسپ تھی ۔ ظفر وہ شاہ زادے تھے جن کو انگریزوں نے اکبر شاہ ثانی کی جانشینی کے لیے چنا تھا ۔ لیکن اپنی چہیتی ملکہ ممتاز محل کی ترغیب پر اکبر شاہ نے اس فیصلے کو ممتاز محل کے بیٹے مرزا جہاں گیر کے حق میں بدلوانے کی سعی کی ۔ انگریز رضا مند نہیں تھے ۔ مرزا جہاں گیر جوشیلے نوجوان تھے اور نازبرداری کرنے والے اپنے والدین کے رویے سے ہمت جٹا کر انھوں نے انگریز ریذیڈنٹ سیٹن پر گولی چلاکر اپنی برہمی کا مظاہرہ کیا ۔ اقدام کے نتیجے میں محض سیٹن کی ہیٹ اس کے سر سے گر پڑی ۔ لیکن بہ ہرحال انگریزوں کو یہ حرکت اتنی ناگوار گزری کہ انھوں نے جہاں گیر کو الہ آباد جلا وطن

کروادیا ۔ مرزا جہاں گیر کی رنجیدہ ماں نے منّت مانگی کہ اگر میرے بیٹے کو دہلی واپس آنے کی اجازت مل جائے تو میں مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ شریف پر چادر اور پھولوں کی مسہری چڑھاؤں گی ۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد انگریزوں نے شاہ زادے کی واپسی کی اجازت دے دی لیکن اس شرط پر کہ بادشاہ اپنے اس بیٹے کے اچھے چال چلن کی ضمانت دیں اور ظفر کی ولی عہدی کے موقف کو موضوعِ بحث نہ بنائیں ۔ مرزا جہاں گیر کی دہلی کو واپسی کا دھوم دھام سے جشن منایا گیا ۔ ممتاز محل نے منّت بڑھانے کی دیدہ ریزی سے تیاریاں شروع کیں ۔ پھولوں کا ایک خوب صورت چھتر بنایا گیا جس پر پھول والوں یعنی پھلہاروں نے خود اپنے خرچے سے دیدہ ریزی سے بنائے ہوئے پھولوں کے ایک پنکھے کا اضافہ کیا ۔ پھر ان دونوں کو اہتمام سے ایک بڑے جلوس کے ساتھ ولی کی درگاہ لے جایا گیا ۔

مرزا جہاں گیر نے اپنے طور طریقے نہیں بدلے ۔ انھیں پھر جلا وطن کیا گیا اور آخر کار ان کا الہ آباد میں اکتیس سال کی عمر میں انتقال ہوا ۔ بہ ظاہر وہ شاہ دانے کی شراب کے حد سے زیادہ استعمال کی وجہ سے جگر کی ایک بیماری (تشمع الکبد CYRROHOSIS) میں مبتلا تھے ۔ لیکن سارے دربار کا اور دہلی کے لوگوں کا زیارت کے لیے مہرولی کو جانا ہر سال کا دستور بن گیا ۔

" جشن کے کچھ دن پہلے بادشاہ ، ملکہ اور محل کی سبھی خواتین و امراء دربار پالکیوں اور ہواداروں پر دہلی سے روانہ ہوتے ، جب کہ شاہ زادے کلیل کرتے ہوئے گھوڑوں پر سوار ان کے ہم رکاب ہوتے ۔ ہمایوں کے مقبرے ، نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر حاضری دے کر اور صفدر جنگ کے مقبرے پر دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ دیر توقف کر کے شاہی جلوس مہرولی پہنچتا جہاں اس کا شایانِ شان استقبال کیا جاتا ۔ خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ کے پاس واقع جنگلی محل کو جو اب کھنڈر میں تبدیل ہوچکا ہے لیکن ان دنوں ایک شاہی محل کی ساری شان و شوکت کے ساتھ صحیح سلامت تھا ، قالینوں اور جھاڑ فانوس سے بہ درجہ ء کمال آراستہ کیا جاتا ۔ دوسرے دن بادشاہ جھرنے کو جاتے ، جہاں قناتوں اور پردوں کی

خلوت میں محل کی خواتین فرصت سے وقت گذار سکتی تھیں۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ اس موقع پر مینہ کے کچھ چھینٹے نہ پڑیں اور تب بادشاہ اور ان کے ہم راہی جھرنے کے مشرق میں واقع دل کش سیر گاہ امریاں یعنی آم کے درختوں کے کنج کی طرف منتقل ہوجاتے۔ یہاں محل کی خواتین خود موسم کے پکوان تیار کرتیں؛ سب مل کر کھیلتے کودتے اور ناچ گانے سے لطف اندوز ہوتے۔

جشن کے پہلے دن پنکھوں اور پھولوں کا جلوس جھرنے سے شروع ہوتا۔ ساتھ میں گویّے اور سازندے ہوتے۔ پہلوان اور ورزشی اپنے کرتب دکھاتے اور تلوار کے ہاتھ نکالتے۔ اپنی رنگ بہ رنگی وردیوں میں سپاہی ساتھ ہوتے اور مہرولی کے بڑے تکلّف سے سجے سجائے اور روشنی میں نہائے ہوئے بازار سے گزرتا ہوا یہ جلوس جوگ مایا مندر پہنچتا۔ دوسرے دن ایک اور بڑے جتن سے منظم کیا ہوا جلوس خواجہ بختیار کاکیؒ کے مقبرے کو جاتا۔"

جو کام ایک مسلمان خاتون کی طرف سے ایک مسلمان ولی کی درگاہ پر شکرانے میں اور اظہارِ عقیدت کے طور پر شروع کیا گیا تھا، مذہب و ملت اور ذات پات کی سرحدیں پار کر کے سارے شہر کے لیے زیارت اور جشن کی تقریب بن گیا۔ بادشاہ خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ کو بھی جاتے اور جوگ مایا مندر کو بھی۔ جلوس میں ان کے ساتھ جانے والوں میں ہندو بھی ہوتے اور مسلمان بھی۔ اپنے خطوط میں سے ایک میں غالب اس تیوہار میں لوگوں کی بڑی تعداد میں شرکت اور اس کے سیکولر کردار کا ذکر کرتے ہیں:

"اس شہر میں ایک میلہ ہوتا ہے، پھول والوں کا میلہ کہلاتا ہے۔ بھادوں کے مہینے میں ہوا کرتا ہے، امرائے شہر سے لے کر اہلِ حرفہ تک قطب صاحب جاتے ہیں۔ دو تین ہفتے تک وہیں رہتے ہیں۔ مسلمین اور ہنود دونوں فرقے کی شہر میں دکانیں بند پڑی رہتی ہیں۔ (خط بہ نام خواجہ غلام غوث خاں بے خبر، مورخہ اکتوبر نومبر ۱۸۲۴ء)"

غالب کی دلی میں فرقہ ورانہ فسادات نہیں ہوتے تھے ۔ ۱۸۵۴ء میں جب انگریز رزیڈنٹ طامس مٹکاف نے بقر عید کے موقع پر ذبیحہ ء گاؤ کی اجازت دے دی تھی ۔ کچھ کشیدگی ضرور تھی ۔ ہندوؤں کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے مغل بادشاہ روایت کی پابندی کرتے ہوئے اس موقع پر اونٹ کی قربانی دیتے تھے اور انھوں نے ذبیحہ ء گاؤ کی ممانعت کردی تھی ۔ انگریزوں نے نتائج و عواقب کو ملحوظ خاطر نہ رکھتے ہوئے اس ممانعت کو برخاست کردیا ۔ گو کہ ہندوؤں نے احتجاج کیا لیکن کسی طرح کا فرقہ وارانہ تشدد وقوع پذیر نہیں ہوا ۔ غالب اسی سال کے ایک خط میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں : " یہاں کی عید کا ماجرا عرض کروں گا ۔ پہلے یہ تو پوچھیے کہ یہاں کول (یعنی علی گڑھ) کا کیا واقعہ مشہور ہے ۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ ۔ ہر انجمن میں یہی ذکر رہا کہ کول میں بڑی خانہ جنگی ہوئی اور ہندو مسلمانوں میں تلوار چلی ۔ دس بیس آدمی طرفین کے مارے گئے ۔ میں چاہتا تھا کہ تم کو لکھوں کہ اس عرصے میں تمھارا خط آگیا اور حال معلوم ہوا ۔ میں جانتا ہوں ایسا ہی مشہور ہو گا کہ دلی میں تلوار چلی ۔ سو ، حضرت نہ تلوار چلی نہ خانہ جنگی ہوئی ۔ دو دن ہندو دکان داروں نے دکانیں بند کردی تھیں ۔ سو ، مجسٹریٹ صاحب بہادر اور کوتوال نے سارے شہر کا گشت کیا ۔ بہ ملاطفت و ملائمت و بہ تاکید و تہدید دکانیں کھلوائیں ۔ بکریاں بھی قربان ہوئیں اور گائیں بھی ۔" (خط بہ نام منشی نبی بخش حقیر ، جمعہ ۵ / ستمبر ۱۸۵۴ء) ۔

غالب کے خط میں اس واقعے کے بیان سے اس احساس کا پتہ چلتا ہے کہ انھیں واقعی یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خلاف تشدد پر بھی اتارو ہوسکتے تھے ۔ صحیح صورت حال سے واقفیت پر انھیں اطمینان کا جو احساس ہوا وہ خط سے ظاہر ہے اور وہ دہلی کے واقعات کے بارے میں مبالغہ آمیز افواہوں کی فوراً تردید کرتے ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ عہد استعمار کے قبل بھی شمالی ہندوستان میں فرقہ ورانہ آویزشیں بالکل معدوم نہیں تھیں ۔ لیکن غالب کی دلی میں ہمیں فرقہ وارانہ کشیدگی کی کوئی شہادت ملتی بھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ سیاق و سباق ہندو بہ مقابلہ مسلمان ہی کا ہو ۔ ۱۸۱۶ء اور ۱۸۳۴ء میں یہ جین رتھ یاترا کے مسئلے پر ہندوؤں اور جینوں کے درمیان کشیدگی تھی ۔ جس کے نتیجے میں (اگر رزیڈنٹ چارلس مٹکاف کا اعتبار کیا جائے تو) فساد ہوتے ہوتے رہ گیا ۔

ایک اور موقع پر یہ شیعوں اور سنیوں کے درمیان کشیدگی کا معاملہ تھا۔ انگریز عید اور رام لیلا کے موقع پر کشیدگی کو دور کرنے کے لیے سواروں کے دستے بے شک تیار رکھتے تھے لیکن ایسی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی کہ انھیں کام میں بھی لایا گیا ہو۔ اس کے برعکس اس کی شہادت ملتی ہے کہ ان موقعوں پر جشن میں شرکت بلالحاظ مذہب و ملت کی جاتی تھی۔ "عوام میں مروج مذاہب اپنے اعتقادات و معمولات میں نہایت فراخ دل اور آزاد خیال تھے۔ ایسے بھی اولیا اور پیر تھے، مزاریں، درگاہیں اور مقدس مقامات تھے، یہاں تک کہ مقبولِ عام دیوی دیوتا بھی تھے، جن سے ہندو اور مسلمان یکساں عقیدت رکھتے تھے۔" خود بہادر شاہ ظفر نے حکم دیا تھا کہ رام لیلا کے جلوس کے راستے میں ایسے ترمیم کی جائے کہ وہ محل کے سامنے سے گزرے تاکہ وہ بھی اسے دیکھنے کا لطف اٹھا سکیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب انھیں بائبل کا عربی ترجمہ تحفے میں دیا گیا تو وہ "بہت خوش ہوئے تھے"۔

منشی ذکاء اللہ جن کا دہلی کے نہایت قدیم اور معزز باشندوں اور اہلِ علم میں شمار ہوتا تھا سی۔ ایف۔ اینڈریوز سے دہلی میں ۱۹۰۴ء میں ملے۔ آگے چل کر دونوں گہرے دوست بن گئے اور ذکاء اللہ، جو ان معدودے چند بہ قیدِ حیات لوگوں میں سے تھے جنھوں نے فی الحقیقت غالب کی دلی میں زندگی بسر کی تھی، اینڈریوز کے ساتھ گھنٹوں مغلیہ حکومت کے آخری ایام میں شہر، اس کے باشندوں اور ان کے طرزِ زندگی کے بارے میں گفتگو میں گزارتے۔ مشہور مورخ پرسی وال اسپیر اس زمانے کی فرقہ وارانہ تعلقات کی صورت حال کے بارے میں اس کسی قدر خوش دلانہ نتیجے کو منّ و عن قبول کرنے میں احتیاط سے کام لینے کا مشورہ دیتا ہے جو ذکاء اللہ سے اپنی گفتگو کے زیرِ اثر اینڈریوز نے اخذ کیا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ذکاء اللہ وغیرہ نے خاصے اعتماد کے ساتھ اس امر کا ذکر کیا ہوگا۔ اسی لیے مسئلہء زیرِ بحث کے بارے میں اینڈریوز کی رائے اتنی قطعی اور غیر مبہم ہے:

> "مسلمانوں اور ہندوؤں کی ایک ہی شہر میں اکٹھے اور پہلو بہ پہلو رہائش کا نتیجہ عوام کے درمیان رسوم و رواج کے نمایاں امتزاج کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ ۔ ۔ پرانی دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ان خصوصی دوستانہ تعلقات کے بارے میں میرے پاس کسی بھی

دوسری حقیقت کے مقابلے میں زیادہ باوثوق اور تائیدی شہادت موجود ہے ۔ یہ اطلاع مجھے دونوں طرف سے ملی ہے اور تقریباً ایک سی ہے ۔ یہ بہ ظاہر اس شہر کی خصوصیت تھی جس پر خود وہاں کے باشندوں کو فخر تھا ۔ ان نسبتاً معمّر باشندوں نے، جن سے میں ملا، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اس امر واقعہ کا ذکر بڑے جوش کے ساتھ کیا اور اس کا مقابلہ دورِ حاضر کی تلخی سے کیا ۔ ۔ ۔ بہادر شاہ کے عہد میں دوسرے مذہب کے پیرو ہمسایوں کے ساتھ پُر امن زندگی بسر کرنے کے فن نے بہت ترقی کی تھی ۔"

اس عہد میں بھی روایتی اسلامی تقلید پسندی کے علم بردار پائے جاتے تھے لیکن ان کا اثر شاہ ولی اللہ جیسے اشخاص کی وجہ سے، جو ہندستان میں اسلام کے دائرے کے اندر طاقت ور تحریکِ اصلاح کے بانی سمجھے جاتے تھے، کافی کم ہو گیا تھا ۔ اس اصلاحی تحریک سے جس کی اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں شاہ ولی اللہ نے بنیاد ڈالی، مذہب کے بارے میں مباحثے کی آزادی کو جس کی اس کے قبل کوئی نظیر نہیں ملتی، بڑھاوا ملا ۔ ایک طرف سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی تحریروں سے رہنمائی حاصل کرنے والے نام نہاد وہابی تھے تو دوسری طرف وہابیوں کی سرگرمی سے مخالفت کرنے والے روایت پسند تھے ۔ شہر دلی دینی تحقیق و تفتیش کا ایک اہم مرکز بن گیا، جہاں مذہبی عقائد ملاؤں کی اجارہ داری سے نکل کر تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے موضوعِ بحث بن گئے تھے لیکن اہم بات یہ ہے کہ متنازع فیہ مذہبی مسائل و عقائد، بڑے جوش و خروش کے ساتھ زیرِ بحث آنے کے باوجود، تشدد یا کٹر دشمنی پر برانگیختہ کرنے والے جذبات کو ہیجان میں نہیں لا پاتے تھے ۔ خود غالب سے ان کے ایک نہایت عزیز دوست اور ممتاز روایت پسند مولانا فضل حق نے وہابی عقائد کے رد میں ایک مثنوی لکھنے کی درخواست کی ۔ مثنوی تو غالب نے لکھی لیکن، اس میں مسئلے کے بارے میں فضلِ حق کے نظریہ پرستانہ خیالات کی ترجمانی شائد ہی ہو پائی ۔ فضلِ حق غالب کی کوشش سے کلیتہً مطمئن نہیں ہوئے، لیکن جیسا کہ اس عہد کا عام مزاج تھا، انھوں نے غالب سے اپنی دلی دوستی برقرار رکھی ۔

اس عہد کا مقبولِ عام نظریہ صوفی روایت تھی، جس کے حلقہ ء اثر میں بارہویں صدی عیسوی سے اضافہ ہونا شروع ہوا اور جو غالب کے زمانے تک مسلمانوں کے لیے ایک مسلّمہ قابلِ اتّباع مسلک کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ساری کائنات میں اپنا جلوہ دکھانے والے، سہل القرب، شخصی اور محیط کل خدا سے راست رابطے کے ذرائع مہیّا کرنے والی اور شخصی روحانی تجربے پر زور دینے والی صوفی طریقت فطری طور پر مذہب کے اعمالِ ظاہری کو اہمیت نہیں دے سکتی تھی۔ غالب نے مذہبی رسوم پرستی اور اس کے حامی مولویوں کے تعلق سے اپنے حد درجہ حقارت آمیز رویےّ کو کبھی مخفی نہیں رکھا۔ ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں وہ برہمی کے ساتھ ایک ایسے مولوی کی دھجیاں اڑاتے ہیں جس نے غالب کے پاس یہ پیغام بھجوایا تھا کہ وہ شراب نوشی ترک کر دیں (جیسا کہ سب جانتے ہیں شراب کا غالب کو ساری عمر بے حد شوق رہا): "دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں۔ دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابوحنیفہ کا دیکھنا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقّہ ء وحدتِ وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔" فی الحقیقت "مولوی" ہجوِ قبیح اور طنز و تضحیک کا باقاعدہ نشانہ بن گیا تھا۔ چوں کہ یہ مختلف فرقوں کے درمیان بھائی چارے کا دور تھا، جب ہندو اور مسلمان آپس میں بہ آسانی گھل مل جاتے تھے، رسمی مذہب کے تقاضوں سے عموماً غیر معمولی لاپروائی برتی جاتی بلکہ ان کا مذاق بھی اڑایا جاتا۔

زہد و اتقا کی نمائش کے عادی "واعظ" کی ریاکاری کا مضحکہ اڑاتے ہوئے غالب قاری کو بے حد محظوظ کرتے ہیں:

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

یا پھر اسی رنگ میں فارسی کا یہ شعر ہے:

زاہد از حورِ بہشتی بجز ایں نشناسد
کہ شود دہشت زدِ شوق و بکارت نہ رود

(زاہد حورِ بہشتی سے بہ جز اس کے اور کوئی سروکار رکھنا نہیں چاہتا کہ وہ اس کی خواہش کا

ہدف بھی بنے اور اس کی دوشیزگی بھی برقرار رہے) ۔ بنیادی طور سے وہ زہدوتقویٰ کو خداوند تعالیٰ سے سودے بازی کی غرض سے استعمال کرنے کے خلاف تھے :

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ان کے فارسی مجموعہ ٔ کلام میں بھی اس سے ملتا جلتا خیال ملتا ہے :

زاہد و ورزشِ سجود آہ ز دعوی وجود
تانہ زد اہرمن رہش بدرقہ ٔ ملک نہ خواست

(زاہد کے لیے سجدوں کی ورزش اس کے پارسا وجود کا پرُ تصنّع دعویٰ ہے ۔
جب تک اہرمن نے اس کی راہ زنی نہیں کی اس نے فرشتوں کا بدرقہ نہیں مانگا)

انھیں یقین تھا کہ انسان کے وجود کا مزاج ہی ایسا ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر اور خدائے تعالیٰ کے لامحدود لطف و کرم کے ذریعے سچا مذہبی تجربہ انسان کی راست دست رس میں ہے ۔ روحانی اعتبار سے ترقی یافتہ فرد کے لیے خدائے تعالیٰ سے راست ارتباط کی تلاش میں عبادت کے رسمی طریقے کی کوئی اہمیت نہیں ہے :

قوی فتادہ چو نسبت ادب مجو غالب
نہ دیدہ ٔ کہ سوئے قبلہ پشت محراب ست

(نسبت قوی ہو تو رسمی آدابِ مجلس کی پابندی کیا ضروری ہے ۔ دیکھتے نہیں ہو کہ مسجد میں محراب کی پشت قبلے کی طرف ہے) ۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب کے اعمالِ ظاہری کی دھن قوتِ احساس کو مردہ کرتی ہے ، تعصب کا باعث ہوتی اور روحانی نشوونما کو روکتی ہے :

مخمورِ مکافات بہ خلد و سقر آویخت
مشتاقِ عطا شعلہ زگل باز ندانست

(مکافات عمل کی خواہش سے مخمور شخص خلدوسقر کے جھگڑے میں پڑا ہے
لیکن عطائے الٰہی کا مشتاق شعلہ و گل میں بھی فرق نہیں کرتا)

اور انھوں نے سب پر واضح کردیا کہ ان کی تنقید کا نشانہ اور کوئی نہیں تقلید پسندی کے علم بردار ہی تھے :

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگی رسم و رہِ عام بہت ہے

خود اپنے لیے وہ بلا جھجک قدیم رسوم کے خلاف نبرد آزما کے لیے مخصوص آزادی کا اعلان کرتے ہیں:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب   شرم تم کو مگر نہیں آتی

گو کہ سب جانتے تھے کہ غالب کی پیدائش ایک سنّی گھرانے میں ہوئی تھی، ان کا طرزِ زندگی اور مختلف مواقع پر اظہارِ خیال ان کے مذہبی موقف کے بارے میں ہر طرح کی قیاس آرائیوں کا باعث ہوا۔ دربار اور طبقہء امرا کے مختلف حلقوں میں بعض خیال کرتے تھے کہ وہ شیعہ ہیں اور بعض کے خیال میں وہ تفضیلیے تھے۔ خود غالب اس غیر یقینی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان کا رسمی مذہب کے تقاضوں کی ہنسی اڑانا اکثر ایک موضوعِ تفنن رہتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ رمضان کے روزے نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ اس بارے میں بہ شمول بادشاہ ان لوگوں سے جو دین دارانہ یہ فریضہ انجام دیتے تھے مذاق بھی کرسکتے تھے۔ وہ کھلّم کھلّا اقرار کرتے تھے کہ چوں کہ میں شراب پیتا ہوں آدھا مسلمان ہوں اور ان کا ادعا تھا کہ مذہبی رسم و رواج سے متعلّق امور کی حد تک دوسرے میری روش کے بارے میں کیا کہیں گے اس فکر سے میں نے خود کو آزاد کرلیا ہے۔

مذہبی رسوم کے تعلق سے اس علانیہ بے التفاتی کی بنیاد دراصل ایک متبحرانہ وسیع المشربی تھی، نسلِ انسانی کے بھائی چارے پر یقینِ واثق تھا، جس کی رو سے وجودی مفہوم میں تمام انسان ایک قادرِ مطلق کی الوہیت اور شفقت و محبت کی علامتیں ہیں۔

اس تصوّر کا تکمیلی جز نظریہء وحدت الوجود تھا۔ غالب کے لیے یہ سچے ذہنی یقین کلّی کا معاملہ تھا۔

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

اپنے ایک خط میں وہ محاربانہ انداز سے اعلان کرتے ہیں کہ وہ ہر انسان کو چاہے وہ مسلمان

ہو، ہندو ہو یا عیسائی، اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ اس پر اکتفانہ کرتے ہوئے آگے وہ کہتے ہیں کہ انھیں اس کی پروا نہیں ہے کہ دوسرے اس نقطہء نظر کی تائید کرتے ہیں یا نہیں۔ اپنے ایک اور شعر میں وہ ادعا کرتے ہیں:

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یا پھر

نہیں کچھ سبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

لیکن شاید ان کی وسیع المشربی اور رواداری کی حد درجہ غنائی مثال ان کی دل کش مثنوی "چراغِ دیر" ہے جس میں وہ مندروں کے شہر بنارس کی عظمت کی مدح سرائی کرتے ہیں:

تعالیٰ اللہ بنارس چشمِ بد دور　　بہشت خرم و فردوسِ معمور
تناسخ مشرباں چوں لب کشایند　　بہ کیش خویش کاشی راستایند
کہ ہر کس کاندراں گلشن بہ میرد　　دگر پیوند جسمانی نہ گیرد
دریں دیرینہ دیرستانِ نیرنگ　　بہارش ایمن ست از گردشِ رنگ
بود درعرض بال افشانیِ ناز　　خزانش صندلِ پیشانیِ ناز
زتسلیم ہوائے آں چمن زار　　زموجِ گل بہاراں بستہ زنّار
فلک را قشقہ اش گر برجبین نیست　　پس ایں رنگینیِ موجِ شفق چیست؟
عبادت خانہء ناقوسیان ست　　ہمانا کعبہء ہندوستان ست
بتانش را ہیولیٰ شعلہء طور　　سراپا نورِ ایزد چشم بد دور
زتابِ جلوہء خویشن آتش افروز　　بتانِ بت پرست و برہمن سوز
بہ سامانِ دو عالم گلستاں رنگ　　زتابِ رخ چراغانِ لبِ گنگ
مگر گوئی بنارس شاہدے ہست　　زگنگش صبح و شام آئینہ در دست
شبے پرسیدم از روشن بیانے　　زگردش ہائے گردوں راز دانے
کہ بینی نیکوئی ہا از جہاں رفت　　وفا و مہر و آزرم ازمیاں رفت

زایماں ہا بہ جز نامے نہ ماندہ		بغیر از دانہ و دامے نہ ماندہ
پدرہا تشنۂ خونِ پسر ہا		پسر ہا دشمنِ جانِ پدر ہا
برادر با بر اور در ستیز است		وفاق از شش جہت رو در گریزست
دریں بے پردگی ہائے علامت		چرا پیدا نہ می گردد قیامت ؟
بہ نفخِ صور تعویق از پے چیست		قیامت راعناں گیرِ جنوں کیست
سوئے کاشی بہ انداز اشارت		تبسم کرد و گفتا ایں عمارت
کہ حقانیت صانع را گوارا		کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنارا
بلند افتادہ تمکین بنارس		بود بر اوج او اندیشہ نارس

(کرے شرمندہ جنت کو بھی اپنے کیفِ رنگیں سے
بنارس کو خدا محفوظ رکھے چشمِ بدبیں سے
تناسخ پر عقیدہ رکھنے والے سب یہ کہتے ہیں
بنارس میں جو مرجاتے ہیں وہ بھی زندہ رہتے ہیں
یہ مانا پھر سے وہ پیوندِ جسمانی نہیں پاتے
یہ مانا چشمِ ظاہر بیں کے آگے وہ نہیں آتے
بنارس کا مگر اک سحر کہیے، شعبدہ کہیے
یہاں کی جاں فزا آب و ہوا کا معجزہ کہیے
کہ مرنے والے سب قالب بدل کر زندہ رہتے ہیں
مجسم نور بن کر جاوداں پایندہ رہتے ہیں
یہ کہنہ دیر، دیرستانِ عالم کا عجوبہ ہے
بدلتے موسموں سے ناشناسا اس کی دنیا ہے
بہار ایسی یہ رکھتا ہے چمن زار
کہ موجِ گل سے جو باندھے ہے زنار*
فلک یہ اپنی پیشانی پہ جو قشقہ لگاتا ہے
اسی کے گلشن و گل زار سے سرخی چراتا ہے

بنارس جانِ جاناں پائے تختِ بت پرستاں ہے
بنارس ارضِ خوباں ہے زیارت گاہِ مستاں ہے
بنارس کو عبادت خانہء ناقوسیاں کہیے
بنارس کو بجا ہے کعبہء ہندوستاں کہیے
صنم یاں کے بنے ہیں شعلہ ہائے طور سے گویا
ز سر تا پا عبارت ہیں خدا کے نور سے گویا
ہیں تابِ رخ سے اپنے آتش افروز
بتانِ بت پرست و برہمن سوز *
وہ رخساروں کی تابانی نظر حیراں و ششدر ہے
لب گنگا سراسر اک چراغاں کا سا منظر ہے
بنارس کو اگر ٹھیرائیے اک شاہدِ زیبا
وہ جس کے رو بہ رو صبح و مسا گنگا کا آئینہ
وحیدِ عصر اک عالم سے میں نے ایک دن پوچھا
یہ آخر ماجرا کیا ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا
جو پوچھو دین و ایماں کی تو بس اک نام باقی ہے
مئے الفت کہاں باقی ہے، خالی جام باقی ہے
ادھر ماں باپ ہیں اولاد سے برگشتہ و بدظن
ادھر یہ حال ہے اولاد بھی ماں باپ کی دشمن
لڑے مرتے ہیں بھائی بھائی آپس میں خدا سمجھے
محبّت، پیار، یاری، دوستی، عنقا ہے دنیا سے
قیامت کے سبھی آثار پیدا ہیں مگر پھر بھی
بہت حیران ہوں آخر قیامت کیوں نہیں آتی
مری اس بات کو سن کر تبسم زیرِ لب بولا
سوئے کاشی اشارہ کر کے وہ دانائے بے ہمتا

اسے دیکھو یہ شہر نور و نکہت یہ حسیں وادی
نہیں صنّاعِ فطرت کو گوارا اس کی بربادی
کہاں ہے فرشِ گیتی پر بنارس شہر کا ثانی
تصور خانہء مانی بھی اس کے آگے بے معنی
کمندِ فکر اپنی نارسائی پر ہے شرمندہ
بلند، اوجِ ثریا سے بھی اس کا نقشِ تابندہ)
(ترجمہ: اختر حسن)

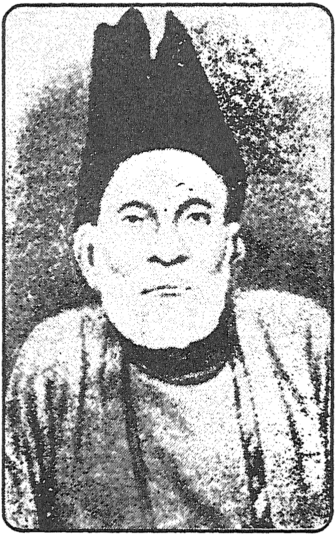
'چناں چہ تعجب کی بات نہیں کہ غالب نے فی الواقع بنارس میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہونے کا بھی ارادہ کیا تھا۔ ایک دوست کے نام خط میں وہ لکھتے ہیں: "میری آرزو تھی کہ ترکِ مذہب کرکے ایک مالا ہاتھ میں لے لیتا، ماتھے پر قشقہ کھینچ لیتا، گلے میں زنّار ڈال لیتا اور گنگا کنارے بیٹھ جاتا تاکہ خود کو وجود کی آلائشوں سے پاک کرسکتا اور قطرے کی طرح دریا میں ضم ہوجاتا۔"

امتزاج یہاں کلّی ہے۔ یہاں ہمارے سامنے خداشناسی کی وہ جستجو ہے جو مروجہ مذہب کی بندشوں اور تنگ نظری سے کلیتہً آزاد ہے۔ مذہب کی پھوٹ ڈالنے والی دیواروں کو اس دوٹوک ادعا سے کہ یہ مفید مطلب نہیں ہیں زمین کے برابر کردیا گیا ہے۔ انسانوں کے درمیان تفریق کی علامات کو انسانیت کے اس تصور میں ضم کردیا گیا ہے جو ہندو اور مسلمان کے لیبلوں کے ماورا ہے۔ اس سیکولرزم میں وہ یقین واثق اور ذہنی دیانت داری ہے جس کے بغیر غالب کے لیے یہ اعلان کرنا ممکن نہ ہوتا کہ:

کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

بلاشبہ دلیل لائی جاسکتی ہے کہ عام آدمی غالب کی انتہا پسندانہ سیکولرزم کا پوری طرح سے ہم نوا نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ صوفی سلسلہء تدریج میں غالب انتہائی وسیع المشرب گروہ کی نمائندگی کرتے تھے لیکن اگر ان کا عہد ان کے عقائد سے ایک حد تک مطابقت نہ رکھتا تو نہ ان کے لیے اپنے نظریے کا علانیہ اظہار اور اس پر عمل پیرا ہونا ممکن





بہادر شاہ ظفر

غالب

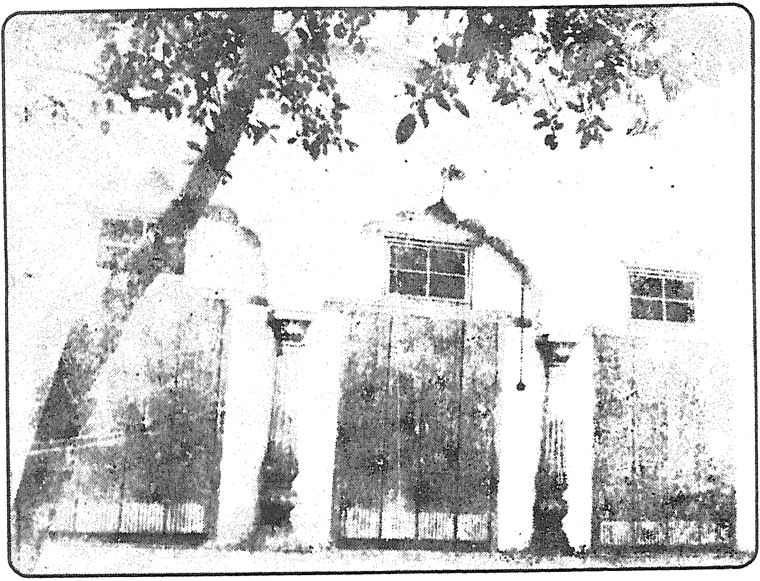
غالب اور ان کے چند ممتاز ہم عصر

شیخ ابراہیم ذوق

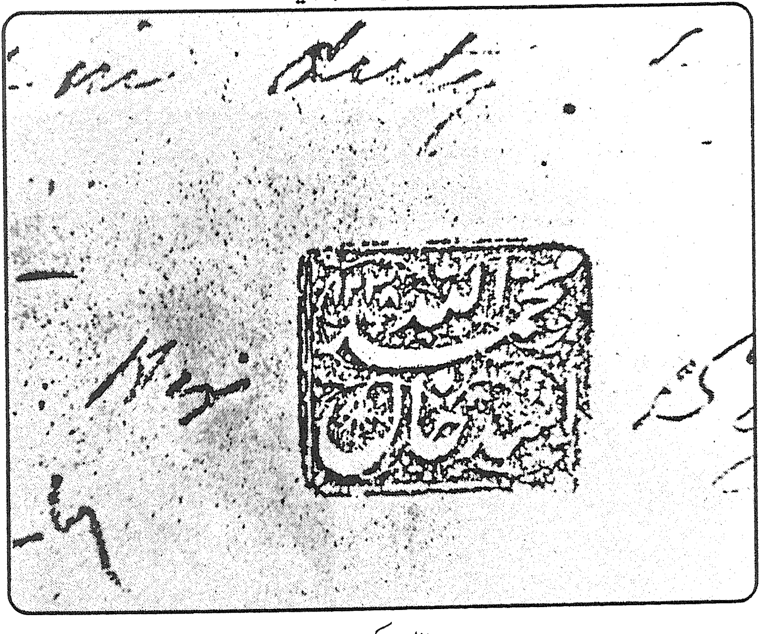
مومن خاں مومن



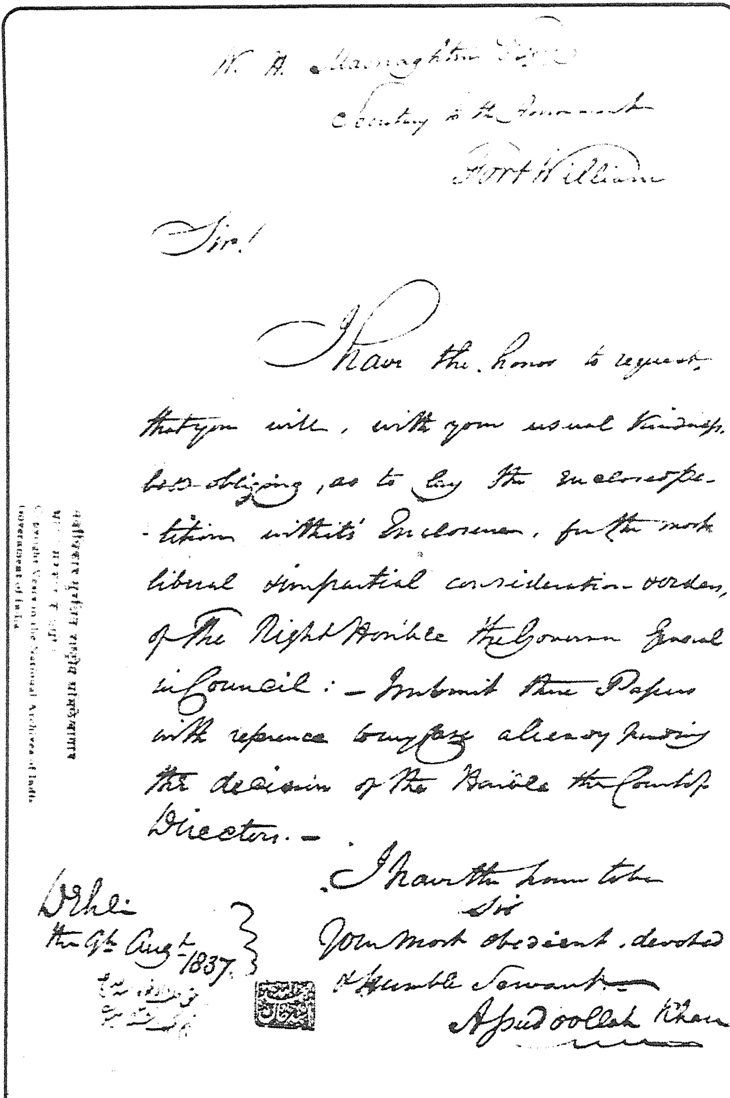




آگرے کا وہ مکان جہاں غالب پیدا ہوئے تھے۔



غالب کی مہر



W. H. Macnaghten Esq.
Secretary to the Government
Fort William

Sir!

I have the honor to request that you will, with your usual kindness, be so obliging as to lay the enclosed petition with its enclosures, for the most liberal & impartial consideration & orders of The Right Hon'ble the Governor General in Council: – I submit these Papers with reference to my case already pending the decision of the Hon'ble the Court of Directors. –

I have the honor to be
Sir
Your most obedient, devoted & humble Servant
Asudoollah Khan

Dehli
the 9th Aug. 1837.

One of Ghalib`s letters to the British. His personal seal can be seen at the bottom left hand corner.

انگریز حکام کے نام غالب کے مکاتیب میں سے ایک۔
بائیں طرف کونے میں ان کی شخصی مہر دیکھی جا سکتی ہے۔

آئینهٔ سکندر

نمبر ۲۰۸ تاریخ ۲۳ ماه فبروری سنه ۱۸۳۵ عیسوی روز دوشنبه

آئینهٔ سکندر جام جم است بنگر ❀ تا بر تو عرض دارد احوال ملک دارا ❀

* خبر دار الخلافه دهلی *

* ماه سمای کرم مهر سپهر حشم *

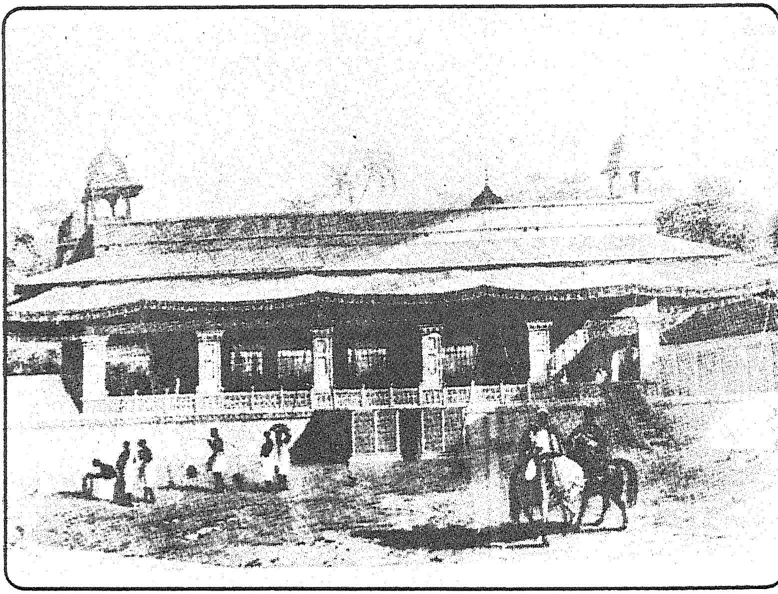
* خسرو دارا خدم مالک سیف و قلم *

بروز عشرت افروز عید رمضان حضرت ظل سبحانی [illegible] ایام جلوس [illegible] فروز شده و [illegible] که [illegible] مشرف بخلعت ممتاز بانعام فرمودند [illegible] سلامی از توپخانه [illegible] انگریزی میرسید [illegible] گروه حشم و خدم [illegible] خسروی گردیده بر تخت طاوس [illegible] شاهزادگان والا [illegible] گذرانیدند ولیعهد بهادر [illegible] میرزا [illegible] بهادر بعد مراجعت با سمت

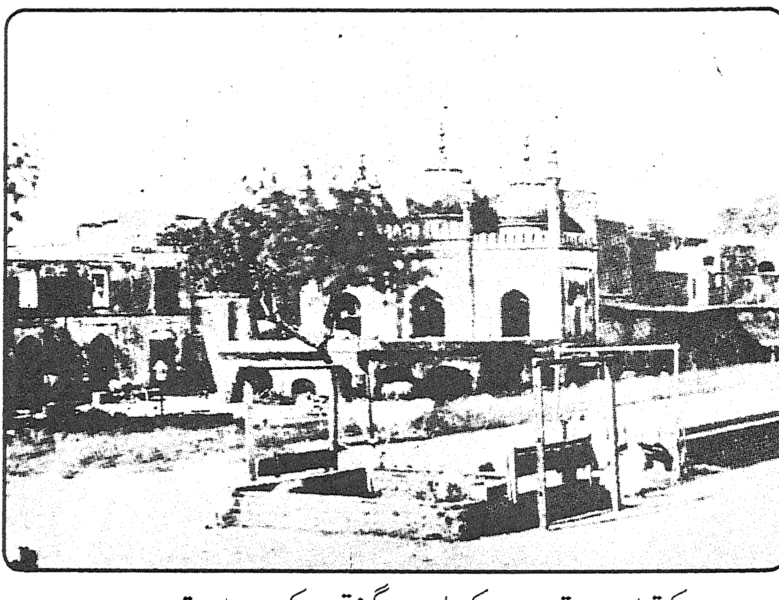
از مسجد جامع نذر گذرانیده معزز بخلعت شدند رزیدنت و [illegible] انگریز [illegible] نذر [illegible] خلاع فاخره امتیاز یافتند [illegible] میرزا [illegible] راجه [illegible] از اخلاق است اگرچه کسی از او [illegible] مخالف [illegible] سلطنت [illegible] است [illegible] حکیم آغاجان بخلعت مشرف شد. بسمع همایون رسانیدند که زوجه حکیم امام الدین خان برنجوری که داشت جهان گذران را پدرود کرد حکم محکم است بر کارگزاران سلطنت که طعام بطور [illegible] خانه اهل عزا فرستاده شود [illegible] شنیدند که جامع [illegible] شاهزاده [illegible] سلطان [illegible]

The Aina-i-Sikander, one of Delhi's earliest newspapers

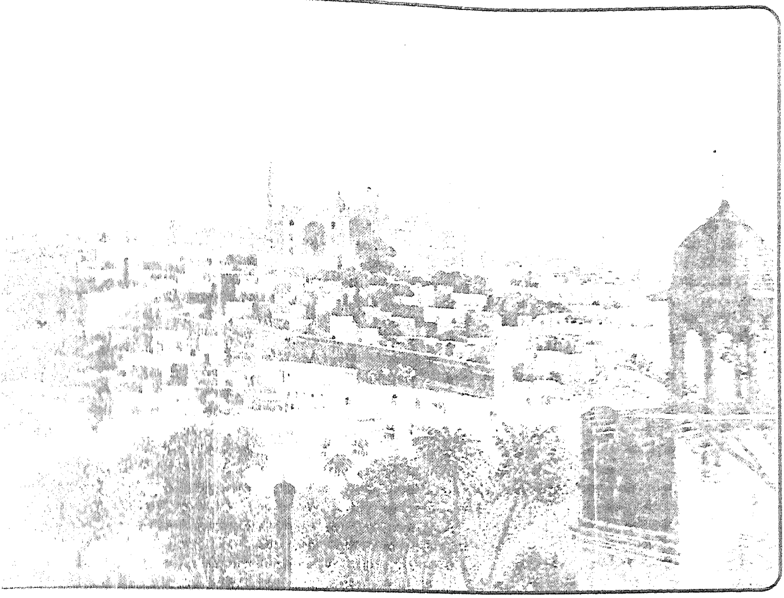
آئینہ سکندر دہلی کے اولین اخباروں میں سے ایک۔



دیوانِ خاص، لال قلعے کا اندرونی "مقامِ مقدس"



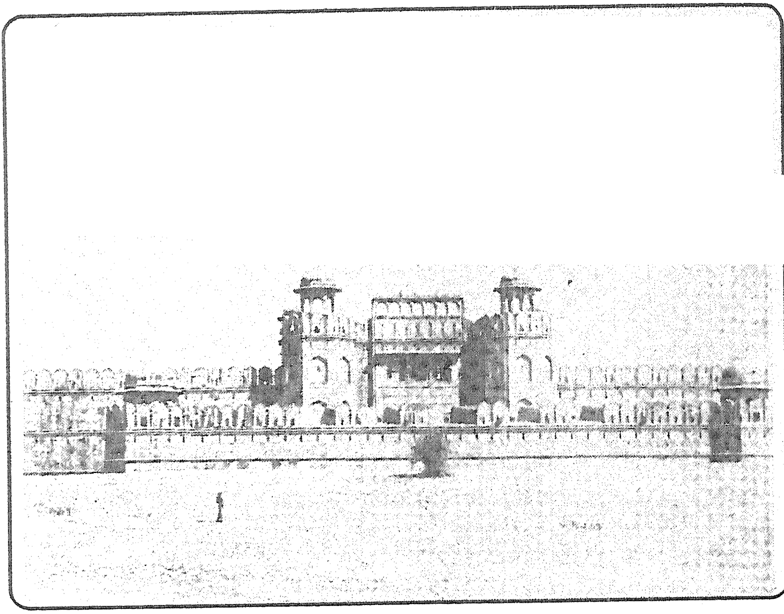
کوتوالی جہاں قمار بازی کے الزام میں گرفتاری کے بعد غالب قید رہے۔



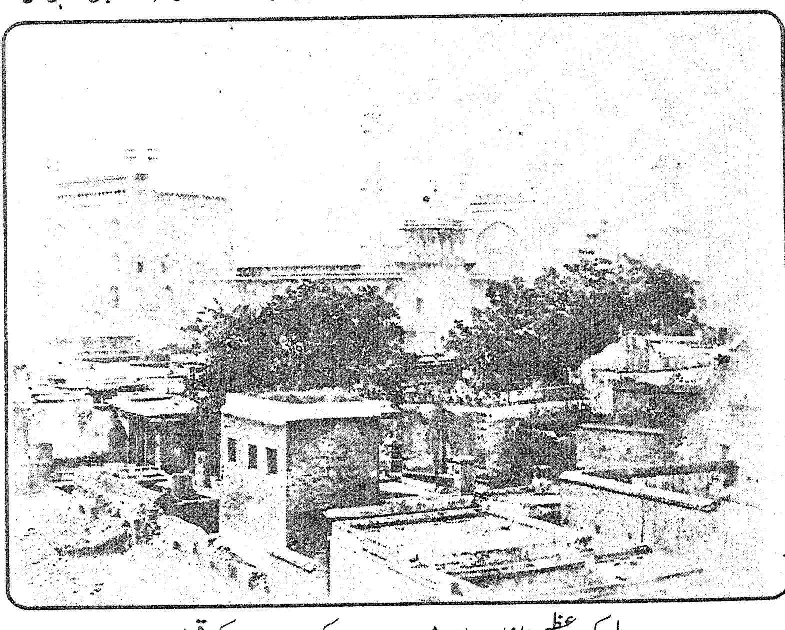
لال قلعہ اور شہر دہلی ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے قبل۔



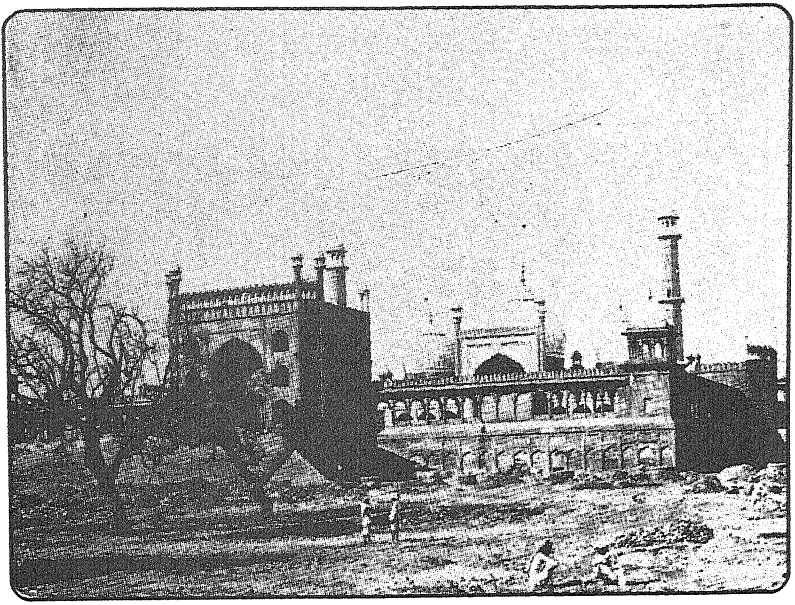
تباہی کا شکار دہلی بغاوت کے بعد، ہر طرف ملبے کے ڈھیر بکھرے ہوئے ہیں۔



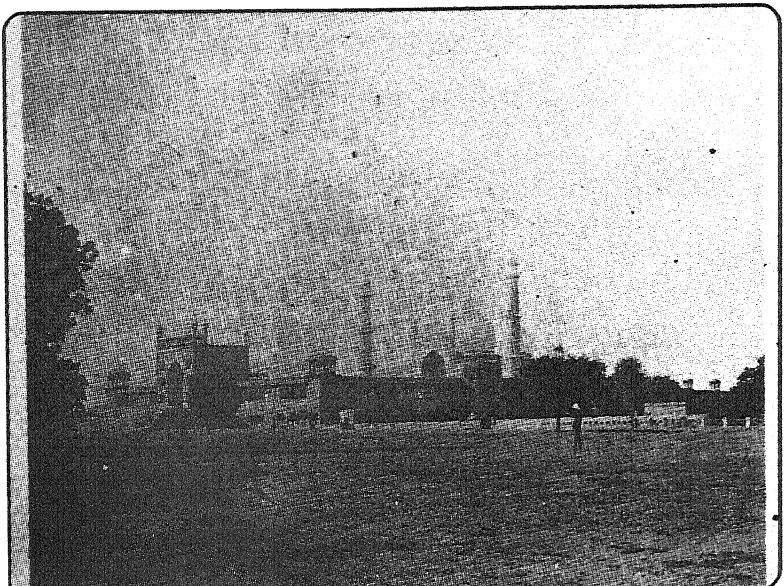
شہر کے مسمار کیے جانے کے بعد لال قلعہ یکا و تنہا۔ اب انگریز فوجیوں کی آتش باری کے سامنے کوئی مزاحمت باقی نہ رہی تھی۔



دہلی کی عظیم الشان جامع مسجد ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے قبل



جامع مسجد، ۱۸۵۷ء کے بعد، جب اس کے اطراف سبھی مکانات منہدم کر دیے گئے تھے۔



ایک عہد کی شان و شوکت کے آخری بچے کھچے گواہوں میں سے ایک: دہلی کی جامع مسجد۔

ہوتا اور نہ ہی انھیں بہ حیثیتِ شاعر اپنے کلام کے شائقین کی اتنی بڑی تعداد یسر ہوتی۔ نہ ہی، مثال کے طور پر، ان کے خیالات سے بنیادی ناموافقت کے دور میں ایک ہندو، منشی ہرگوپال تفتہ کے لیے غالب کا خاص الخاص شاگرد اور عزیز ترین دوست ہونا ممکن ہوتا۔ نہ ہی غالب کے لیے ایک اور ہندو شیوجی رام برہمن کو اپنے بیٹے کے مثل قرار دینا ممکن ہوتا اور نہ ہی بہادر شاہ ظفر کے لیے ایک نوعیسائی ہندو ڈاکٹر چمن لال کا اپنے شخصی معالج کی حیثیت سے تقرر کرنا ممکن ہوتا۔ فی الحقیقت، کہا جاتا ہے کہ جب بعض لوگوں نے برہمی کے ساتھ بہادر شاہ سے ڈاکٹر چمن لال کی تبدیلیِ مذہب کی شکایت کی تو انھوں نے الٹ کر جواب دیا کہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

اس وسیع المشربانہ کیفیتِ مزاج نے زبانِ اردو کے ارتقا میں انتہائی موثر کردار ادا کیا۔ مغلوں نے فارسی کو درباری زبان کی حیثیت دی تھی اور وہ اسے انتظامی اغراض کے لیے ہی استعمال کرتے تھے۔ فارسی اسلامی تقلید پسندی کی بھی زبان تھی لیکن فارسی عوام کی زبان کبھی نہیں بن پائی اور نہ ہی یہ رواداروں کے گھروں میں بول چال کی زبان تھی۔ فارسی سے مستفید ہونے والی لیکن اصلی خوراک عوام کی روز مرہ کی زبان کے محاورے اور خزانہء الفاظ سے حاصل کرنے والی ایک زبان کا ارتقا ایک مسلسل عمل تھا۔ صوفیا نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے ہمیشہ عوام الناس کی بول چال کی زبان کے استعمال کو ترجیح دی ہے۔ ادب میں ولی دکنی (۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء) جنھیں اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے، فارسی کے مقابلے میں اردو کو ترجیح دینے والے پہلے شاعر تھے۔ ان کے بعد حاتم (سالِ پیدائش ۱۶۶۹ء)، میر درد (سالِ وفات ۱۷۸۸ء)، مظہر جانِ جاناں (۱۷۰۰ء تا ۱۷۸۱ء)، سودا (۱۷۰۳ء تا ۱۷۸۰ء)، میر تقی میر (۱۷۲۲ء تا ۱۸۱۰ء)، انشاء اللہ خاں انشاء (سالِ وفات ۱۸۱۷ء) ناسخ (سالِ وفات ۱۸۳۸ء) جیسے دوسرے شعرا آئے۔ اردو شاعری کو میر و سودا کی دین خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ سودا کے ہجویہ قصائد کی آب و تاب اور میر کی عشقیہ مثنویوں کے سوز و گداز اور پیکر تراشی سے پہلی بار اردو کے ادبی امکانات ظاہر ہوئے۔ میر اس اردو کے استناد اور خصوصیت کے ادعا پر، جیسی کہ وہ دہلی کی بول چال کی زبان کی حیثیت سے پذیر ہوئی تھی، بالارادہ فخر کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ جب لکھنؤ میں ان سے

اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی گئی انھوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کردیا کہ لکھنوی میرا کلام سمجھ نہیں پائیں گے۔ لوگوں کے اصرار کرنے پر انھوں نے الٹا جواب دیا کہ صرف وہی جو جامع مسجد دلی کی سیڑھیوں پر بولی جانے والی اردو سے واقف ہے ان کا لکھا سمجھ سکتا ہے۔ اور یہ واقفیت اہلِ لکھنو کے پاس ہو نہیں سکتی۔ اس کے باوجود نوابانِ اودھ نہ صرف لکھنو کے اردو شعرا کی بلکہ دلی کے میر تقی میر کی طرح ترکِ وطن کرکے وہاں آنے والے دوسرے شعرا کی بھی فیاضانہ سرپرستی کرتے تھے۔ ۱۸۰۳ء میں قرآن شریف کا پہلی بار فارسی سے اردو ترجمہ کیا گیا جو کہ نہ صرف مذہبی نقطہ ء نظر سے ایک دور آفریں واقعہ تھا بلکہ اردو نثر کی قبولیت پر اپنے خوش آئند اثر کے لحاظ سے بھی۔ اس طرح سے انیسویں صدی کی ابتدا میں اردو کو بہ حیثیت زبان قوت بھی مل گئی تھی اور اعتبار بھی حاصل ہوگیا تھا۔ اس پیش رفت کے نتیجے کے طور پر، جس کا صوفی طریقے کی سماج میں روز افزوں مقبولیت اور اسلامی تقلید پسندی کے گھٹتے ہوئے اثر کے ساتھ توافق زمانی بھی تھا، فارسی کی جگہ اس زبان کے مغل دربار کی ازروئے قانون عام رابطے کی زبان بننے کے لیے فضا سازگار ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ فارسی کا نفسیاتی ورثہ اب بھی استوار تھا۔ مثال کے طور پر غالب اپنے اس خیال پر اڑے رہے کہ حقیقی مغل روایت کی زبان فارسی کے تعلق سے اردو کی حیثیت محض ایک انگھڑ گھس پیٹھو کی ہے تاہم چوں کہ ان کے زمانے میں ان قوتوں کے اردو کی ترقی کا باعث تھیں، نتائج سامنے آچکے تھے آخرکار انھوں نے اسے قبول کرلیا اور ان کا شمار اس زبان کے ممتاز ترین فن کاروں میں ہونے لگا:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی

گفتہ ، غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے کہ ۱۸۵۰ء کے دہے تک مقبول عام ادبی ذریعہ ء اظہار کی حیثیت سے اردو نے تقریباً کلیتہً فارسی کی جگہ لے لی تھی۔ فرحت اللہ بیگ اپنی زندہ ء جاوید مستند تصنیف "دلی کی آخری شمع" میں جس میں کم و بیش اسی زمانے کے ایک مشاعرے کی انھوں نے تشکیلِ جدید کی ہے، مشاعرے میں فارسی کلام پڑھنے والے واحد شاعر صہبائی کے تعلق سے سامعین کے ردِ عمل پر یوں تبصرہ کرتے ہیں: " (صہبائی کی غزل کی)

خوب خوب تعریفیں ہوئیں مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔۔۔ مگر جو بے چارے فارسی نہیں سمجھتے تھے، بیٹھے منہ دیکھا کیے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اردو کے مشاعرے میں فارسی کا ٹھونسنا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔"

غالب کے ہم عصروں میں ذوق، علوی، آزردہ، نیرّ، عیش، مومن، شیفتہ، جوہر، صہبائی، نظیر اکبر آبادی اور تفتہ جیسے آسمانِ ادب کے چاند ستارے شامل تھے۔ بہادر شاہ المتخلص بہ ظفر، خود مشہور شاعر تھے۔ ابتدائے عمر میں ان کے استاد مشہور شاعر نصیر تھے، بعد میں کہا جاتا ہے کہ وہ شاعر بے قرار سے صلاح لیا کرتے تھے، یہاں تک کہ بالآخر شیخ ابراہیم ذوق کی طرف رجوع ہوئے۔ ذوق کے انتقال کے بعد غالب شاعری میں استادِ شاہ مقرر ہوئے۔ ظفر کے عہد میں مغل دربار نے اس مرکز کی حیثیت حاصل کرلی جہاں سے اردو ادبیات کی بہار کو تحریک اور رہ نمائی ملتی تھی۔ محل میں ہر ماہ دو بار پندرہ اور انیس تاریخ کو، مشاعرے پابندی سے ہوتے تھے، جب کہ حضورِ والا فارسی اور اردو غزلیات کے لیے الگ الگ زمین تجویز فرماتے تھے۔ متعدد شاہ زادے اچھے شاعر تھے، جن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ظفر کے منجھلے بیٹے مرزا فخرو ہیں۔ ہفتہ وار مشاعرے مدرسہء غازی الدین میں بھی یعنی اجمیری دروازے کے پاس جہاں بعد میں دہلی کالج قائم کیا گیا تھا، منعقد ہوا کرتے تھے۔ شاعر ممنون کے گھر پر بھی مشاعروں کی محفل پابندی کے ساتھ جما کرتی تھی۔

ہر مسلّمہ شاعر کے پاس عقیدت مند شاگردوں کا ایک گروہ ہوتا۔ فی الحقیقت استاد شاگرد کے رشتے نے خود ایک ادارے کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ غالب کے شاگردوں میں ممتاز علائی اور ہرگوپال تفتہ تھے۔ مومن کے شاگردوں میں شیفتہ، تمکین، راقم اور حیا شامل تھے۔ ویران، ذوق کے بے حد عقیدت مند اور اکھڑ شاگرد تھے، جو ہر ایک سے جو ان کے استاد پر تنقید کرے بھڑ جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ مہذب زندگی کے خواہش مند ہر فرد کے لیے اردو میں شاعری کرنے اور اس کی قدر پہچاننے کی آموزش لازمی ہوگئی۔ چناں چہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اساتذہء سخن کے پاس اصلاح اور رائے زنی کے لیے پیش کیے جانے والے اشعار کی بھرمار ہوگئی۔ صحیح اردو لکھنے کا فن گہرے مطالعے کا موضوع اور اکثر تلخ مباحثوں کا باعث بن گیا تھا۔ شہر کے مانے ہوئے سرکردہ شاعر غالب

اور استاد شاہ ذوق کے درمیان رقابت پر سارا شہر انتہائی دل چسپی کے ساتھ نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

مشاعرے کا آغاز بڑے جتن سے منضبط کیے ہوئے آداب و رسوم کی پابندی کے ساتھ ہوتا تھا جس میں شاعروں کی نشست پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ یہ سوال کہ مشاعرہ شروع کون کرے گا اور ختم کون کرے گا تلخی کا سبب ہوتا تھا۔ طرح کا مقرر کرنا بھی قیل و قال اور نزاع کی ایک وجہ تھا۔ فی الحقیقت یہ جھگڑے اتنے شدید ہوگئے کہ بہادر شاہ کو اپنے پندرھواڑے کے مشاعرے موقوف کرنے پڑے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لینے والا اردو شاعری کا ماحول ہی تھا جسے غالب کے عہد کی وضاحت کے ساتھ تصویر کشی کرنے والی علامت کے طور سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ امر واقعہ کہ ممتاز شعرا کا کلام گلیوں میں بھاٹ اور گویّے گاتے پھرتے تھے اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شاعری اب محض مہذب رو داروں کا شوقِ بےحد نہیں رہی تھی بلکہ عوام بھی اس سے لطف اندوز ہوتے اور اسے سمجھتے تھے۔ جیسا کہ منشی ذکاء اللہ نے سی۔ ایف۔ اینڈریوز کو بتلایا: "بادشاہ ہو یا فقیر سبھی شاعری کی دیوی کے شکار تھے۔"

بہادر شاہ ظفر کے عہد میں دلی کے آخری مشاعرے کے مقامِ انعقاد مبارک النسا کی حویلی میں تیاریوں کی وہ روداد جو ہمیں فرحت اللہ بیگ کے پاس ملتی ہے اس لائق ہے کہ اسے شروع سے آخر تک نقل کیا جائے:

> "چونے میں ابرک ملاکر مکان میں قلعی کی گئی تھی جس کی وجہ سے درو دیوار جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہوگئے تھے۔ تختوں پر دری چاندنی کا فرش، اس پر قالینوں کا حاشیہ۔ پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار۔ جھاڑ فانوسوں، ہانڈیوں، دیوار گیروں، قمقموں، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعہء نور بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوب صورت اور جو شے تھی قرینے سے۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ، گنگا جمنی چوبوں پر سنہری ریشمی طنابوں سے استادہ

تھا۔ اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند، بیچھی ہر (سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا) کارچوبی گاؤ تکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے! فانوس کے کنول بھی سبز، چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے، بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جس کے سروں پر مقیش کے گچھے تھے اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیے تھے۔ اس سرے سے لگا کر اس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے سبز تھے، کھنچی ہوئی تھی۔ چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا گیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحن میں پانی کا انتظام تھا۔ کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور شورے میں شربت کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں۔ دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے۔ باورچی خانے میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے جما ہوا تھا۔ جا بہ جا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست بستہ مودب کھڑے تھے۔ تمام مکان مشک و عنبر اور اگر کی خوش بو سے پڑا مہک رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار تھی۔ حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دوکان پر سے اٹھ آئے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کو ان پر خاص دان رکھ دیے تھے۔ خاص دانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان۔ گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک تہہ پھولوں کی آ گئی تھی۔ خاص دانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں، ان میں الائچیاں، چکنی ڈلیاں اور بن دھنیا۔ مسند کے سامنے چاندی کے دو شمع دان۔ اندر کافوری بتیاں، اوپر

ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول۔ شمع دانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں کیوڑا۔۔۔۔"

فارسی اور اردو کی سنگی طباعت کے لیے دہلی میں چھاپنے کی مشین کی تنصیب سے لسانی سرگرمیوں کے حلقۂ عمل و اثر میں اضافہ ہوا۔ غالب کا اردو دیوان ۱۸۴۱ء میں اور فارسی دیوان ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔ یہ امر واقعہ کہ ۱۸۴۷ء میں ان کے اردو دیوان کی اشاعتِ دوم عمل میں آئی نہ صرف ان کے اردو کلام کی مقبولیت کا بلکہ ادبی ذوق کے حلقے کی بڑھتی ہوئی وسعت کا بھی ثبوت ہے۔ ہندستان کے بعض قدیم ترین اخباروں کا اجرا بھی اسی زمانے میں عمل میں آیا۔ بہ قول سی۔ ایف۔ اینڈریوز پہلا اردو اخبار کسی مولوی محمد باقر کی ادارت میں جاری ہوا۔ دوسرے دو اخباروں "فوائد الناظرین" اور "قران السعدین" کی ادارت نام ور فاضل ماسٹر رام چندر کرتے تھے جو بہ شمول ڈاکٹر چمن لال ان ممتاز ہندوؤں میں سے ایک تھے جنھوں نے عیسائیت اختیار کرلی تھی۔ انگریزی کا پہلا اخبار "دہلی گزٹ" تھا۔ اس بات کی شہادت ہے کہ ۱۸۳۰ء کے دہے میں ہی لوگوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ ایک سے زاید اخباروں میں سے کسی کا بھی انتخاب کریں اور اس کے خریدار بنیں اور وہ اچھے اور گھٹیا اخبار کے فرق کو پہچاننے بھی لگے تھے۔ غالب کے ایک دوست نے بہ ذریعہ خط ان سے اخبار "آئینۂ سکندر" کے دہلی میں مستقل خریدار فراہم کرنے میں مدد کی فرمائش کی، جس کے جواب میں غالب نے لکھا:

"صاحبِ من، میری آنکھیں "آئینۂ سکندر" کے مشاہدے سے روشن ہوئیں اور اس کی صفائے عبارت نے رشتۂ تحریر میں موتی پروئے۔ عمدہ بیان، مختصر خبریں، دل پسند نکتے اور نظر فریب نگارش اس کے صفحات کی زینت ہیں۔ آپ کا سحرِ قلم تو میرے دل و جان پر چلتا ہے اور میں ان اوراق کو دوسروں سے متعارف کرانے میں بہترین طریقے سے کوشاں ہوں۔ اس دیار کے رہنے والے "جامِ جہاں نما" کی نامعتبری سے بد دل ہیں، یوں بھی یہ لوگ اخبار نویسی کا صحیح ذوق نہیں رکھتے۔ انصاف بالائے طاعت، ایسا کم اتفاق ہوتا ہے کہ "جامِ جہاں نما" اس

ہفتے میں یہ خبر شائع کرے اور دوسرے ہفتے میں خود ہی اس کی تردید نہ کردے۔ ایک ہفتے میں سرکار انگریزی کی والیِ لاہور سے جنگ کی بات کرتا ہے کہ وہ موسم زمستان کی آمد سے پہلے چھڑ جائے گی اور دو ہفتے بعد خود ہی یہ اطلاع دیتا ہے کہ وہ خبر غلط تھی۔ اس ہفتے میں یہ خبر چھپتی ہے کہ اکبرآباد کی مسجد جامع اور روضہء تاج گنج کو اس قیمت پر فروخت کیا جارہا ہے اور دو ہفتے گزرنے پر خود ہی اعلان کرتا ہے کہ فرماں روایانِ کونسل اس بیع و شرا کو جائز نہیں سمجھتے۔" (فارسی سے ترجمہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

تاہم "جامِ جہاں نما" کی کوتاہیاں غالب کو کسی وبا کی طرح تیزی سے پھیلنے والی "اخبار کی لت" سے محفوظ نہیں رکھ سکیں۔ افواہوں یا قیاس کی توثیق کے لیے اخبارات کی مانگ میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا اور اپنے خطوط میں غالب خود اپنے اس میلانِ خاطر کا ذکر کرتے ہیں۔

صدی کے وسط تک ایسا لگتا ہے کہ اخبارات میں اتنی سکت آچکی تھی کہ خود اپنے شہر کے علاوہ دوسرے شہروں کے دل چسپ، اہم اور قابلِ اشاعت واقعات کا احاطہ کرسکیں۔ چناں چہ بمبئی کے اردو اخبار "احسن الاخبار" نے ۱۸۴۷ء میں قماربازی کے الزام میں غالب کی گرفتاری کی طول طویل تفصیلات شائع کیں۔ خود شہر دہلی میں ایک معاصر اخبار نے اداریے میں برہمی کا اظہار کیا۔ ہفتہ وار "سراج الاخبار" دربار کے اطلاع نامے کی حیثیت سے محل کے چھاپہ خانے سے شائع ہوتا تھا۔ لیکن اس میں کابل اور ڈیرہ غازی خاں جیسے دور دراز مقامات سے "نامہ نگاروں" کی بھیجی ہوئی اطلاعات یا قبرص میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کے مابین کش مکش جیسے نسبتاً بعید از کار معاملات پر تبصرے بھی شائع ہوتے تھے۔ یہ نہیں کہ اطلاعات ہمیشہ صحیح رہتی ہوں لیکن ان سے اخباروں میں خبروں کی پیش کشی کی روز افزوں وسعت اور راست تعلق نہ رکھنے والے واقعات سے باشندگانِ دہلی کی دل چسپی کے پھیلتے ہوئے دائرے کی نشان دہی ہوتی ہے۔

ادعا کیا جاتا ہے کہ "امنِ برطانوی" کے قیام سے لکھنو اور دوسرے شہروں کو ممتاز شعرا کی منتقلی پر روک لگی اور نتیجتاً اس سے دہلی میں اردو کی نشاۃ ثانیہ کو مدد ملی۔

مشاہدے پر مبنی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۰۳ء کے بعد دہلی کی آبادی میں واقعی اضافہ ہوا لیکن دہلی کی ذہنی فضا پر انگریزوں کے اثر کی نشان دہی اس سے کہیں زیادہ فیصلہ کن طریقوں سے بھی کی جا سکتی ہے۔ ہندستان میں اپنے بالکل ابتدائی عہد سے ہی انگریزوں نے تعلیمی اداروں کے قیام پر خاص توجہ دی تھی۔ جس کی وجہِ تحریک بنیادی طور پر ان کی یہ خواہش تھی کہ نوآبادیاتی حکومت کے استحکام کے لیے انگریز افسروں کے لیے دیسی زبانوں اور تہذیب سے واقفیت کا موقع فراہم کیا جائے۔ خیال یہ تھا کہ ان اداروں سے زیرِ حکومت افراد خصوصاً ان کے روداروں کو تہذیبی نقطہء نظر سے محکوم بنانے میں بھی مدد ملے گی۔ چناں چہ وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں کلکتے میں مشہور مدرسہء عالیہ قائم کیا، سرڈنکن نے ۱۷۹۱ء میں بنارس میں ہندو سنسکرت کالج کی بنا رکھی اور ۱۸۰۰ء میں کلکتے میں لارڈ ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کی تاسیس کی۔ ۱۸۰۳ء تک فورٹ ولیم کالج کے ڈاکٹر جان گل کرائسٹ انگریزی کی منتخب کہانیوں کا ہندستانی، فارسی، عربی، برج بھاشا، بنگالی اور سنسکرت میں ترجمہ کر چکے تھے (اس کے لیے انھوں نے رومن حروف استعمال کیے تھے)۔ آگرہ کالج ۱۸۲۳ء میں قائم کیا گیا اور بعد میں بمبئی، بنگال اور مدراس تینوں پریزیڈنسی صوبوں میں یونیورسٹیوں کی ابتدا ہوئی۔ دہلی میں مدرسہء غازی الدین میں ۱۷۹۲ء سے بہ روئے کار اسکول کی برطانوی مجلسِ تعلیم عامہ کی طرف سے فراہم کردہ مالی وسائل سے تنظیمِ جدید عمل میں آئی اور اس طرح دہلی کالج قائم ہوا۔

۱۸۲۴ء سے ۱۸۵۷ء تک دہلی کالج سی۔ ایف۔ اینڈریوز کے الفاظ میں "دانشِ جدید" کو رواج دینے کا ایک مرکز بن گیا۔ ناگزیر طور پر واضح ترین مرکزِ توجہ لسانی تھا۔ انگریزی زبان و ادب کی جماعتیں ۱۸۲۷ء میں شروع کی گئیں، جن کے نصاب میں گولڈ اسمتھ کی تصنیف "مسافر اور اجڑا گاؤں" پوپ کی نظم "مقالہ متعلق بہ انسان" ملٹن کی نظم "فردوسِ گم شدہ" اور اعلیٰ ترین جماعتوں میں شیکسپیر کے ڈرامے، بیکن کی تصنیف "فروغِ دانش" اور برک کے "مضامین و تقاریر" شامل تھیں۔ کالج میں اردو، عربی اور فارسی ادب کے لیے ایک علاحدہ "اورینٹل" یعنی مشرقی شعبہ بھی تھا جس کو ۱۸۴۸ء تک اپنے نصاب کی جامعیت کے لحاظ سے انگریزی شعبے سے برابری کا درجہ حاصل ہو گیا تھا اور شعبہ نہایت مقبول بھی

تھا۔ اینڈریوز لکھتے ہیں: "مشرقی شعبہ ۔۔۔۔ واقعی بہت مقبول ہوگیا تھا۔ جدید انگریزی علوم کی تحصیل کے لیے طلبا ان جماعتوں کو جہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ چھوڑتے نہیں تھے۔ فارسی اور عربی میں طلبا کی جس معیار تک رسائی ہوتی تھی وہ اکثر بہت اونچا ہوتا تھا۔" واقعی بعض نہایت ممتاز مشاہیرِ ادب مثلاً نام ور اردو شاعر الطاف حسین حالی، اردو اور فارسی کے مسلم الثبوت نثرنگار نذیر احمد، عربی کے ممتاز فاضل مولوی ضیاء الدین، مورخ اور بے شمار تصانیف کے مترجم مولوی ذکاء اللہ اور ادبی تنقید کی کتاب "آبِ حیات" کے مصنف محمد حسین آزاد کا تعلق اسی مشرقی شعبے سے ہے۔

مختلف وجوہ سے دہلی کالج سے مربوط تعلیمی نشاۃ ثانیہ ادبی سرگرمیوں کے بہ مقابل اس جوش و خروش کے لیے جو اس نے علومِ طبیعیات کی تحصیل کے لیے پیدا کیا اور ان مواقع کے لیے جو اس نے اس غرض سے فراہم کیے زیادہ قابلِ توجہ ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اس کے اور اس کلکتہ جاگرن (نشاۃ ثانیہ) کے مابین امتیاز قائم کرتی ہے، جہاں زور زیادہ تر ادبی مطالعے پر تھا۔ کلکتہ کے اولین تعلیمی اداروں نے جنھیں بنیادی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کو "دیسی زبانوں" کی تعلیم دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا، انگریز شاعروں اور ناول نگاروں کی تصانیف اور دیسی بنگالی ادب، فارسی، عربی اور اردو کے زیادہ باقاعدہ مطالعے سے دل چسپی پیدا کی تھی۔ یہ دل چسپی ایک ایسے ادبی جوش و خروش کا باعث ہوئی جو انگریز عہدہ داروں کے محدود افادیت پسند مقاصد سے کہیں زیادہ متجاوز ہوکر بنگالی روداروں کا بنیادی ثقافتی موضوع بن گیا۔ تاہم دہلی میں انگریزی جماعتوں کے قیام کو یک گونہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جس کا سبب آبائی مذہب سے برگشتہ اور عیسائی مذہب میں داخل کیے جانے کا خوف تھا، جو محض ایک حد تک اس وقت کم ہوا جب ۱۸۲۹ء میں لکھنو کے ایک ممتاز امیر نواب اعتماد الدولہ نے دہلی کالج کے حق میں ایک بیش بہا جائداد وقف کی۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اردو کی بے مثل مقبولیت پر منتج ہونے والی ادبی سرگرمیوں کی حقیقی نشاۃ ثانیہ کا آغاز دہلی کالج کے قیام کے پہلے ہوچکا تھا۔ کالج ایک جاری و ساری عمل کو شروع تو نہیں کرسکتا تھا محض آگے بڑھا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بہادر شاہ ظفر کے تحت مغل دربار کی حیثیت ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک مرکزی ادارے کی تھی جس نے کلکتہ کے برعکس

جہاں اس طرح کی شاہی سرپرستی میسر نہیں تھی، اسے بلاشرکت غیرے اپنا رول ادا کرنے کا موقع نہ دے کر اس کی اہمیت کو گھٹادیا۔ کالج نے دراصل لوگوں کی قوت متخیلہ کو گرفت میں لیا تو ان دریچوں کی بہ دولت جو اس نے مغرب میں علوم طبیعیات کی تحصیل میں پیش رفت کے مشاہدے کے لیے باز کیے تھے۔ علوم طبیعیات پر انگریزی کتابوں کا جفاکشی لیکن جوش و خروش سے صفحہ بہ صفحہ اردو میں ترجمہ کیا جاتا اور نقلیں تقسیم کی جاتیں۔ سرگرم طلبا نے کلیتہً علومِ طبیعیات کے لیے وقف، چار پینی قیمت والے ماہ نامے کی اشاعت شروع کی۔ اس اعتماد کی وجہ سے جو ادب کے شعبے میں اردو نے اس وقت تک حاصل کرلیا تھا، اس کی ٹکنیکل معلومات کے ذریعہء ابلاغ کی حیثیت سے قلبِ ماہیت میں مدد ملی۔ طبیعیات اور کیمیا کے تجربوں یا ریاضی کے اطلاق کے پہلے پہل مشاہدے نے ایسا لگتا ہے کہ جوش و خروش کی ایک برقی لہر دوڑا دی تھی۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز لکھتے ہیں: "پرانے دہلی کالج میں ممکن الحصول تعلیم کا بہ درجہا مقبول شعبہ وہ تھا جس کا سروکار علومِ طبیعیات سے تھا۔۔۔ اپنے بڑھاپے میں منشی ذکاء اللہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ کتنے اشتیاق سے وہ سائنس کے لکچر سنے جاتے تھے اور کیسے ہر لکچر کے بعد نوٹ کا باربار مطالعہ کیا جاتا تھا اور طلبہ اس کی متعدد نقلیں تیار کرتے تھے۔ گویا ہم ذہنِ انسانی کے ایک بالکل نامعلوم علاقے میں داخل ہورہے ہوں۔"

کالج کے بعض طلبہ نے بعد میں سائنس کو اپنی دین کی بہ دولت امتیاز حاصل کیا۔ ماسٹر رام چندر، جنھوں نے وظائف اور انعامات حاصل کرکے اپنی تعلیم مکمل کی، آگے چل کر ریاضی کے پروفیسر بنے، تفرقی احصا (Differential calculus) پر جن کی تصنیف یورپ میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ شمالی ہند کے اولین ڈاکٹروں میں سے ایک ڈاکٹر مکندلال، جن کی طبِّ مغرب سے گہری واقفیت کی وجہ سے بڑی عزت تھی، کالج کے طالبِ علم رہ چکے تھے۔ کالج کے ایک اور ممتاز فارغ التحصیل سرسید احمد خاں تھے جنھیں ریاضی اور علمِ آثار قدیمہ میں یکساں درک حاصل تھا اور جنھوں نے بعد میں ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ میں مسلم اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا۔ طلبا بادی النظر میں ارکانِ شعبہء تعلیم کی دل سے عزت کرتے تھے اور اسی طرح معلوم پڑتا ہے کہ اساتذہ بھی علم کا شوق رکھنے والے اپنے طلبہ

کی ذہنی نشوونما میں بے حد دل چسپی لیتے تھے۔ اس امر کی شہادت ہے کہ کالج کے پرنسپل ٹیلر اپنے شاگردوں میں خاص طور پر جوش پیدا کرتے اور انھیں حوصلہ دیتے تھے۔ دوسروں مثلاً باشندۂ فرانس بطروس اور باشندۂ جرمنی اسپرنگر کا احترام کیا جاتا تھا اور انھیں پسند کیا جاتا تھا۔ ایمیلی بیلی اپنی یادداشتوں میں اسپرنگر کے بارے میں یاد تازہ کرتی ہیں: "ایک عجیب باشندۂ جرمنی ڈاکٹر اسپرنگر (دہلی کالج کے) پرنسپل تھے۔ ان کی بیوی نے جو انھیں کی طرح ایک قابلِ قدر لیکن عامی باشندۂ جرمنی تھیں اور جن سے میں واقف تھی مجھ سے کہا کہ شام میں مجھے گھر پر اکیلا چھوڑ کر باہر جانے سے روکنے کے لیے مجھے اپنے شوہر کی پتلون چھپا دینی پڑتی تھی۔"

یقیناً شہر میں مغربی سائنسی نظریات کے ناقدر شناس بھی تھے۔ یہ ناگزیر تھا کیوں کہ "دانش نو" کو کالج کے احاطے میں قرنطینہ میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ جوش میں آئے ہوئے طلبہ اکثر گھر پر اکٹھا ہو کر اپنے سائنسی مباحثوں کو جاری رکھتے یا اپنے والدین کی موجودگی میں، جو بالکل چہ کنم میں ہوتے کہ کیا ہو رہا ہے، نئے تجربے انجام دیتے۔ ماسٹر رام چندر اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں: "عربی کے ذریعے پڑھائے جانے والے قدیم فلسفے کے عقائد اس طرح جدید سائنس کے زیادہ قرینِ عقل اور تجربے پر مبنی نظریات کے سامنے ماند پڑ گئے مثلاً اس قدیم عقیدے کی کہ زمین کائنات کا ایک جگہ پر قائم مرکز ہے دہلی کالج کے مشرقی شعبے اور نیز انگریزی شعبے کے منتہی طلبہ ہنسی اڑاتے تھے۔ لیکن شہر میں رہنے والے اہلِ علم قدیم یونانی فلسفے کے اپنے پسندیدہ نظریات کے تعلق سے جن کی گذشتہ کئی صدیوں سے ان کو تعلیم دی جارہی تھی، اس بدعت کو بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھتے تھے۔" اگر ان تقلید پسندوں اور سن رسیدہ حضرات کے عقائد نہیں تو کم از کم ان کے خدشات بالکل بے بنیاد نہیں تھے۔ اس زمانے میں انگریزوں کے رواج دیے ہوئے نئے خیالات اور دوسرے مذاہب کے پیرووں کے حلقۂ عیسائیت میں شمول کے مابین ایک ربطِ باہمی قائم ہو چکا تھا۔ بیپٹسٹ تبلیغی انجمن نے ۱۸۱۸ء میں اپنا کاروبار شروع کردیا تھا اور جب ۱۸۵۲ء میں "انجمن تبلیغ انجیل" کا قیامِ عمل میں آیا تو اس کے حقیقی مقاصد کو پوشیدہ رکھنے کی کوششیں بھی رفتہ رفتہ ترک کردی گئیں۔ یہاں تک کہ عیسائی مبلّغین کا بڑھتا ہوا اثر وسیع المشرب غالب کے بھی پیشِ نظر تھا۔

انھوں نے ان کی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا :

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

چناں چہ راسخ العقیدہ " دانشِ نو " کو تبدیلِ مذہب کے ذریعے نئے پیرو بنانے کی غرض سے مروجہ مذاہب کو درہم برہم کرنے کا بڑی ہوشیاری سے ایجاد کیا ہوا ایک وسیلہ سمجھنے میں حق بہ جانب تھے۔ یہ امر واقعہ کہ " دانش نو " کے مشہور اور ممتاز حامیوں میں سے ایک ماسٹر رام چندر اپنا آبائی مذہب ترک کر کے عیسائی ہوگئے تھے بہ ظاہر ان کے خدشات کو صحیح ثابت کرتا تھا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ وہ اپنے نسبتاً کم عمر ہم مذہبوں کی سادہ لوحی کو شبہہ کی نظر سے دیکھنے کا میلان رکھتے تھے۔ ایک ہم عصر انگریز، شاید " دیسیوں " کی جہالت اور توہم پرستی کو ڈرامائی شکل میں پیش کرنے والے ارادی مضحکہ انگیز تصرف کے ساتھ لکھتا ہے کہ مراد آباد کے ایک نواب نے کوپرنیکس کے ذکر پر کس طرح اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا :

> " اور جناب کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی کسی دور بین کی شہادت کو میں رسولِ پاک کی شہادت کے مقابل رکھوں گا ؟ نہیں جناب، آپ یقین رکھیے کہ دور بین میں مغالطہ بہت ہے، اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے بہتیرے یورپی صاحبوں سے گفتگو کی ہے اور میرے خیال میں ان دور بینوں پر کامل عقیدہ ان کی بڑی بھول ہے، ان کی شہادت کو وہ حضرت موسیٰؑ، ابراہیمؑ اور الیاسؑ جیسے نبیوں کی شہادت پر فوقیت دیتے ہیں ! یہ دور بینیں کتنی موجب ضرر ہوسکتی ہیں اس کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے ! نہیں جناب، ہمیں نبیوں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رہنا چاہیے، ان کا کہا سچ ہے، وہ واحد سچ جس پر اس زندگی میں ہم کلیتہً بھروسہ کرسکتے ہیں۔ میں ساری دنیا کی دور بینوں کی شہادت کو عہد نامہء قدیم و جدید یا قرآن شریف میں مذکور معمولی سے معمولی نبی کے فرمودہ ایک لفظ کے مقابلے میں بھی بالکل بے حقیقت مانوں گا۔ جنابِ

من، پیغمبروں کا ہاتھ تھامے رہیے اور اپنی دور بینیں پرے پھینکیے۔ ان میں کوئی سچائی نہیں ہے: بعض دور بینیں تو لوگوں کو الٹا کردیتی ہیں اور ان کو سر کے بل چلتا دکھاتی ہیں اور اس کے باوجود اس شہادت کو آپ انبیاءؑ کی شہادت کے مقابلے میں پیش کرتے ہیں۔"

جیساکہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں یہ آبائی مذہب سے برگشتہ کرا کے عیسائی مذہب میں لائے جانے کا خوف تھا جس نے تقلید پسندوں کے ردِ عمل کو اتنا شدید اور ارادی طور پر خود ...ت پر مبنی بنا دیا تھا۔ ورنہ معاشرے کا وہی مزاج جس نے اردو کو فارسی کی جگہ لینے کی اجازت دی تھی یا جس کے نتیجے میں مذہبی وسیع المشربی کو اتنی بے نظیر اور عام مقبولیت حاصل ہوئی تھی، نئی سائنس کے حق میں بھی کام کرتا۔ فی الحقیقت اس امر کی شہادت ہے کہ تقلید پسندوں کی لگائی ہوئی قیود و شرائط کے باوجود مغربی علوم طبعیات کی تحصیل کا دائرہء اثر بہت وسیع تھا، چاہے اس کا اثر قبول کرنے والوں میں سے بعض اس کے بارے میں اتنے پُرجوش نہ بھی رہے ہوں جتنے ماسٹر رام چندر یا منشی ذکاء اللہ تھے۔ ۱۸۵۰ء کے دہے کی ابتدا میں سید احمد خاں آئینِ اکبری یعنی اکبر کے عہد میں مغلیہ نظم و نسق پر ابوالفضل کی مستند کتاب کو بعد تہذیب و تدوین شائع کر رہے تھے۔ انھوں نے شہر کے دیگر ممتاز اشخاص کے ساتھ ساتھ غالب سے بھی ایک تقریظ لکھنے کی فرمائش کی لیکن غالب آئینِ اکبری پر قوت صرف کرنے کو فضول ماضی پرستی قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ وہ سرسید سے کہتے ہیں: "ان صاحبانِ انگلستان کو دیکھو۔۔۔۔ وہ ہمارے مشرقی پرکھوں سے کہیں آگے نکل چکے ہیں۔ باد و موج کو انھوں نے بے کار بنادیا ہے۔ ان کے جہاز آگ اور بھاپ سے چلتے ہیں۔ وہ ساز سے نغمہ بغیر مضراب کے پیدا کرتے ہیں اور اپنے جادو سے الفاظ کو چڑیا کی طرح اڑاتے ہیں۔ ہوا کو آگ لگاتے ہیں۔۔۔۔ شہروں کو چراغ کے بغیر روشن کردیتے ہیں۔۔۔ جب ایسا گنجِ گہر تمھارے سامنے ہے تو ایسے دیرینہ خرمن کی خوشہ چینی کیا ضروری ہے؟" اس زمانے میں جب ماضی کو بڑھا کر پیش کرنا اور اس کی وصف و ثنا کرنا ایک فطری بات تھی غالب کے ردِ عمل کا کچھ نہ کچھ تعلق یقیناً مغربی علم و فن اور سائنس کے اثر اور ان تمام پاستانی باتوں کے لیے حقارت کے جذبے سے تھا جن کے یہ قدامت پرست حامی تھے۔

خالص مادی اعتبار سے دہلی میں انگریزوں کی موجودگی برائے نام تھی۔ انگریز رزیڈنٹ شہر کی فصیل کے باہر رہتا تھا اور شہر کا نظم و نسق مٹھّی بھر انگریز غیر فوجی عہدہ داروں کے ذریعے چلاتا تھا۔ انگریز فوجی افسروں اور ان کے ماتحت سپاہیوں کو سمجھ بوجھ کر نگاہوں سے دور پہاڑی سلسلے پر چھاؤنیوں میں رکھا گیا تھا۔ اس سے ان لوگوں کے لیے جو اپنے دل کو اس خیال سے بہلانا چاہتے تھے کہ کچھ بھی تو نہیں بدلا ہے اپنے خیال پر جمے رہنے کا موقع ملتا تھا۔ لیکن درحقیقت شہر کی نفسیاتی ساخت پر برطانوی اثر صریحاً محسوس کیا جاسکتا تھا اور اس طاقت کے پیش نظر جو اس کی پشت پناہ تھی اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ جب انگریز رزیڈنٹ طامس مٹکاف "صاحب" (۱۸۵۳ء میں) مرے تو غالب کو اپنے ایک خط میں لکھنا پڑا کہ ایک لاکھ آدمیوں نے جنازے میں شرکت کی۔ انگریز مددگار رزیڈنٹ کا سرکاری مسکن لال قلعے کے صدر دروازے کے اوپر تھا، یعنی ایسے مقامِ تفوق پر جس کا علامتی مفہوم لامحالہ کسی بھی دلی والے کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ انگریز رزیڈنٹ خود کشمیری دروازے کے باہر ایک شان دار کوٹھی "مٹکاف ہاؤس" میں رہتا تھا جس کا وسیع و عریض احاطہ جمنا کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا۔ انگریز سوسائٹی کے خواص کا طبقہ جج، ڈاکٹر، پادری، چند فوجی افسروں اور رزیڈنٹ کو نظم و نسق چلانے میں مدد دینے والے مٹھّی بھر عہدہ داروں پر مشتمل تھا۔ رتبے میں تمام بلاؤں سے محفوظ و مامون اس حلقے کے بعد تاجر، بینک مالکین اور انتظامیہ کا ماتحت عملہ آتا تھا۔ بجائے خود ایک طبقہ قسمت آزماؤں کا تھا مثلاً اسکاچ باپ اور راج پوت ماں کا بیٹا مشہور و معروف کرنل جیمس اسکنرؒ۔ جس نے دوغلا ہونے کے باوجود اپنے کروفر اور انگریزوں کے مفاد سے وفاداری کی بہ دولت اس سوسائٹی میں اونچا رتبہ حاصل کرلیا تھا۔ اپنے زرد خفتان، لال پگڑی اور کمر بند کی بہ دولت نمایاں، کرنل اسکنرؒ کے بے قاعدہ رسالے کے سوار (جن کے بارے میں بشپ ہیبر پکار اٹھے کہ "جنوبی روس میں جب میں تھا اس کے بعد اتنے انتہائی دل آویز اور بھڑکیلے گھڑسوار میں نے اب دیکھے ہیں") غالب کی دہلی میں اکثر دکھائی دیتے تھے۔ کرنل اسکنرؒ نے کشمیری دروازے کے پاس سینٹ جیمس گرجا تعمیر کروایا جو دہلی میں عیسائی فرقے کا سب سے اہم گرجا بن گیا۔ یہ سب اپنی جگہ پر اس کے باوجود اسکنرؒ کو انگریزوں نے اپنی سوسائٹی میں کھلے دل سے قبول نہیں کیا تھا،

اس کے تعلق سے ان کے رویے میں مروت کی جھلک آسانی سے دیکھی جا سکتی تھی۔ ایمیلی بیلی اپنی یادداشتوں میں لکھتی ہیں: "کرنل اسکنر کالے خون کے آدمی تھے، ان کی بیوی ایک دیسی خاتون تھیں اور ان کے بچے لامحالہ گہری سانولی رنگت کے تھے اور انگریزی ایک انوکھے لہجے میں بولتے تھے۔ اور انگلستان سے نووارد لوگوں کے لیے سارا خاندان ایک عجیب و غریب انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا۔۔۔ حالاں کہ وہ خود کو انگریز سمجھتے تھے اور دلی کی سوسائٹی میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے وہ برائے نام تعلیم یافتہ تھے اور اپنے طور طریقوں میں انگریز سے زیادہ دیسی تھے۔" ایسی ہی تمسخر آمیز مروت کا برتاؤ بہ ظاہر سبھی اینگلو انڈین افراد سے کیا جاتا تھا جو انگریزی معاشرے میں قبولیت کے دوامی لیکن مذبذب امیدوار ہی رہے۔ گو کہ پادری ڈیوڈ طامپسن کی طامس مٹکاف بڑی عزت کرتے تھے ایمیلی اس امر پر دھیان دیے بغیر نہ رہیں کہ موصوف "گہری سانولی رنگت کے تھے، ان کی رگوں میں بہت سارا دیسی خون تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اور ان کے گھر والے لباس کے تعلق سے انگریزوں کے رسم و رواج سے بالکل ناواقف تھے۔" اس گروہ کی ایک اور اہم رکن نامی گرامی افسر کرنل فارسٹر کی بیوی، مسز فارسٹر اور ان کی بہن کے بارے میں کہا گیا کہ حالاں کہ وہ "بہت اچھی عمر رسیدہ خواتین" ہیں مگر "مخلوط النسل ہیں، گہری سانولی رنگت کی ہیں اور انگریزی بہت ہی عجیب و غریب لہجے میں بولتی ہیں۔" اکثر "شب خوابی کے چوغے جیسا لباس پہنتی ہیں۔"

انگریز سوسائٹی سے دور کا تعلق رکھنے والے بعض ارکان دریا گنج میں رہتے تھے۔ لیکن اصل برطانوی عیسائی نوآبادی شہر کے شمال میں کشمیری دروازے کے قرب و جوار کے علاقے میں قائم ہوئی تھی۔ رزیڈنٹ کمشنر کی کوٹھی کو بجا طور پر شانِ فضیلت حاصل تھی۔ سر جین ڈاکٹر لڈلو کے بنوائے ہوئے لڈلو محل یا کرنل اسکنر کے بنوائے ہوئے سینٹ جیمس گرجا جیسی دوسری عمارتیں بھی قابلِ توجہ تھیں۔ گرجا کے عقب میں ایک سلاح خانہ اور ایک ڈاک گھر بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ بعض انگریز عہدہ دار فصیل بند شہر کے کچھ ہی اندر کشمیری دروازے کے علاقے میں مکان کرائے پر لے کر رہتے تھے۔ اس طرح سے انگریزوں نے "چھوٹے پیمانے پر لندن کی وضع پر خود اپنا ایک طریقہء ماند و بود ایجاد کر لیا تھا، جس میں رزیڈنٹ (بعد میں کمشنر اور ایجنٹ) کی حیثیت مرکز کی تھی، لڈلو محل یہاں کا بکنگھم

پیلیس تھا ۔ مٹکاف ہاؤس یہاں کا ونڈ سر تھا ۔ قطب کے پاس مہرولی میں مٹکاف کا دیہاتی کنجِ عزلت " دل کُشا " یہاں کا سارڈ نگھیم تھا اور کشمیری دروازے کے پاس سینٹ جیمس کا گرجا یہاں کا کلیسہء اسقف تھا ۔"

انگریزوں کی کوشش یہ رہتی تھی کہ اس وقت انگلستان میں مروجہ معاشرتی رسم و راہ کے مسلمہ قاعدوں کی دہلی میں ہو بہ ہو نقل کریں ۔ ہر سال ملکہ وکٹوریہ کی سال گرہ کے موقع پر محفل خانوں میں اجتماعی محفلِ رقص منعقد ہوتی تھی ۔ ہر ماہ رزیڈنٹ کی طرف سے بارہ یا سولہ مدعوئین کے لیے میز کرسی پر بڑے کھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا جس کے دوران کھانا ڈربی یا وورسیسٹر کے چینی کے برتنوں میں چنا جاتا تھا ، " مہمان کے طور پر ایک دوسرے کے پاس رسمی ملاقات کے لیے دوپہر کے کھانے سے پہلے ایک مقررہ وقت پر جاتے تھے ، اور لباس کے تعلق سے بڑے سخت قاعدے تھے جو اکثر و بیش تر " دوغلوں " کو (جس نام سے ایمیلی نے اینگلو انڈین گروہ سے متعلق افراد کا ذکر کیا ہے) الجھن میں ڈال دیتے تھے ۔ اس پر برطانوی نوآبادیاتی طرزِ زندگی کے بعض ناگزیر عناصر اضافہ تھے مثلاً چھاؤنی میں فوجی بینڈ باجا سننے کے لیے اکٹھا ہونا ۔ ان موقعوں پر رسمی پوشاک میں ملبوس صاحب لوگ ایک گاڑی سے دوسری گاڑی کو منتقل ہوتے اور خواتین سے خوش گوار بات چیت کرتے ۔

لیکن اس کے باوجود کہ " وطن " سے جوڑنے والے تہذیبی رشتوں کو صحیح و سالم رکھنے کی بڑی تن دہی سے کوشش کی جاتی تھی دیسی اثر کا نفوذ بھی واضح تھا ۔ طامس مٹکاف کے ملبوس سینٹ جیمس اسٹریٹ لندن کے اونچے درجے کے ٹیلر ماسٹر پُل فورڈ کے ہاں سے باقاعدہ ہر سال آتے رہے ہوں یا وہ انگلستان سے صندوق بھر کتابیں سال میں دو بار منگواتے رہے ہوں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر صبح ناشتے کے بعد ڈھلی ہوئی چاندی کی ٹیک والا حقہ لاکر ان کی کرسی کے پیچھے رکھا جاتا تھا ۔ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کی بیٹی اس کی سریلی قل قل کی آواز کی وضاحت سے یاد تازہ کریں گی ۔ ہندستان کے موسمی حالات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے انھوں نے اپنی کوٹھی میں ایک تہہ خانے اور ایک چبوترے کا اہتمام کیا تھا جس پر وہ روزانہ شام کے وقت بیٹھتے اور اپنے بہت سارے کبوتروں کی اٹ کھیلیوں سے اپنا دل بہلاتے ۔ بہت سے ہندستانی امرا کی طرح انھوں نے بھی شہر کے باہر ایک گھر بنوالیا تھا

اور خاصے پُر معنی انداز سے اسے اردو نام "دل کُشا" دیا تھا۔ طامس مٹکاف کے بڑے بھائی چارلس کا دیہاتی کُنجِ عزلت شالی مار باغ میں تھا، جہاں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے ہندستانی خاندان کی رہائش کے لیے ایک مکان بنوایا تھا۔ (یہ چارلس مٹکاف دو بار دہلی کے رزیڈنٹ رہ چکے تھے)۔ کرنل اسکنر کے کشمیری دروازے والے شہر کے مکان میں ساری انگریزی ٹیپ ٹاپ کے باوجود مغل طرز کے حمام گھر تھے اور صریحی طور پر "دیسی" وضع کا ایک زنان خانہ بھی تھا۔ حرم کا رواج بلا تامّل مستعار لے لیا جاتا تھا۔ دو مٹکاف برادران، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جن کے ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے اخلاقی اصول قدرے زیادہ غیر تغیر پذیر تھے، نسبتاً اعتدال پسند تھے۔ لیکن ان کے ہم سروں کے اس معاملے میں بڑے ٹھاٹ تھے۔ فرانسیسی سیاح جیک مان، جو اسی زمانے میں دہلی آیا تھا، لکھتا ہے کہ غالب کے دوست اور ۱۸۳۰ء کے دہے میں دہلی کے انگریز رزیڈنٹ ولیم فریزر کی "چھے یا سات باقاعدہ بیویاں ہیں لیکن وہ دہلی سے کم و بیش پچاس فرسخ کے فاصلے پر اکٹھے رہتی ہیں اور جیسا چاہتی ہیں کرتی ہیں۔ اس کے اتنے ہی بال بچے ہوں گے جتنے شاہِ ایران کے لیکن وہ سب اپنی اماؤں کے مذہب اور ذات پات کے لحاظ سے مسلمان یا ہندو ہیں۔" دو بار دہلی میں رزیڈنٹ کے عہدے پر مامور سر ڈیوڈ اختر لونی کی تیرہ بیویاں تھیں اور جب تیرہ کی تیرہ ہاتھیوں پر سوار ہوا خوری کے لیے نکلتی تھیں تو دلی والے اس جلوس کو دیکھتے اور بہ مشکل اپنی ہنسی روک پاتے۔ عین ممکن ہے کہ غالب نے بھی یہ تماشہ دیکھا ہوگا۔

ہر ایک انگریز "بڑے صاحب" کے پاس نوکروں یعنی چپراسیوں، ہرکاروں، چوب داروں، حقہ برداروں، خان ساماؤں، صدر بیروں، جمع داروں، مالیوں، دھوبیوں، چوکی داروں وغیرہ کی ایک پوری فوج ہوتی تھی، جس کے پیشِ نظر ایک نووارد انگریز تاجر نے رائے زنی کی کہ ہندوستان میں مقیم انگریزوں کے پاس "انھیں موزے پہنانے کے لیے نوکر ہوتے ہیں۔ مجھے بس یہ تعجب ہے کہ وہ ان کی طرف سے ان کی غذا چبانے کے لیے خدمت گار نہیں رکھتے۔" چناں چہ ان لوگوں کا پُر تکلف نوابی طور طریقے اختیار کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں تھا، خاص طور سے اس اجنبی ماحول میں جہاں "وطن" سے مادی بُعد بہ جائے خود، چال چلن کو متعیّن کرنے والے قاعدوں سے انحراف کے خلاف پابندیوں کو ڈھیل دینے میں

ممد تھا ۔ مقامی زبان، رسوم و رواج اور طرز معاشرت سے واقفیت بھی اچھی نوآبادیاتی حکمتِ عملی تھی اور دیسی طور طریقوں کو اپنانے کی بہت سی باتوں کو انگریز اسی وجہ سے معقول قرار دیتے تھے ۔ لیکن یہاں ایک اور امر واقعہ بھی تھا: ابتدائی دور میں کم از کم انگریز اپنے زیرِ حکومت شہر کی اصلی تہذیب و ثقافت کو حقیقی احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ انگریز عہدہ دار کرنل سلیمن، جس نے ۱۸۳۶ء میں دہلی کا سفر کیا، لکھتا ہے:

> " ذہنِ انسانی کی صلاحیتوں اور اس کے افعال پر، انسان کے جذبات اور ذہنی کیفیات پر، اور زندگی کے تمام تعلقات میں اس کے فرائض پر اثر کے لحاظ سے امام محمد غزالی اور نصیر الدین طوسی کی تصانیف افلاطون اور ارسطو کی یا کسی بھی ملک میں انھیں موضوعات پر دیگر مصنفین کی کسی بھی زمانے اور کسی بھی ملک میں لکھی ہوئی تصانیف سے شائد ہی کم تر ہوں ۔ یہ تصانیف ۔۔۔ سعدی کے نصیحت آمیز کلام کے بہ شمول اخلاقی تعلیمات کا عظیم " ایرانی سرِ چشمہ " ہیں جس سے ایک مسلمان اپنی خوردسالی سے لے کر کبر سنی تک ڈٹ کر پینے کا لطف اٹھاتا ہے اور کسی بھی تین آدمیوں کی تصانیف میں اس سے بہتر سرچشمہ تلاش کرلینا شائد ہی ممکن ہو ۔"

چارلس مٹکاف کے لیے فارسی مستند کتابوں کا مطالعہ تفریح کا ایک ذریعہ تھا ۔ دہلی میں رزیڈنٹ کے عہدے سے حیدرآباد میں اسی عہدے پر تبادلے کے بعد وہ " میلوں تک ہر طرف پھیلے ہوئے عظمتِ رفتہ کے کھنڈروں ۔۔۔ خاک میں ملتے ہوئے ایوانوں اور دہلی کے وسیع و عریض مقبروں " کو یادِ ماضی کی افسردگی کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ " ان امور کو بے اعتنائی سے نہیں دیکھا جاسکتا ۔" ولیم فریزر اردو اور فارسی سے ایک اہلِ زبان کی طرح واقف تھا اور اس کے پاس فارسی اور عربی کتابوں کا ایک نہایت عمدہ کتب خانہ تھا ۔ متعدد انگریز فارسی اور اردو میں اشعار لکھتے تھے ۔ بعض نے اپنے تخلص بھی رکھ لیے تھے مثلاً جنرل جوزف بینسلی فنا، جارج پوئخ شور اور الیکزینڈر ہیدرلی آزاد ۔

ڈاکٹر ہووارڈ اور ڈاکٹر ہوئے کی طرح دوسروں نے اردو آموزش و تعلیم کے اولین پیش رو ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کا کام جاری رکھا اور معروف اردو فضلا کی صف میں اپنی جگہ بنائی۔

یہ امر واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ہندستانی روداروں نے انگریزوں کے طرزِ زندگی کی نقل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بے شک اکا دکا مستثنیات بھی تھیں مثلاً بہادر شاہ ظفر کے چھوٹے بھائی مرزا بابر۔ وہ یورپین لباس پہنتے تھے، انھوں نے لال قلعے میں "رنگ محل" کے عقب میں یورپین وضع کا مکان بنوالیا تھا اور فل بوٹ پہنے ہوئے اور دونوں طرف سینے پر تارے ٹکے ہوئے یورپین یونی فارم میں ملبوس جب وہ انگریزی کوچ گاڑی میں بیٹھ کر ہوا خوری کو نکلتے تو دہلی کے بذلہ سنجوں کے لیے خندہ زیرِ لب کا کافی سامان مہیا ہوجاتا۔ بہ حیثیت ایک گروہ اینگلو انڈین اور ایک حد تک متوسط طبقے کے معدودے چند نو عیسائی بھی ان دیگر افراد میں شامل تھے جو شعوری طور پر انگریزوں کے پُر تکلف طور طریقے اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن بالعموم ہندوستانی روداروں کا طرزِ زندگی روایتی اور مقررہ راستوں پر خاصا غیر متغیر اور ثابت قدم رہا۔ " اس عہد کے ممتاز شعرا مثلاً غالب، مومن اور ذوق ۔۔ ایک بالکل الگ تھلگ ہوا بند ماحول میں زندگی گزارتے، چلتے پھرتے اور اپنا وجود رکھتے تھے ۔۔۔ اور انھیں اشرافی روایت کی قائم مقام مغل تہذیب کے آخری نمائندے سمجھنا چاہیے ۔" جہاں تک کہ برطانوی موجودگی ناگزیر تھی اسے تسلیم کیا جاتا تھا لیکن سماجی اور تہذیبی سطح پر اس سے شہر کے خود اعتماد، ملکی معاشرتی مزاج کو کبھی کوئی بڑا خطرہ لاحق نہیں ہوا تھا۔ بہترے ہندستانیوں نے دہلی کالج میں انگریزی سیکھی ضرور تھی لیکن غیر ملکی زبان کی یہ تحصیل بالعموم روزگار کے امکانات کو بہتر بنانے کی غرض سے کی جاتی تھی اور روایتی نصابِ درس کے تمام پہلوؤں سے کامل واقفیت کے علاوہ ہوتی تھی۔

اس ابتدائی عہد میں انگریز خود اردو کی اس ابھرتی ہوئی تہذیب کے رگ و پے میں سرایت کرنے والے ماحول کے قدرے گرویدہ ہوگئے تھے جو ہندستانی طبقۂ امرا کے طرزِ زندگی سے بادی النظر میں اتنی مناسبت رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شروع میں امرا اور انگریزوں کا ربط باہمی ایک حد تک برابری بلکہ بے تکلفی کا تھا، وہ دعوتوں یا دوسری سماجی تقاریب کے موقعوں پر ملتے، یا دہلی بینک یا انجمن آثارِ قدیمہ جیسے اداروں کی مشترک

رکنیت کے ناطے ایک دوسرے سے خلا ملا پیدا کرتے ۔ خود غالب کی بہتیرے انگریز عہدہ داروں کے ساتھ بے تکلفی تھی اور ولیم فریزر سے ان کے تعلقات بالخصوص بہت پُر تپاک تھے ۔ لیکن ہندستانی امرا اور انگریزوں کے یہ تعلقات کلیتہً خوش گوار بھی نہیں تھے۔ دیوانی نزاعات میں حکم کی حیثیت سے انگریز عمال اکثر دشمنی بھی مول لیتے تھے ۔ غالب کے دوست اور مداح فریزر کا ۱۸۳۵ء میں ایک ممتاز امیر نواب شمس الدین کے حکم سے سنسنی خیز قتل، جو جائداد کے جھگڑے میں اپنے بھائی کے دعوے کی فریزر کی طرف سے حمایت پر ناخوش تھے ، زیرِ بحث مسئلے سے تعلق رکھنے والے ایک ڈرامائی واقعے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ انگریزوں نے ہندستان کے تہذیبی ماحول کی چمک دمک کو جذب تو ضرور کیا لیکن انتہائی نیک طبیعت انگریز بھی اسے محض جزوی طور پر ہندستانی سماج کے بہ احتیاط نمو دیے ہوئے قدیم و مقدس آدابِ مجلس اور ریت رسم کے سچے ادراک کی شکل دے سکے ۔ ۱۸۳۷ء کے قحطِ عظیم کے دوران طامس مٹکاف نے غلّے کے بیوپاریوں کو قیمتیں کم کرنے پر مجبور کرنے سے اس بنا پر انکار کیا کہ یہ بات ضوابط بنگال کے خلاف ہوگی ۔ لیکن باشندگانِ دہلی کا خیال تھا کہ حاکم کے لئے قوانین کی ان کے ظاہری معنی کے لحاظ سے آنکھ بند کر کے تعمیل ضروری نہیں ، اسے تو عدل گستری کرنی چاہیے ۔ غیر سیاسی شعبوں میں بھی دو جدا گانہ نظام ہائے اقدار کا اختلاف برقرار رہا ۔ اسی لیے پراونشل سکریٹری طامسن کی سمجھ سے یہ بات بالا تر تھی کہ اس صورت میں جب کہ غالب اس سے ملاقات کو نوکری کے امیدوار کی حیثیت سے آرہے ہیں تو اسے ہمیشہ کی طرح دروازے پر غالب کی پذیرائی کی کیا ضرورت ہے ۔ جہاں تک غالب کا تعلق ہے تو طبقہء امرا کے ایک رکن ہونے کے ناطے وہ طامسن کی اس ناشائستگی کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر تھے جو اس کی طرف سے خوش خلقی کے لازمی قواعد کی خلاف ورزی کی شکل میں ظاہر ہوئی ۔ اس خلاف ورزی کے بالمقابل نوکری کی کوئی اہمیت نہیں تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ جب نواب شمس الدین نے ، جنھیں ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں سزائے موت سنائی گئی تھی ، انگریزوں سے درخواست کی کہ ان کو پھانسی ان کے ذاتی کپڑوں میں دی جائے تو درخواست نامنظور کردی گئی ۔ انگریز ایک جدید اخلاقِ عامّہ اور اخلاقیات کے بہم پہنچانے والے بن گئے جو برطانوی صورتِ حال سے تو مناسبت رکھتی تھی

لیکن ہندستان کے سیاق و سباق سے اکثر میل نہیں کھاتی تھی۔ اکثر ان خیالات کی تہہ میں کارفرما اصول کا تعلق ایک جدید معاشرے سے تھا لیکن " اصلاحات " کے نفاذ کے لیے افادیت پسندانہ بے قراری کے جذبے سے سرشار ان کو اس معاشرے کی پروا نہ کرتے ہوئے جس کے اپنے پوری طرح سے متعین اور حالات سے بالکل ہم آہنگ چال چلن کے مسلّمہ قاعدے تھے، مبلغانہ مستقل مزاجی کے ساتھ روبہ عمل لایا جاتا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں غالب قمار بازی کے الزام میں گرفتار کیے گئے اور انھیں دو سو روپیہ جرمانے اور چھ ماہ قید با مشقّت کی سزا سنائی گئی۔ ہندستانی امرا اتنی غیر معمولی سخت سزا سے حیرت زدہ تھے۔ غالب اس انگریز سشن جج سے جس نے مقدمے کی سماعت کی تھی اچھی طرح واقف تھے۔ مگر وہ واقعی حیران تھے کہ جج یوں عمل پیرا ہوا جیسے وہ انھیں جانتا ہی نہ ہو۔ اطوار کی "درشتگی" پر انگریزوں کے نئے نئے دریافت شدہ زور کا تعلق ہندستان کے بارے میں ان کے رویے میں ایک بنیادی تبدیلی سے تھا جو ۱۸۵۷ء سے عین قبل کے چند سالوں میں روز افزوں نمایاں ہوتی گئی۔ ہر " دیسی " چیز کے شدید نظریاتی استرداد کی بنیاد انگلستان میں خود مختار مبلغینِ انجیل چارلس گرانٹ اور ولیم ولبر فورس اور کلیپ ہیم فرقے کے دیگر اراکین نے ڈالی۔ ان کا سب سے مقدم نصب العین عیسائی حکومت کی ضرورت کو ثابت کرنا تھا تاکہ آلودگی سے پاک کرنے والے عامل کی حیثیت سے وہ قعرِ مذلّت میں گرے ہوئے اور پست ہمت ہندستان کو اس پر چھائی ہوئی " اخلاقی " معصیت سے چھٹکارا دلاسکے۔ اس رجحان کو فلسفیانہ تقویت نظریہ افادیتِ اجتماعی سے ملی، جس کے حامی جیمس مِل اور ان کے بیٹے جان مِل تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دونوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے۔ ہندستانی روداروں سے ابتدائی دور کے بے تکلفانہ تعلقات کو اب ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ بیگم سمرو جیسے خصوصی موردین عنایت کو بھی، جس نے آبائی مذہب ترک کر کے عیسائیت اختیار کرلی تھی، جس نے اپنی کوٹھی (موجودہ بھاگیرت محل) میں خود لارڈ لیک کی مہمان نوازی کی تھی اور جس کی دعوتیں انگریزوں کے لئے مقبولِ عام تقریب کی حیثیت رکھتی تھیں، اب اس لائق نہیں سمجھا جاتا تھا کہ انگریز ان سے خلاملا پیدا کریں۔ "۔۔ اس سرزمین کی فاتح انگریز برداری کو اس کے (یعنی بیگم سمرو کے) سامنے اظہارِ عقیدت کرتے ہوئے اور اس کی

پاؤں رکھنے کی تپائی کے سامنے اس کی نظرِ عنایت حاصل کرنے کے لیے چاپلوسی کرتے ہوئے یا پھر اپنے رتبے سے گر کر اس کی دعوتیں قبول کرتے ہوئے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے ۔"

یہ ایک اہم عصر انگریز کا قول ہے اور اس سے نئے برطانوی نظریے کی بالکل صحیح ترجمانی ہوتی ہے ۔ کرنل سلی مین کی یادداشتوں کے محولہ ء صدر اقتباس کے برعکس اب ہندستانی تہذیب کو لارڈ میکالے یہ کہہ کر مسترد کردیتے ہیں کہ وہ محض مجموعہ ہے " ان طبیّ عقائد کا جو ایک انگریز بیطار کے لیے بھی باعثِ شرم ہیں ، ایسی فلکیات کا جس کی انگلستان کے اقامتی اسکول کی لڑکیاں بھی ہنسی اڑائیں گی ، ایسی تاریخ کا جو تیس فٹ لمبے اور تیس ہزار سال تک حکم رانی کرنے والے بادشاہوں سے بھری ہوئی ہے اور ایسی جغرافیہ کا ، جو مشتمل ہے شیرے اور مکھن کے سمندروں پر ۔"

جب غالب عنفوانِ شباب ہی میں تھے ، چارلس مٹکاف نے انگریز رزیڈنٹ کی حیثیت سے اپنے پہلے دور میں ستی کے انسداد اور سزائے موت کی موقوفی کا اعلان کردیا تھا ۔ موخرّ الذکر اقدام کا محرک بادی النظر میں انسان دوستی کا نظریہ بھی تھا اور حکمتِ عملی بھی : سزائے موت کی توثیق مغل بادشاہ سے کروانی پڑتی تھی اور اس کی موقوفی سے بادشاہ اقتدار کے ایک اور پہلو سے محروم ہوگیا ۔ بالعموم انگریز انتظامیہ نے موجودہ قوانین اور رواج کی کسی بنیادی تشکیلِ جدید کی فوراً کوئی کوشش نہیں کی لیکن ان کی رائج کی ہوئی بعض جدتوں نے شہر کی زندگی کے جوار بھاٹے میں ہلکورے ضرور پیدا کئے ۔ اس طرح کا ایک ہلکورا ۱۸۵۰ء کے دہے میں محصولِ آمدنی کی ابتدا تھی ۔ ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں غالب اس کا ذکر کرتے ہیں :

> "۔۔۔ شہر میں ایک وبا آئی ، یعنی وکیلِ (ایسٹ انڈیا) کمپنی نے سنینِ مافیہ کے کاغذ دیکھ کر رسومِ سرکاری جس شخص پر نکلتی تھیں ، ان کا مطالبہ کیا ہے اور مطالبہ کیا ، مواخذہ یعنی بہت شدت ۔ ازآں جملہ مجھ پر بھی بابت رسوم سرکاری پان سو روپے آٹھ آنے نکلے اور اس کی طلب یہ قیدِ حکم قید ہوئی ہے ۔ میں آٹھ آنے کو محتاج ، پان سو کہاں سے لاؤں ۔" (خط

بہ نام منشی نبی بخش حقیر مورخہ ۲۹ مئی ۱۸۵۳ء)

ایک اور "جدّت" جس نے روز مرہ کی زندگی کو متاثر کیا "ڈاک خانے" کی تھی، خصوصاً غالب جیسے شخص کے لیے، مکتوب نگاری جن کی فطرتِ ثانی بن چکی تھی۔ اس ادارے کے مستحکم ہونے کے قبل، ابتداء میں جیسا کہ عام طور سے ہوتا ہے کچھ عملی دشواریاں تھیں جس کا محکمے کی کارکردگی کے بارے میں غالب کی بار بار کی پھبتیوں سے کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے

"مگر انگریزی ڈاک کا حال لکھیے۔ نہیں معلوم کیا بندوبستِ جدید ہوا ہے کہ بالکل ڈاک کا انتظام و اعتماد جاتا رہا ---- میرٹھ سے بھی فریاد آئی ہے۔ آگرے کے خطوں سے بھی سنا جاتا ہے، اگر چہ میرا کوئی خط اب تک تلف نہیں ہوا ہے مگر وبائے عام میں بچاؤ کہاں ----" (خط بہ نام منشی نبی بخش حقیر ۴ / جون ۱۸۵۴ء)

اسی خوش تدبیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو گھٹیا کارکردگی سے نبٹنے کے لیے آج کی دلی کا ستایا ہوا صارف بھی بہ روئے کار لاتا ہے غالب ایک آسان ترکیب ایجاد کرتے ہیں:

"خط لکھ کر ازراہِ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے۔ تم بھی اس کا جواب بیرنگ روانہ کرنا۔ آدھ آنہ ایسی بڑی چیز نہیں۔ ڈاک کے لوگ بیرنگ خط کو ضروری سمجھ کر جلد پہنچاتے ہیں اور پوسٹ پیڈ پڑا رہتا ہے۔" (خط بہ نام تفتہ مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء)

جب ۱۸۵۴ء میں انگریزوں نے ظاہر ہے کہ سپردِ ڈاک کیے جانے والے خطوط کی تعداد میں اضافے کے پیشِ نظر اور بھی لاشخصی لیٹر بکس کو رواج دیا تو غالب کا ردِّ عمل برہمی اور شک و شبہہ کا تھا:

"یہ ڈاک کا سرشتہ کیسا بگڑا --- اب ڈاک گھر میں ایک صندوق منہ کھلا ہوا دھر دیا ہے، جو جائے خط کو اس

میں پھینکے اور چلا آئے ۔ نہ رسید نہ مہر، نہ مشاہدہ ۔ خدا جانے وہ خط روانہ ہوگا یا نہ ہوگا ۔ ۔ ۔ اگر خط نہ پہنچا تو بھیجنے والا کس دستاویز سے دعویٰ کرے گا ۔ مگر ہاں چار آنے دے کر رجسٹری کروائے ۔ ہم دوسرے تیسرے دن جابہ جا خط بھیجنے والے، روپیہ آٹھ آنے رجسٹری کو کہاں سے لائیں ۔ ۔ ۔ خط بھیجنا نہ ہوا ایک جھگڑا ہوا، ایک مصیبت ہوئی ۔ اندھیری کوٹھری کا تیر ہے ۔ لگا لگا نہ لگا نہ لگا ۔" (خط بہ نام منشی نبی بخش حقیر مورخہ ۳ / اکتوبر ۱۸۵۴ء)

نظم و ضبط کی صورتِ حال صریحاً بہتر ہوئی تھی ۔ پڑوسی گوجر قبائل کی لوٹ مار قابو میں لائی جا چکی تھی ۔ اسسٹنٹ رزیڈنٹ کو شہر کی پولیس کی ذمہ داری سونپ دی گئی تھی گو کہ کوتوال اور اس کے بارہ تھانے داروں کا مغلئی محکمہ برقرار رکھا گیا تھا اور جاروب کش اب بھی پولیس کے لیے مخبری کا سب سے اہم ذریعہ تھے ۔ ایملی بیلی اپنی آپ بیتی میں یاد کرتی ہیں کہ "ہم وہاں (یعنی دہلی میں) خود کو اتنا ہی محفوظ سمجھتے تھے جتنا کہ لندن میں ۔" محل کے باہر انگریزوں نے عدالتی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے اور جداگانہ دیوانی و فوجداری عدالتیں قائم کردی تھیں ۔ انگریزوں کے انتظامی اور عدالتی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینے کا لازمی اثر روایتی اداروں پر پڑا اور گو کہ ان میں سے بعض کو ان کی ظاہری شکل میں برقرار رکھا گیا ان کے حقیقی کردار اور فرائض کو بڑی حد تک یا تو کم کردیا گیا یا ان میں تغیر و تبدل لایا گیا ۔ ایک حالیہ مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ : "۱۸۵۰ء تک قوانین اور اخلاقی تصورات کا وہ نظام، جس کو سال ہا سال سے مثالی ہند اسلامی شہر کے نظام کی حیثیت حاصل تھی، بڑی حد تک ابتر ہو چکا تھا ۔ کوتوال کے اختیارات کو گھٹا کر اسے پولیس کے ایک 'ادنیٰ' عہدہ دار کی سطح تک پہنچا دیا گیا تھا ۔ قاضی کی حیثیت کم و بیش ایک سجے سنورے مسجل کی تھی ۔ عالمانہ اسلام کے مذہبی احساسات اب مفتی کی وساطت سے حکومت کے عہدہ داروں پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے ۔"

عدل گستری کے پرانے نظام کی شکست و ریخت خاص طور سے نمایاں تھی ۔ عدل

گستری کو دیہاتی پنچایتوں کے جانے بوجھے ماحول سے ہٹا دیا گیا تھا اور اسے مرافعے کے ایک آئینی شکل دیے ہوئے نظامِ مرافعہ کے ذریعے انفرادیت سے محروم کردیا گیا تھا جس کے نتیجے میں فریقِ مقدمہ کی مقامی شہرت، گذشتہ حالات اور چال چلن کو خاطر میں لانا ممکن نہیں تھا۔ حقیقت کے انکشاف سے زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہوگئی کہ اسے ثابت کیسے کیا جائے یا اسے رد کیسے کیا جائے۔ جیسے ہی یہ صورتِ حال اہلِ مقدمہ پر کھل گئی وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ ایسے گواہ بہ کثرت مل سکتے ہیں جو عدالت میں متین چہرہ بناکر کوئی بھی حلفیہ بیان دے سکتے ہیں بہ شرطے کہ انھیں اس کی اجرت ادا کردی جائے۔ مقدمہ بازی بالخصوص زمین کے جھگڑوں اور سودی قرض سے متعلق مقدمہ بازی اور ساتھ ہی ساتھ گواہوں کی دروغ بیانی مسلسل بڑھتی ہی گئی۔ فی الحقیقت اخلاق سے عاری گواہ اس زمانے کی ایک مخصوص سماجی شخصیت بن گیا، یہاں تک کہ با عزت لوگوں کے لیے عدالت میں شہادت دینا نازیبا سمجھا جانے لگا۔ غالب جن پر بقایا قرض کی عدم ادائگی پر کئی بار اور قمار بازی کے الزام میں ایک بار مقدمہ چل چکا تھا، اس صورتِ حال سے اچھی طرح واقف رہے ہوں گے۔ انگریزوں کے نظامِ عدالت کے اخراجات اور پیچیدگیوں کے پیشِ نظر فوج داری مقدمے شاذ و نادر ہی دائر کیے جاتے تھے، حتی الامکان ان کا مقامی سطح پر ہی روایتی دیہاتی پنچائتوں یا گاؤں کے سردار یا مکھیا کے بیچ بچاؤ کے ذریعے ہی تصفیہ کردیا جاتا تھا۔ تاہم عوام اور برطانوی نظامِ حکومت و قانون کے باہمی عمل کی ایک دل چسپ ضمنی پیداوار برطانوی اداروں اور قانونی ضوابط کے ناموں کا عربی اور فارسی میں شمول تھا۔ Staff of Council کے لیے اراکینِ کونسل، Stamp papers کے لیے کاغذاتِ اسٹامپ، Reidence office کے لیے دفترِ رزیڈنسی، Second Report کے لیے رپورٹ ثانی، Report on Law Suit کے لیے رپورٹ مقدمہ وغیرہ جیسی تراکیب الفاظ کا چلن عام ہوگیا۔ یہ پنشن کے مقدمے کے تعلق سے انگریز حکام کے ہاں پیش کی جانے والی غالب کی اپنی درخواستوں اور عرض داشتوں میں بھی بہ کثرت ملتی ہیں۔

ہندستان میں برطانوی انتظامیہ کا ایک بنیادی پہلو محاصل کی وصولی تھا۔ یہاں میری منشاء برطانوی نظامِ محاصل کو زیرِ بحث لانا نہیں ہے، سوائے اس ادعا کے کہ حیثیت

سے زیادہ محصول کی تشخیص اور مزید برآں وصولی میں سختی نے دہلی میں کسانوں کو بڑی حد تک کنگال کردیا۔ غالب کے فارسی اور اردو دیوان ہر دو میں مختلف اشعار میں مستعمل تشبیہوں اور استعاروں سے کسانوں پر ٹوٹنے والے مصائب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر غالب کو سروکار شہر سے تھا۔ شہر ہی ان کے لیے سماجی چوکھٹا اور ان کی شخصیت کے لیے نہایت مناسب ماحول فراہم کرتا تھا۔ ان کی تہذیبی تربیت "تنگ نظرانہ اور خودرایانہ طور پر شہری تھی، جس کی رو سے شہر کی حیثیت صحرا میں نخلستان کی تھی اور شہر کی دیواروں کی حیثیت چاروں طرف پھیلی ہوئی وحشت کے خلاف فصیلِ تہذیب کی۔" دہلی کے مادی خط و خال سے ایسے نقطۂ نظر کو تقویت ملتی تھی۔ خوش سلیقہ شائستگی اور بے ساختہ تہذیبی خوش اسلوبی کا، جن کا ماخذ آدابِ معاشرت کے عام طور سے مسلمہ قاعدے اور رواج تھا، دہلی کی فصیل کے اندر بول بالا تھا۔ فصیل کے باہر شہری تہذیب بیرونِ شہر کے ان گھڑ معاشرتی مزاج کے لیے اچانک اور کلیتہً راستہ صاف کر دیتی تھی۔ اجمیری دروازے کی لگر سے ہی ہرے بھرے کھیت شروع ہوجاتے تھے اور برج بھاشا اور کھڑی بولی اردو اور ہندستانی کی جگہ لے لیتی تھی۔ بشپ ہیبر آگرے سے دہلی کے قریب پہنچتے ہوئے شدید ویرانی کے احساس کا ذکر کرتے ہیں۔ "کھنڈر سچ مچ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے اور ہمارا راستہ برابر چکر کھاتا ہوا ان میں سے گزر رہا تھا۔۔۔ دہلی کی فصیل کے باہر کھنڈروں اور دھوپ میں جھلسی ہوئی چٹانوں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔" چارلس ٹرے ولیان، جو ۱۸۲۷ء میں مٹکاف کے تحت بہ حیثیت مددگار رزیڈنٹ برسرکار رہا تھا، کا قول بھی اس سے ملتا جلتا ہے: "دہلی کی آبادی اندرونِ فصیل ٹھنسی ہوئی ہے، فصیل کے باہر ویرانوں کے بے پایاں قطعات زمین پھیلے ہوئے ہیں۔۔۔" اس سیاسی صورت حال میں جس سے غالب کی زندگی کا پس منظر عبارت تھا نظم و ضبط کی حالت ایسی تھی کہ شہر سے ضرورت سے زیادہ دور جانے کی جراءت کرنا خطرے کو دعوت دینے کے مماثل تھا۔ بیتے دنوں کو یاد کرتے ہوئے منشی ذکاء اللہ لکھتے ہیں کہ "شہر کے دروازے ہر رات کو بند کردیے جاتے اور پھر ہر صبح کو کھولے جاتے۔۔ (لوگ) شاذ و نادر ہی باہر جاتے، سوائے اس کے کہ کسی ولی کے مقبرے کی زیارت کو جائیں اور یا پھر لمبی مسافت کے سفر پر۔" انگریزوں کے عہد

میں صورت حال میں بہتری آئی۔ فصیلِ شہر کے باہر، ابتداءً شہر کے شمال میں کشمیری دروازے کے باہر جہاں انگریزوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کی تھیں بہ طریقِ آزمائش بعض مضافاتی بستیاں بسائی گئیں۔ گرد و پیش کے مقامات کی سلامتی کو بھی استحکام ملا اور غالب فی الحقیقت کلکتے کے سفر پر بھی گئے۔ لیکن سفر کے حالات دشوار تھے اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس سفر کے تذکروں میں وہ صرف شہروں یعنی لکھنو ،بنارس اور کلکتے کو یاد کرتے ہیں۔

۱۸۵۷ء سے قبل انگریزوں نے بلدی نظم و نسق کو رواج دینے یا جدید مفہوم میں بلدی شعور کو دل نشین کرانے کی محض ابتدائی کوششیں کی تھیں۔ ۱۸۲۳ء میں گورنر جنرل ایم ہرسٹ نے "مقامی ترقیاتی کاموں" کے اخراجات پورے کرنے کے لیے شہری محاصل (Town duties) کی تحریک کی تھی لیکن جلد ہی انھیں موقوف کردیا گیا۔ سڑکوں کی مرمت کے لیے ایک "لوکل روڈس کمیٹی" قائم کی گئی لیکن مالی ذرائع کی کمی کی وجہ سے بے بال و پر رہی۔ ۱۸۵۷ء میں ہفتہ وار درباری اطلاع نامے "سراج الاخبار" کی ہنوز یہ تجویز تھی کہ کلکٹر کو اس مضمون کی عرض داشت پیش کی جائے کہ وصول شدہ محصول چنگی کا سات فی صد پکّی سڑکوں کی نگہ داشت اور مرمت پر خرچ کرنا چاہیے۔ اکثر مقامی جوش و خروش بلدی منصوبوں کی اعانت میں انگریزوں کی دل چسپی سے سبقت لے جاتا تھا، مثلاً ایک شفا خانے کی تعمیر کے معاملے میں جب کہ مقامی لوگوں کی طرف سے چندوں سے جمع کی ہوئی رقم انگریز حکام کی طرف سے فراہم کی ہوئی رقم کی تقریباً چوگنی تھی۔ مساجد کی وقتاً فوقتاً مرمت اور صفائی یا حد سے تجاوز کر کے سڑک پر آجانے والی دکانوں کا تعزیری انہدام انگریزوں کے بلدی امور سے تعلقِ خاطر کی دوسری مثالیں تھیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بڑے پیمانے پر بلدی سرگرمیوں کو آئینی شکل دینا ۱۸۵۷ء سے پہلے انگریزوں کے دیگر مقاصد کے مقابلے میں کوئی فوقیت نہیں رکھتا تھا اور اس سال کے بعد سے اس کی وجہ تحریک شہر کو برطانوی حکومت کے لیے "محفوظ" بنانا تھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اپنی تنگ دستی کے باوجود بہادرشاہ کی کوشش تھی کہ شہر میں اہم عمارتوں کی تعمیر اور ان کی نگہہ داشت و مرمت کے لیے شاہی پہل کی مغلیہ روایت کو جاری رکھا جائے۔ قدسیہ باغ کی مسجد کے ایک کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد کی مرمت بہادر شاہ نے ۳۴ - ۱۸۳۳ء میں کروائی۔ ۱۸۵۲ء میں

انھوں نے سنہری مسجد کی مرمت کروائی ۔ اس کے علاوہ انھوں نے اندرونِ قلعہ باغِ حیات بخش میں موتی محل، ہیرا محل اور ظفر منزل، اپنی بیوی زینت محل کے لیے اندرونِ شہر لال کنواں بازار میں ایک حویلی اور محل کے پاس ایک اور شاہ درہ کے پاس دوسرے باغ کا نقشہ بنوایا اور انھیں تعمیر کروایا ۔ بادی النظر میں معلوم پڑتا ہے کہ اپنی حکومت کے ابتدائی سالوں میں انگریزوں نے شاید غیر شعوری طور پر، اس مغلیہ روایت کی نقل کرنے کی کوشش کی ۔ منفرد افسروں نے حویلیاں اور دیہات میں کوٹھیاں بنوائیں اور بعض نے تو اپنے خرچے سے چاندنی چوک کی سڑک کے کنارے کنارے درخت بھی لگوائے ۔

بہ حیثیت ایک شہر کے دہلی سب سے بڑھ کر تسلسل کی علامت تھا ۔ شاہ جہاں کے تعمیر کردہ منصوبہ بند شہر کے اولین خط و خال قابلِ شناخت تو تھے لیکن اخذ و قبول کے فطری عمل کے نتیجے میں، جو کہ سبھی تاریخی شہروں کی ایک ناگزیر خصوصیت ہے، بڑی حد تک ڈھنک گئے تھے ۔ شاہ جہاں نے محل سے نکلنے والی دو اہم سڑکیں چاندنی چوک اور فیض بازار بنوائی تھیں جو زاویہء قائمہ پر متقاطع ہوتی ہیں ۔ اسی بادشاہ نے شہر کے گرد فصیل بھی بنوائی تھی (گو کہ بعد میں اسے خاصا مضبوط بنایا گیا) اور ضروریات کے لئے کافی آب رسانی کا اور پانی کے نکاس کا عمدہ انتظام کیا تھا ۔ آگے چل کر وقتاً فوقتاً کسی جامع منصوبے کے مطابق نہیں بلکہ شہر کی نشوونما اور ترقی کے ساتھ ساتھ حویلیاں، کٹرے، کوچے، محلّے، بازار، واڑے، چوک اور باغ معرض وجود مں آتے گئے ۔ مثال کے طور پر چاوڑی بازار اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کی بستیوں کی طرف اشارہ کرنے والا لاحقہ " واڑا " (بیدواڑا، نائی واڑا، دھوبی واڑا وغیرہ) مرہٹوں کی دین ہے، یعنی اس مختصر دور کی یادگار جب شہر پر ان کا تسلّط تھا ۔ مرہٹے تو چلے گئے لیکن شہر نے ان کا اثر ہمیشہ کے لیے قبول کرلیا، اسے ایک متنوع لیکن غیر منقطع تسلسل کا جزو لاینفک بنادیا ۔ غالب کی دلی میں بہتیرے جدید شہروں کے مصنوعی خط و خال مفقود تھے ۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے عظیم شاعر میر نے اپنے اشعار میں دہلی کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسے " عالم میں انتخاب " قرار دیا ہے ۔ شہر کا چپّہ چپّہ یادداشت یا روایات میں ابھی تک محفوظ افراد یا واقعات سے تعلق کی یاد دلاتا تھا : حبش خاں کا پھاٹک، بنگش کی سرائے، حویلی حیدر قلی، گلی قاسم جان، جرنیل بی بی کی

حویلی، بیگم کا باغ، کوچہ گھانسی رام، نمک حرام کی حویلی وغیرہ۔

غالب کے زمانے میں شہر کی آبادی اس سے قبل کی صدی میں بار بار کی غارت گری اور حملوں کی وجہ سے گھٹ گئی تھی۔ قابلِ اعتماد اعداد و شمار دست یاب نہیں ہیں لیکن ۱۸۰۰ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک مختلف تخمینوں کے مطابق آبادی ایک لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ کے درمیان تھی۔ انگریزوں کا ادعا تھا کہ ان کا تسلط قائم ہونے کے بعد سے دلی کی آبادی بڑھنے لگی۔ اگر یہ صحیح بھی ہو تو غالب کے دور میں سو سال قبل اورنگ زیب بادشاہ کے عہد کے مقابلے میں دہلی کی آبادی کم تھی۔ دہلی کی آبادی کا موازنہ لکھنو سے کرنا مفید ہوگا، جس کی آبادی ۱۸۵۰ء کے دہے میں انگریزوں کے حکم سے کی گئی مردم شماری کے مطابق ساڑھے تین لاکھ سے زیادہ یعنی دہلی سے دگنی تھی۔ چناں چہ بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے کہ اضافی مفہوم میں دہلی کا شمار نسبتاً بڑے شہروں میں نہیں تھا (کلکتہ، بمبئی اور مدراس لکھنو سے بھی بڑے تھے) اور غالب کے زمانے میں یہ غالباً دہلی کے لیے مخصوص شہر اور اس کے باشندوں کے درمیان زیادہ گہرے تعلق کے ماحول کی ایک وجہ تھی۔ اپنے شاگرد تفتہ کے نام ایک خط میں غالب وثوق سے کہتے ہیں کہ ہر چند کہ میں نے اپنی سکونت حال ہی میں تبدیل کی ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ مجھ تک پہنچنے کے لیے خط پر پتہ "اسداللہ، دہلی" کافی ہے۔

شہر کے اپنے مسائل تھے۔ علی مردان کی نہر جو شاہ جہاں کے عہد میں نکالی گئی تھی اور شہر میں آب رسانی کا اہم ترین ذریعہ تھی، سوکھ چکی تھی۔ چارلس مٹکاف نے اس کی مرمت کروائی اور اسے دوبارہ کھولا اور ۳۰ / مئی ۱۸۲۰ء کو، اسّی سال کے عرصے میں پہلی بار نہر کا پانی ایک بار پھر قل قل کرتا شہر کے درمیان اپنے راستے پر یعنی نجف گڑھ سے فتح پوری مسجد اور چاندنی چوک سے ہوتا ہوا لال قلعے کی طرف چل پڑا۔ شہر کے باشندوں نے نہر کے صاف شفاف پانی کا خیر مقدم پھولوں اور گھی سے کیا۔ ایک بار پھر شہر کے بہتیرے باغوں کی آب پاشی، فواروں کے اپنا کام کرنے اور لوگوں کو میٹھے پانی کی باقاعدہ فراہمی کا انتظام ہوگیا۔ لیکن یہ جشنِ شادمانی چند روزہ تھا۔ منبع کی طرف سے نہر کا پانی جا بہ جا آب پاشی کی غرض سے کسانوں نے اتنا نکالا کہ شہر میں اس کا بہاؤ کم ہوتا گیا۔ ٹھہرے پانی کی وجہ سے

نہر کی تہہ میں ریت اور مٹی جم گئی ۔ اس کے اور شاہ جہاں کے عہد کی نالیوں کی انگریزوں کی طرف سے مرمت کی بے ڈھنگی کوششوں کے سبب پانی کے نکاس کا انتظام درہم برہم ہوگیا، آبِ باراں کا بہہ نکلنا رک گیا ۔ نتیجتہً سارے شہر میں جگہ جگہ پانی کھڑا ہوجانے لگا ۔ اتنے بہت سارے ٹھہرے ہوئے پانی کی وجہ سے ملیریا بخار بری طرح پھیل گیا ۔ اور چوں کہ شہر کے کنوؤں پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی آب رسانی کا مسئلہ اپنی جگہ پر برقرار رہا ۔ جیسا کہ آج کل بھی ہوتا ہے، صورتِ حال موسمِ گرما میں زیادہ ہی نازک ہوجاتی اور تب پانی مشک میں بھر بھر کر جمنا سے لایا جاتا اور بازاروں میں بکتا ۔

بشپ ہیبر، جو سالِ نو ۱۸۲۵ء کی عین آمد کے وقت دہلی میں عارضی طور پر مقیم تھے، اپنے روز نامچے میں لکھتے ہیں : " یہاں کی (یعنی دہلی کی) بڑی سڑکیں فی الحقیقت چوڑی، خوش نما اور ایک ایشیائی شہر کی ہوتے ہوئے بھی اتنی صاف ستھری ہیں کہ تعجب ہوتا ہے ۔ ۔۔۔" ایمیلی بیلی بھی لکھتی ہیں " میں دہلی کی سڑکوں پر گاڑیوں میں سیر سے بہت لطف اندوز ہوتی تھی کیوں کہ ہر چیز نئی اور جاذبِ توجہ تھی، سنگ مرمر اور لال بھربھرے پتھر کی عمارتیں اتنی عالی شان تھیں، دکانیں اتنی انوکھی تھیں، کھڑکیوں پر اور سڑکوں کے آرپار ٹنگے ہوئے سوتی کپڑوں کے رنگ اتنے شوخ تھے، پوشاکیں اتنی دل کش تھیں اور بھیڑ اتنی زیادہ تھی ۔" لیکن ان بیانات کی بنا پر بہ حیثیتِ مجموعی شہر کی حالت کے بارے میں عمومی رائے قائم کرنا دانش مندی نہ ہوگی ۔ کم و بیش اسی زمانے میں شمالی ہند کے ایک اور تاریخی شہر لکھنؤ کی سیاحت کو آنے والا ایک اور یورپین یوں رائے زنی کرتا ہے : " تفصیل سے معائنہ کیا جائے تو منظر کی شوخی اس حد سے زیادہ گندگی اور غلاظت سے ماند پڑجاتی ہے جو اس کے نفیس ترین خط و خال کے پہلو بہ پہلو دکھائی دیتی ہے : بڑی سڑکوں سے نکلنے والی گلیوں میں کیچڑ ٹخنوں تک رہتا ہے ۔۔۔" مناسب تغیر تبدل کے ساتھ اس رائے کا اطلاق دہلی پر بھی ہوسکتا تھا ۔ منشی ذکاء اللہ عہدِ گذشتہ کی یاد تازہ کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں کہ " اندرونِ شہر معمولی سڑکیں اور گلیاں گڑھوں سے بھری ہوئی تھیں ۔ ہر برسات میں پابندی سے وہ کیچڑ کا ایک ڈھیر بن جاتیں اور لوگ ان کے کنارے کنارے دکانوں کے اگلے حصے کے پاس کیچڑ سے اوپر نکلے ہوئے پتھروں پر پیر رکھتے ہوئے راستہ طے کرتے ۔۔۔ خشک موسم میں گرد

بارش سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتی۔" کرنل سلی مین جو ۱۸۴۰ء کے دہے میں دہلی آئے تھے افسوس کرتے ہیں کہ "میرے خیال میں آج کل دنیا کے کسی بھی شہر میں دہلی سے زیادہ ان کی (یعنی مکھیوں کی) کثرت نہیں ہے۔۔۔" ۱۸۵۴ء میں شدید اور بار بار آنے والے بخار کی ایک وبا نے دہلی کو جھنجھور کر رکھ دیا۔ غالب لکھتے ہیں کہ تقریباً ہر کنبہ اس بخار میں مبتلا ہے اور کچھ اموات بھی ہوئی ہیں۔ پھوڑا پھنسی (دہلی کا دنبل) اور ملیریا بخار ہر طرف پھیلی ہوئی بیماریاں تھیں۔ عارف، غالب کی بیوی کے بھانجے، جن کو انھوں نے متبنّیٰ بنالیا تھا، ۱۸۵۲ء میں جوانی ہی میں انتقال کر گئے اور کچھ ہی دنوں بعد عارف کی بیوی کا بھی انتقال ہوگیا۔ بادی النظر میں ان دونوں کی موت کا سبب مرضِ دق تھا۔ دو سال بعد عارف کے بیٹے حسین علی کے بہ شمول غالب کے سبھی گھر والے شدت سے بیمار پڑے۔ غالب نے اپنی بیوی کی علاماتِ مرض جو بیان کی ہیں (ہر روز دوپہر میں لرزے کے ساتھ بخار) بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے کہ بیماری ملیریا کی اور بہ ظاہر وبائی قسم کے ملیریا کی تھی۔ خود غالب دہلی کے دنبلوں میں مبتلا تھے۔ اپنے آخری ایام میں اس مرض کی وجہ سے وہ بڑی حد تک معذور ہوجائیں گے لیکن ۱۸۵۷ء میں وہ اس کا ذکر بے فکری کے ساتھ کرسکتے تھے۔ وہ فقرہ چست کرتے ہیں کہ پاؤں کے دو پھوڑوں سے انھیں ظفر شاہ کے ساتھ سالانہ پھول والوں کی سیر کے موقع پر قطب کو نہ جانے کا عذرِ لنگ مل گیا ہے۔

شہر کے اپنے حکیم تھے، جو یونانی دبستانِ طب کے پیرو تھے۔ مشہور ترین اطبا چاندنی چوک سے لگے ہوئے کوچہ بلّی ماراں میں سکونت پذیر تھے، جہاں خود غالب حکیم محمد خاں کے کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ ایسا معلوم پڑتا ہے کہ ایک عرصے تک امام الدین خاں غالب کے پسندیدہ حکیم تھے۔ لیکن بعد میں انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے معالج اور شاہی دربار کے اہم عہدہ دار حکیم احسن اللہ خاں سے طبّی (اور غیر طبّی) مشورہ کرنا شروع کیا۔ مسہل کا استعمال، غذا کی پابندیاں اور گھریلو دوا درمن تمام امراض کا مقبولِ عام علاج تھے۔ غالب اس شعبے میں کافی باخبر تھے۔ انھوں نے مختلف طبّی رسالوں کا بہ غور مطالعہ کیا تھا اور اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے وہ بے تامّل دوا تجویز کرتے، انھیں بکری کی چھاچھ، نیم کی پتیوں کا رس یا بیسنی روٹی آزما کر دیکھنے کی تاکید کرتے اور جب دیکھتے

کہ وہ نسخے پر ٹھیک سے عمل پیرا نہیں ہیں تو ٹوکنے سے بھی نہیں چوکتے۔

انگریزوں کے لئے علاجِ معالجے کی سہولتیں بالکل غیر تشفی بخش تھیں۔ انگریزی دوا فروشوں کا فقدان تھا۔ انگلستان سے فراہم کی ہوئی دوائیں، جن کی دست یابی کا کوئی بھروسہ بھی نہیں تھا، انگریز حکام کی طرف سے فوجی افسروں اور غیر فوجی محکموں کے ملازمین کو مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔ سنائے مکّی (ایک مشہور مسہل دوا) کی ایک خوراک کے سیاہ بوتل بین اور ایک ان گھڑ لکڑی کے بکس میں دوا کی گولیوں کی وصول یابی پر ایمیلی بیلی حیرت اور ناراضگی کا اظہار کرتی ہیں۔ وہ یہ بھی شکایت کرتی ہیں کہ انگریز سیول سرجن ڈاکٹر راس درد اور ٹیس کا علاج جونک سے خون چسوا کر کرنا پسند کرتے تھے۔ انگریزوں کے لیے گرمی سب سے بڑی دشمن تھی۔ گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ کی باتونی بہن ایمیلی ایڈن ۱۸۳۵ء میں ہندستان پہنچنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد لکھتی ہیں: "اتنی زیادہ **گرمی** ہے، سمجھ میں نہیں آتا اس کی املا کے لیے کتنے بڑے حروف استعمال کروں۔" اس سے بچاؤ کا روایتی ذریعہ پنکھے تھے۔ خس کی ٹٹیاں بھی لازمی ہوتی تھیں۔ انھیں دروازوں اور کھڑکیوں کے چوکھٹوں پر ٹانگ دیا جاتا تھا اور انھیں ایک مزدور، ان پر دن بھر پانی چھڑکتے ہوئے، ہمیشہ نم رکھتا تھا۔ جب ہوا بھیگی گھاس سے گزرتی تو اس سے کمرے کا اندرونی حصہ ٹھنڈا بھی ہوجاتا اور معطر بھی۔ لیکن انگریزوں کی مخصوص ایجاد جسے آج کل سارے ہندستان کے شہروں میں مستعمل کولروں کا ابتدائی نمونہ سمجھنا چاہیے، Thermantidotes (گرمی توڑ) تھے۔ ان میں بھی خس کی ٹٹیاں استعمال ہوتی تھیں، فرق یہ تھا کہ انھیں ایک لکڑی کے بکس جیسے چوکھٹے میں نصب کردیا جاتا تھا، جس میں ایک چرخی سے جڑے ہوئے لمبے دستے کو طاقت سے گھماتے ہوئے ہوا کی رو پیدا کی جاتی تھی اور یہ کام بھی دن دن بھر وہی تکلیف جھیلنے کا عادی مزدور کیا کرتا تھا۔ خس کی ٹٹیاں زیادہ خوش حال ہندستانی بھی استعمال کرتے تھے۔ گرمی سے بچاؤ کا روایتی ذریعہ اکثر گھروں میں عموماً پائے جانے والے تہ خانے تھے اور موٹی دیواروں والی ایسی کوٹھریاں جن پر دھوپ بہ راہِ راست نہیں پڑتی تھی۔ غالب خود موسم گرما کے طویل دن اپنے گھر میں ایسی ہی، دھوپ سے محفوظ ایک کوٹھری میں گوشہ نشینی میں گزارتے تھے۔

نہ صرف انگریزوں بلکہ ہندستانی امراء کے ہاں بھی برف کی بڑی مانگ تھی۔ اسے

جاڑے کے مہینوں میں بڑی محنت سے تیار کیا جاتا تھا اور پھر اسے گرمیوں میں استعمال کے لیے بہ حفاظت ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ دسمبر اور جنوری کی کڑاکے کی سردی والی راتوں میں پیشہ ور برف بنانے والوں کی برادری ترکمان دروازے اور دلّی دروازے کے بیچ میں مصروفِ کار رہتی : اتھلے مٹی کے ظروف میں پانی بھر کر انھیں باہر برفیلے آسمان کے نیچے رکھ دیا جاتا۔ صبح تک برف کی ایک پتلی تہہ جم جاتی جسے کوٹ کر اکٹھا کرلیا جاتا اور زیرِ زمین کافی گہرائی میں برف کے کھتّوں میں ذخیرہ کیا جاتا، جنھیں پھر گرمیوں کے آغاز ہی میں کھولاجاتا۔ اسے محفوظ رکھنے کی تمام کوششوں کے باوجود برف کی اچھی خاصی مقدار موسمِ گرما میں پگھل ہی جاتی اور جو بچ جاتی وہ ناکافی بھی ہوتی اور مہنگی بھی۔ ایک رباعی میں غالب اپنے مخصوص مضحکانہ انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہیں :

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

جاگیردار اشرافیہ کے متموّل اراکین کے پاس شہر میں بڑی جائدادیں تھیں۔ ایسے دو امرا کا ذکر کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں : " ان لوگوں کے کئی مکانات محل اور ایوان ہیں باہم متصل۔ اتنے وسیع کہ اگر ان محلات و ایوانات کی زمین کی پیمائش کی جائے تو شہر نہ سہی، ایک گاؤں کے برابر تو رقبہ ہوگا۔" اس طبقۂ امرا کے اہم اراکین جھجّر، بہادر گڑھ، لوہارو، دجانہ اور پٹودی کے نوابین اور راجہ بلّب گڑھ تھے، یہ سب دہلی ایجنسی کے تحت جاگیروں کے حکم راں تھے۔ ان کے اور دوسروں کے تعمیر کیے ہوئے رہائشی محل یا حویلیاں اکثر ان کے اپنے محلّوں کے معرضِ وجود میں آنے کا مرکز بن جاتیں۔ لیکن جہاں ایک متموّل جاگیردار ہوتا وہیں بیسیوں تنگ دستی کے شکار وہ رئیس زادے بھی ہوتے جن کو روبہ زوال جاگیرداری نظام کی بگڑتی ہوئی حالت نے مصیبت جھیلنے کے لیے یکہ وتنہا چھوڑ دیا تھا، جنھیں اپنی عالی خاندانی کا احساس تھا لیکن جن کے پاس اپنے اس اونچے رتبے کے شایانِ شان زندگی بسر کرنے کے وسائل نہیں رہ گئے تھے۔ غالب لکھتے ہیں : " غالب دو ہیں، ایک ترک سلجوقی جو بادشاہوں سے میل جول رکھتا ہے، دوسرا مفلس، مقروض اور درماندگی کا شکار ہے۔" دہلی کے باشندوں نے جیب خالی ہونے کے باوجود امیرانہ پُر تکلف طور طریقے نہ

چھوڑنے والے بانکوں کی توصیف کے لیے کسی کا لحاظ نہ کرنے والے اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں تک بندی کی تھی:

دلّی کے بانکے جن کی جوتی میں سو سو ٹانکے

ایسے بھی تھے جو اچانک مال دار ہوگئے لیکن اس وقت کے سماجی و معاشی ماحول میں اتنی ہی تیزی سے اپنی ساری دولت کھو بھی بیٹھے ۔ غالب لکھتے ہیں:

"یہاں دلی میں ایک اصطلاح نئے نواب کی ہے اور یہ لفظ عام ہے ، ہندو ہو یا مسلمان ، اس پر صادق آجاتا ہے ۔ صورت یہ کہ جہاں کوئی شخص مرا ، بہ شرط آں کہ دولت مند ہو ، اس کا بیٹا مال پر متصرف ہوا ۔ بدمعاش لوگ فراہم ہوئے اور اس کو خدا وندِ نعمت اور جنابِ عالی کہنا شروع کیا : فلاں رنڈی آپ پر مرتی ہے ۔ فلانا امیر اپنی مجلس میں آپ کی یوں تعریف کررہا تھا ۔ آپ کو لازم ہے اس رنڈی کا بلانا اور اس امیر کی دعوت کرنی ، دنیا اسی واسطے ہے ۔ روپیہ ساتھ ساتھ نہیں جاتا ۔ آپ کے باوا کیا لے گئے جو آپ لے جائیں گے ۔ غرض کہ بندہ آج تک تین نئے نواب دیکھ چکا ہے ۔ ایک تو کھتری ٹوڈرمل لاکھ روپے کا آدمی تھا ۔ پان سات برس میں سب کچھ کھوکر شہر سے نکل گیا اور مفقود الخبر ہوگیا ۔ دوسرا ایک پنجابی لڑکا سعادت نام ۔ پچاس چالیس ہزار روپیہ کھوکر تباہ ہوگیا ۔ تیسرا خان محمد نام ، سعداللہ کا بیٹا ، کہ وہ بھی بیس پچیس ہزار روپیہ لٹا کر اور بگھیوں پر چڑھ کر اب جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے ۔"

شہر کے بیوپاری ، بیش تر جین اور کھتری ، اناج اور اشیائے خوردنی کی خردہ فروشی کرتے تھے اور ساہوکاری میں مشغول تھے ، دوسرے الفاظ میں بھاری شرحِ سود پر روپیہ قرض دیتے تھے ۔ "شہری جائداد کی ساہوکاروں کے ہاتھوں میں منتقلی ۔۔۔ شہروں میں بھی اتنی ہی نمایاں تھی جتنی دیہات کے علاقے میں ۔۔۔ دہلی کے چاندنی چوک کے علاقے میں مسلمانوں کی بہت سی جائداد ۱۸۵۷ء سے قبل ہی بیوپاری گھرانوں کے ہاں رہن تھی ۔" خود غالب ساری عمر ساہوکاروں کے بری طرح سے مقروض رہے ۔

تجارت کا ایک اہم شعبہ روایتی مصنوعاتِ دست کاری مثلاً جڑاؤ زیورات، شالوں، پیتل کے برتنوں، زرتار لیس اور جوتوں کا بنانا اور ان کی خردہ فروشی تھی۔ مغلیہ دربار میں تعینات برطانوی ایجنٹ ایلیٹ بشپ ہیبر کو خاص طور پر ایک دولت مند تاجر کے گھر شال کا کارخانہ دکھانے کے لیے لے گیا۔ بشپ کو شالیں مہنگی بھی لگیں اور کچھ زیادہ خوب صورت بھی نہیں دکھائی دیں لیکن وہ دولت مند تاجر کے گھر سے کافی متاثر ہوئے۔ " یہ مکان خود بہت خوب صورت اور مشرقی فنِّ تعمیر اکمنہ کے ایک نمونے کی حیثیت سے قابلِ دید ہے، یہ غلام گردشوں سے گھری تین انگنائیوں پر مشتمل ہے، جن میں سے دو میں پھول دار جھاڑیاں اور سنترے کے پیڑ لگائے گئے ہیں اور تیسری کو ایک خوب صورت سنگِ مرمر کے فوارے سے آراستہ کیا گیا ہے۔" ہیبر نے جو مکان دیکھا وہ اس زمانے کے عام رواج کی منزل یا حویلی تھی، ایسے طرزِ تعمیر کا مکان جس کے ڈھانچے کا رخ اندر کی سمت رہتا تھا۔ سڑک کی طرف بغیر کھڑکیوں کی لق و دق دیوار، جس کے اندر ایک یا ایک سے زائد آنگنوں کے اطراف تعمیر کیے ہوئے کمرے اور (کبھی کبھی) جیسا کہ اس تاجر کے مکان میں بشپ ہیبر نے دیکھا، فواروں کے ساتھ ایک باغ۔ بلی ماراں اور گلی قاسم جان کے نکڑ پر واقع غالب کے گھر کی تعمیر بھی اسی نمونے کی تھی: گلی کی طرف عمارت کا اونچا بغیر کھڑکیوں کا خشتی رخ، اوپر تین طرف، کھلے آنگن کا احاطہ کیے ہوئے، محراب دار غلام گردشیں۔ اس نوعیت کی تعمیر کی اولین وجہ خلوت کے اہتمام کی ضرورت تھی (بالخصوص زنانے کے لیے) اور یہ اس بنگلے والی طرزِ تعمیر کے بالکل برخلاف تھی جسے بعد میں انگریزوں نے رواج دیا اور جو آج کل بھی رائج ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شہر کے نظامِ تجارت کا سب سے زیادہ باوقار مرکز چاندنی چوک تھا۔ یورپیوں کو غلط فہمی تھی کہ اس نام کا مفہوم چاندی کا کام کرنے والوں کا چوک ہے۔ دراصل یہاں پرکھنے والے پھل، کپڑے، حقے، ہتھیار، چڑیاں اور جانور اور ہر قسم کی بیش قیمت دست کاری کی اشیا خرید سکتے تھے۔ ایک ہم عصر نے لکھا ہے کہ یہاں صرف جڑاؤ زیور بیچنے والے اور چاندی کا کام کرنے والے آباد ہیں۔ اس تاثر کی وجہ غالباً یہ امر واقعہ تھا کہ یہاں جوہریوں اور جڑاؤ زیور بیچنے والوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ " بلاشبہ وہ

اپنی مصنوعات کی عام نمائش کبھی نہیں کرتے تھے۔ تمام قیمتی اشیاء گھروں کے اندرونی کمروں میں رکھی جاتی تھیں۔ سامنے کا کمرہ، بغیر دروازوں کا، سڑک پر کھلتا تھا، یہاں سفید کپڑے کا فرش رہتا تھا جس پر چند سادہ اوزار اور اپنے دھات کے کام کے لیے ایک جلتی ہوئی چھوٹی سی کٹھالی پاس میں رکھتے، دو ایک کاری گر بیٹھے اپنے کام میں مشغول رہتے۔ اگر کوئی یورپین دکان پر رکتا تو وہ باالعموم سڑک سے چند فیٹ اونچے دکان کے فرش کے کنارے پر بیٹھتا اور مطلوبہ اشیا کے لیے سودا چکاتا۔" لیکن آخر الامر چاندنی چوک کی حیثیت صرف شہر کی سب سے اہم تجارتی سڑک کی نہیں اس سے کچھ بڑھ کر تھی۔ شہر سے محل کو جانے والی اہم ترین سایہ دار کشادہ سڑک کی حیثیت سے اس کے محلِ وقوع اور شہر کے ارتقا میں اس کی تاریخی افضلیت کی وجہ سے اس کو مرکزی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ جیسے سورج سے شعاعیں نکلتی ہیں شہر کے سبھی اہم کوچے اور گلیاں اسی سے نکلتی تھیں اور امیر و غریب، بیوپاری اور امیرزادے، دانش ور اور اہلِ حرفہ، اہلِ علم اور شعرا اپنے اپنے مسائلِ حاضرہ پر گفتگو کے لیے اس کی نہر کی اسی سنگ بستہ رہ گذر کے کنارے اکٹھے ہوتے جس پر شروع سے آخر تک درخت سایہ فگن تھے۔ جیسا کہ منشی ذکاء اللہ نے سی۔ ایف۔ اینڈریوز سے کہا " آپ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ پرانے وقتوں میں چاندنی چوک کتنا شاندار دکھائی دیتا تھا۔ یہ شہر کا مرکز تھا۔۔۔"

شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد کم و بیش برابر تھی۔ ان دو مذاہب کے مابین کائستھ ایک رابطے کا کام دیتے تھے (غالب کے شاگردِ خاص ہرگوپال تفتہ کائستھ تھے)۔ کھتریوں کا شمار باہر سے آکر شہر میں نسبتاً حال میں بس جانے والوں میں تھا۔ یہ پنجاب سے آئے تھے۔ شہر کے غربا سبھی فرقوں کے تھے اور اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ وہ مٹی کے تنگ و تاریک گھروں میں رہتے تھے جو اکثر بارش یا سیلاب سے بہہ جاتے۔ غالب ۱۸۵۵ء میں لکھتے ہیں کہ شہر میں بہت سارے گھر بارش کی وجہ سے ڈہ گئے۔ ان کا اپنا گھر برسات میں بالکل چھلنی ہوگیا تھا اور ایک خط میں وہ فقرہ چست کرتے ہیں کہ اگر بارش دو گھنٹے ہوتی ہے تو میرے گھر کی چھت چار گھنٹے ٹپکتی ہے۔ جھونپڑ پٹیاں بیش تر شہر کی بیرونی حد کے پاس، موری دروازے، فراش خانے، اجمیری دروازے، ترکمان دروازے اور دہلی دروازے کے

علاقے میں تھیں۔ یہاں کمہار، قصائی، چمار، رنگ ریز، متفرق دست کار، اہلِ حرفہ، نو آباد دیہاتی اور بے روزگار رہتے تھے۔ معاشی انحطاط اور افلاس جنازے کی چادر کی طرح سارے شہر پر چھایا ہوا تھا۔ خود محل میں یہ اتنا نمایاں تھا کہ اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ ایک غیر ملکی مہمان یاد کرتا ہے کہ جب وہ بادشاہ سے اپنے تعارف کی غرض سے گیا تو کیسے "خستہ حال بھکاریوں کے ایک اوز ہجوم" نے اسے دق کیا۔ محل کے "سلاطین" یعنی خانوادہ ء شاہی کے دور کے رشتہ دار اور دست نگر سراسر افلاس کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک انگریز عہدہ دار لکھتا ہے: "سلاطین کی جائے سکونت اتنی اونچی لق و دق دیوار کی آڑ میں ہے کہ اس کا منظر آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس کی حد کے اندر بہت سارے چٹائی کے جھونپڑے ہیں جن میں یہ بدنصیب رہتے ہیں۔ جب دروازہ کھولا گیا تو شکستہ حال، نیم برہنہ اور فاقہ زدہ اشخاص کے ایک ہجوم نے نکل کر ہمیں گھیر لیا۔" سلی مین تمسخر آمیز انداز میں یہ بھی لکھتا ہے کہ "خانوادہ ء تیموریہ کے سلاطین اور شاہ بیگمات بیسیوں کی تعداد میں حشرات الارض کے جھنڈ کی طرح پڑے ملیں گے، جن کے پاس نہ پیٹ بھرنے کو کھانا ہے اور نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔"

تاہم گزر بسر کے اخراجات، زمانہ ء موجودہ کے مقابلے میں ناقابلِ یقین حد تک کم تھے۔ ایک روپیہ چالیس سیر گیہوں یا چار سیر گھی خریدنے کے لیے کافی تھا۔ ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں غالب شکایت کرتے ہیں کہ گیہوں، بیسن اور چنا دہلی میں روپے میں چالیس پینتالیس پونڈ بک رہا ہے۔ انگریزوں کی نظر میں غربت کا معیار ایک کنبے کی تین روپے سے کم ماہانہ خالص آمدنی تھی۔ چناں چہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ماہانہ باسٹھ روپے آٹھ آنے کی کم و بیش بندھی ہوئی آمدنی میں غالب چار نوکر رکھنے اور ان کا خرچ اٹھانے کا مقدور رکھتے تھے۔ دور از قیاس ہے کہ قحط کے سالوں کو چھوڑ کر حد درجہ مفلس افراد بھی فاقہ کشی کی حد تک پہنچتے رہے ہوں۔

شہر کی گنگا جمنی چہل پہل کا تواتر اپنی رو میں سبھی گروہوں کو بہا لے جاتا تھا، اپنی محرومیوں کے باوجود غربا اس کے دل بہلاووں اور تفریحوں میں بہ ہر حال سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ یہی وہ ناقابلِ تعین دل فریبی تھی جس نے غالباً میر تقی میر کو افسوس کرنے پر مجبور کیا کہ: "جہان آباد کے کھنڈر لکھنؤ سے دس گنا بہتر تھے۔ کاش کہ میں وہیں رہتا، پریشاں

حالی کی زندگی گزارنے یہاں نہ آتا۔" شاید ہی کسی بھی شہر کی سیر کے لیے آنے والے کی توجہ، بالخصوص برسات کے موسم میں، آسمان میں جا بہ جا اڑنے والے پتنگوں کی طرف مبذول نہ ہوتی۔ مہابت خاں کی ریتی یعنی دہلی دروازے کے پاس جمنا کا ریتیلا ڈھلوان کنارہ پتنگ بازوں کا اکھاڑا تھا اور کہا جاتا ہے کہ یہاں پتنگ بازی کے مقابلے منعقد ہوتے، جن میں لکھنو تک سے ٹیمیں شریک ہوتیں۔ نیم شکایتی انداز میں غالب لکھتے ہیں کہ بادشاہ کے اصرار پر وہ (لال قلعے کی شمالی حد) سلیم گڑھ پر پتنگ بازی کے لیے ان کے ساتھ شامل ہوئے (یہ بہ ظاہر روزانہ شام کا مشغلہ تھا)۔ ایک اور مقبولِ عام مشغلہ کبوتر بازی کا تھا۔ دہلی کی سڑکوں سے گزرنے والے بہادر شاہ کے سرکاری جلوس میں ایک شاہی کبوتر خانہ بردار ہاتھی ہمیشہ شامل رہتا تھا۔ تیتر، بٹیر اور مرغ لڑانا بھی روز کا دل بہلاوا تھا۔ امرا اور قلعے کے شہ زادوں کا کندھوں پر اپنے پسندیدہ تیتروں اور بٹیروں کو بٹھائے آتے جاتے دکھائی دینا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سال میں ایک بار تیراکی کا میلہ لگتا جس موقع پر تقریباً سارا شہر جمنا کنارے اکٹھا ہوجاتا۔ دل چسپی رکھنے والے گروہوں کی طرف سے شہر میں کئی اکھاڑوں کا انتظام تھا۔ شطرنج، سٹّہ اور گنجفہ بھی مقبول عام مشغلے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر داستان گویوں کو سننے کے لیے ہمیشہ بڑا اژدہام رہتا تھا۔ چاندنی چوک ایک پسندیدہ ملاقات کی جگہ تھی جہاں لوگ تقریباً بغیر کسی خاص مقصد کے، بس یوں ہی ایک دوسرے سے ملاقات اور باتیں کرنے اور دنیا بھر کے لوگوں کو راستہ چلتے دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوتے تھے۔ شام میں کئی جاذبِ توجہ تفریحیں تھیں: جمنا پر کشتیوں کے پل پر چہل قدمی، اردو بازار میں مل بیٹھنا، جہاں مطالعے کے شائق پڑھ سکتے تھے اور دوسروں کے لیے کھانے کا معقول انتظام رہتا تھا، یا پھر (خانم کے بازار اور خاص بازار کے درمیان کھلی جگہ میں واقع) گدڑی بازار کو دو ایک کباب چکھنے کے لیے اور کبابیوں کی دل فریب باتوں اور تشویق دلانے والی اپیچ سے محظوظ ہونے کے لیے جانا۔ بنت عنب کی طرف رجحان رکھنے والوں کے لیے شراب خانے تھے جو بہ ظاہر تقریباً ساری رات کھلے رہتے تھے۔ دیسی ٹھرّے کے علاوہ غیر ملکی تیز خوش بودار شراب (بیش تر فرانسیسی شرابِ انگور اور شیم پین)، جس کی خردہ فروشی زیادہ تر انگریز تاجر کرتے تھے، بہ آسانی اور ارزاں دست یاب تھی۔ غالب کا، جو روز شام میں پیتے تھے،

ادعا تھا کہ ان کی عادت صرف فرانسیسی شرابِ انگور پینے کی تھی۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ شراب، مے کدہ، ساقی اور واعظ کی ظاہرداری و ریاکاری شعری اشاریت کے بار بار دہرائے جانے والے موضوعات ہیں۔ صرف ۱۸۵۷ء کے بعد ہنگامی سیاسی حالات کے پیشِ نظر انگریزوں نے شراب کی کشید پر پابندیاں عائد کیں اور ساتھ ہی ساتھ غیر ملکی شراب کی قیمت (عارضی طور پر) اس قدر زیادہ ہوگئی کہ اس کا خریدنا ناممکن ہوگیا۔ برسات میں پھول والوں کی سیر تھی اور جاڑوں میں سارا کنبہ فوارے دیکھنے اور بڑھ بڑھ کر بیچنے والوں سے چنا جور گرم اور پکوڑے خریدنے کے لیے شہر کے بہتیرے باغوں کی تفریح کو جاسکتا تھا۔ بھانڈ، بہروپیے یعنی نہایت تیزی سے بھیس بدلنے والے اداکار جو حیرت ناک سرعت کے ساتھ باری باری سے مختلف رول ادا کرسکتے تھے، بھگت باز یعنی مذہبی رزمیوں کے مختلف کرداروں کا رول ادا کرنے والے، کٹھ پتلی باز یعنی کٹھ پتلی کا تماشہ دکھانے والے، نٹ اور مداری سب کے لیے بہ آسانی دست یاب تفریح کا موقع فراہم کرتے تھے۔ ان فن کاروں کو انتہائی فروغ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں حاصل ہوا جب شاہی سرپرستی کی بہ دولت ان کی روایتی ہنرمندیوں کی ترقی کو تحریک ملی۔ لیکن بہادر شاہ ظفر کے عہد میں روزی کمانے کے لیے وہ پہلے سے کہیں زیادہ اپنے کھیل تماشے عوام کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ متعدد موقعوں پر شہر سے گزرنے والے شاہی جلوس عوام کے لیے خاص دل کشی رکھتے تھے۔ اب یہ شاہ جہاں کے زمانے کے دولت اور طاقت کے پُر شوکت مظاہرے نہیں رہے تھے۔ " آگے اور پیچھے محافظ پیادہ سپاہیوں کا بے قاعدہ ہجوم ہوتا تھا۔ نفیری نواز نفیری بجاتے اور خوش خواں بادشاہ کی شان میں قصیدے سناتے۔" لیکن تماشا آنکھوں کو اچھا لگتا تھا اور بڑے تکلف سے آراستہ کیے ہوئے ہاتھیوں کی لمبی قطار لازمی طور سے تماشائیوں کا دل موہ لیتی اور وہ بے ساختہ بہ آواز اظہارِ مسرت کرتے۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز لکھتے ہیں کہ:

" پرانی دہلی کے ان تذکروں میں سرکاری تقریبوں کے سلسلے میں منظم کیے ہوئے ان ہاتھیوں کے جلوسوں کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ جنھوں نے یہ کہانی مجھے سنائی وہ اس پرانے زمانے میں خود کم سن بچے تھے اور بہ ظاہر منظر کی رنگینی نے ان کے نوخیز تخیل پر گہرا نقش چھوڑا۔" جمعہ کے دن جیسا کہ اب بھی ہوتا ہے، جامع مسجد میں مسلمان حسبِ معمول نماز

کے لیے اکٹھا ہوتے ۔ ایک انگریز ہم عصر خاتون جس نے ایک دفعہ یہ منظر دیکھا ، تعجب کا اظہار کرتی ہے کہ بعد میں نمازیوں کو ان کے جوتے کیسے مل جاتے ہیں ۔ " کیوں کہ جوتے پہلو بہ پہلو اوپر سے نیچے تک (جامع مسجد) کی سبھی سیڑھیوں پر رکھے ہوئے تھے اور سبھی تقریباً ایک ہی نمونے کے تھے ۔" ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ہاں شادیوں کو ایک طول طویل جشن کی تقریب سمجھا جاتا تھا اور یوں تو ان کی بہ دولت شہر کی زندگی میں رنگینی بڑھ جاتی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ قرض داری کا ایک عام سبب بھی تھیں ۔ روز مرہ کی زندگی مذہبی رسوم کی ادائگی اور شگونوں کی پابندی کے حد سے زیادہ بوجھ سے لدی ہوئی تھی ۔ کہتے تھے کہ دہلی میں تیوہار سال کے دنوں سے بھی زیادہ تھے ۔ " انتہائی عدم تحفظ اور معاشی انحطاط کا ایک اہم نتیجہ زندگی پر گرفت کا بالکل ڈھیلا پڑجانا تھا ، جس کا اظہار جادو ٹونے اور فوق الفطرت باتوں پر عام اعتقاد سے ہوتا تھا ۔" جوتشیوں کی بہت مانگ تھی اور عطائیوں کی بہتات تھی ۔ ذات پات کا نظام مسلّمہ طرزِ زندگی تھا اور بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کے شعور کو بھی متاثر کیا تھا ۔ " (ہندوؤں اور مسلمانوں ، دونوں کے) شادی بیاہ ، دوسرے سماجی رسوم و رواج اور دستور کا جھکاؤ یکسانیت کی طرف تھا یا کم از کم اپنی اچھی اور بری دونوں طرح کی خصوصیات میں وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے تھے ۔ ذات پات کے نظام کے بعض عناصر ، مثلاً بعض کھانے کی چیزوں کی ممانعت ، چھوا چھات یا ناپاکی کا تصور اور شادی بیاہ سے متعلق بندشیں دونوں کے لیے مشترک ہوگئی تھیں ۔ نواب شمس الدین نے پھندے کو ٹھیک کروانے کے لیے پورے سکونِ قلب کے ساتھ اپنی گردن پیش کردی لیکن اس وقت کراہت کے احساس کے ساتھ چونک کر پیچھے ہٹے جب انھوں نے دیکھا کہ پھانسی دینے والے ذات کے بھنگی ہیں ۔ بے جڑا پن اور اجنبیت ، معاشرے کی ریزہ ریزہ تقسیم اور علاحدگیت ، جو آج کل ہمارے شہروں کی عام بیماری ہے ، بڑی حد تک مفقود تھی ۔ راجستھان کے تباہ حال کسانوں جیسے نسبتاً حال میں ترک وطن کر کے دلی میں آباد ہوجانے والے بھی جلد ہی " جِجمانی نظام " میں اپنی جگہ بنالیتے ۔ ہر شخص کو کسی سے جڑے رہنے کا ، کسی عظیم تر اکائی مثلاً کسی فرقے ، ذات ، محلّے یا پیشے کا ایک حصہ ہونے کا احساس ضرور رہتا ۔ بالآخر وہ اس شہر سے جڑا ہوا ، باالفاظِ دیگر دلی والا ہوتا ، " وہ لکیر کا فقیر جس سے

بعض ایسی خصوصیات منسوب کی گئی ہیں مثلاً طرزِ نو سے اس کی نفرت، دوسرے کی رائے کا لحاظ کرنے سے گریز اور اپنے محدود دائرے کے باہر کے مسائل سے دل چسپی کا فقدان" جو اس کے اور دوسروں کے درمیان ما بہ الامتیاز بھی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ بعض اوقات رنگ ڈھنگ اور وضع قطع کی ایسی یکسانیت کو بھی فروغ دیتی تھیں جو اسی معاشرے کے انفرادیت پسند افراد کو ناگوار گزرتی تھیں۔ غالب شکایت کرتے ہیں کہ: "۔۔۔ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑہ، منھ پر ڈاڑھی سر پر بال، فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔" (خط بہ نام مرزا حاتم علی بیگ مہر۔ اواخر اپریل ۱۸۵۹ء)۔ غالب کی جھلاہٹ کے باوجود ایسی یک رنگی مادی سے زیادہ غالباً کوئی اور ہی گرفت میں نہ آنے والی اور ناقابلِ فہم شے تھی۔ بہ ہرحال یہ سماجی پس منظر اور رتبے کے آئینہ دار لباس کے فرق کو مٹاتی نہیں تھی۔ عوام کھادی کے کپڑے پہنتے تھے، اون قیمتی تھا اور اس کا رواج کم تھا، اس کی بہ جائے روئی بھری رضائیوں وغیرہ سے کام لیا جاتا تھا۔ خوش حال کرخن دار یعنی کاری گر بے داغ اجلا لباس زیب تن کرنا اور سلمہ ستارہ ٹکی ٹوپی پہننا پسند کرتا تھا۔ دولت مند ریشمی لباس پہنتے اور پُر تکلف کشیدہ کاری کی شالیں استعمال کرتے۔ سفید کپڑے یا کام دانی کے بنے ہوئے چوڑی دار اور چوڑی مہری دونوں طرح کے پائجاموں اور ڈھاکے کی ململ کے کرتوں کا رواج تھا۔ ململ ہی کا انگرکھا گرمیوں میں عام طور سے پہنا جاتا تھا۔ کرتے کے اوپر چوغا یعنی فرغل پہننے کا رواج تھا۔ اکثر و بیش تر یہ رنگین ہوتا اور اس پر پُر تکلف کشیدہ کاری ہوتی۔ جاڑوں میں جبہّ یعنی قدیم روما میں مروج ٹوگا جیسا لبادہ پہنا جاتا۔ سر کا لباس لازمی سمجھا جاتا تھا۔ مخمل یا ململ کی بنی ہوئی اور زر دوزی کے کام کی ٹوپیاں گول یا چوگوشہ اور کبھی کبھی پنج گوشہ بھی ہوسکتی تھیں۔ مغلوں کے لیے مخصوص کھڑکی دار صافے اور منگولی ارک چین ٹوپیاں سر کے لباس کے دوسرے مروج نمونے تھے۔ دست یاب تصویروں کے پیش نظر کہہ سکتے ہیں کہ غالب اکثر کلاہ پپاخ یعنی ازبکستان اور ترکی میں عام طور سے مستعمل لمبی اور اوپر کی طرف تنگ مخروطی وضع کی ٹوپیوں سے مشابہ کوئی ٹوپی پہنتے تھے۔ چوں کہ طبقۂ امرا کے مرد دن کا قابلِ لحاظ حصہ مردانے میں ملاقاتیوں کی پذیرائی، خاطر مدارات یا اپنے فرائضِ منصبی

کی بجا آوری میں گزارتے تقریبات کا پُر تکلف لباس پہنے رہنا ان کے لیے معمول کی بات تھی۔ روداروں میں لباس کی جزئیات پر کافی توجہ دی جاتی۔ اپنے ایک خط میں غالب اس بارے میں کہ ان کو کس وضع کی پگڑی چاہیے تفصیلی ہدایات دیتے ہیں: "میں کلاہ کا جویا ہوں اور اس کے ساتھ میں ابریشمی لنگی کی فکر میں ہوں جو پشاور و ملتان میں بنتی ہے اور وہاں کے بڑے لوگ اسے اپنے سر سے باندھتے ہیں لیکن وہ لنگی ایسے شوخ رنگ نہ رکھتی ہو جو نوجوانوں ہی کو پھبتے ہیں، اس کا حاشیہ سرخ رنگ کا نہ ہو، اسی کے ساتھ اس کی پرداز اور اندازِ زیبائی بھی عمدہ ہو، تار ہائے زر و سیم کو اس میں استعمال نہ کیا گیا ہو اور سیاہ، سبز، زرد اور نیلا ریشم اس کی بناوٹ میں صرف کیا گیا ہو۔" (فارسی خط بہ نام منشی جواہر سنگھ، یکم دسمبر ۱۸۴۸ء۔ ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی)۔ پابندِ وضع اپنی وضع قطع میں سچ مچ بڑے دھن والے اور خوش سلیقہ بھی ہوسکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور شاعر اور غالب کے ہم عصر مومن بھی ایسے ہی تھے۔ فرحت اللہ بیگ ان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں: "بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا لیکن اس کے نیچے کرتا نہ تھا اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ، اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، پاؤں میں سرخ گل بدنی کا پےجامہ، مہریوں پر سے تنگ اور اوپر جاکر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی ایک بر کا پےجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئیں، کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی الٹا کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی۔ اس کے کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈ کر آگئی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔"

ایک اہم ادارہ طوائف کا کوٹھا تھا، جس نے شعری نشاۃ ثانیہ کی بیش تر اشاریت، تشبیہوں اور استعاروں کے لیے ماحول فراہم کیا تھا۔ ایک بے حد قدامت پسند معاشرے میں، جہاں پردے کا رواج اپنے عروج پر تھا اور نامحرم عورتوں اور مردوں کے میل جول کی قطعی ممانعت کلیتہً مسلمہ معاشرتی قاعدہ تھی، صرف طوائف کا کوٹھا ہی وہ بہ آسانی قابلِ رسائی

مقام تھا جہاں مرد بغیر کسی روک ٹوک کے اجتماعی حیثیت سے عورتوں سے راہ و رسم رکھ سکتے تھے اور اس طرح کی ملاقاتوں کو عشق و آرزو اور ہجر و وصال کے شاعرانہ جذبات کا رنگ دے سکتے تھے۔ اس طرح سے محبوبہ کا تصوّر" طوائف کے تصوّر میں تبدیل ہوگیا، خاندان کے سیاق و سباق سے عاری، بندھنوں اور اخلاقی پابندیوں سے آزاد ایسی عورت کے تصوّر میں جس کی اس وجہ سے بہ ذات خود ایک، عورت میں، ایک مطلقاً جمالیاتی تصور میں قلبِ ماہیت کی جاسکتی تھی۔"

طوائف تمدن کا ایک مسلّمہ جزو تھی۔ غالب کے خطوط میں، جہاں اس موضوع کا ذکر ہے، اخلاقی نقطۂ نظر سے کسی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ لہجہ بیانیہ اور شعریت سے خالی ہے۔ ایک طوائف کے مرنے پر، جس کے ان کے ایک دوست مظفر حسین خاں دل سے عاشق تھے، اپنے ایک نہایت مشہور خط میں غالب انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ اس صدمے کو کیسے صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے، خود اس رواج کی مذمت کا کہیں کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ مردوں کے لیے تعدد ازدواج کو ایک خلقی بات سمجھا جاتا تھا۔ بالخصوص طبقۂ امرا اور دولت مندوں میں گھر کے باہر اس طرح کے دل بہلاوے کو نہ صرف معاشرتی طور پر قابلِ قبول سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کی ان سے توقع بھی کی جاتی تھی۔ کبھی کبھی اس تجربے کا انجام افسوس ناک بھی ہوسکتا تھا۔ طوائف کسی شخص کے دیوالیے کا بھی باعث ہوسکتی تھی، کسی خاندان کی کئی پیڑھیوں کی جمع کی ہوئی دولت کو اپنی مالی منفعت کے لیے ہڑپ بھی کرسکتی تھی یا کسی شخص کو اس کے کنبے سے جدا بھی کرسکتی تھی۔ غالب نے ایک دفعہ شکایت کی کہ کیسے اس طرح کی ایک طوائف نے (وہ اسے رنڈی کا نام دینے کو ترجیح دیتے ہیں) ان کے سالے کے ساتھ بالکل ایسا ہی سلوک کر کے گھر والوں کے چھکے چھڑا دیے۔ لیکن اتنا خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا تھا۔ طوائف خود کو بے یار و مددگار نہیں محسوس کرتی تھی۔ اس امرِ واقعہ کا اس عہد کے لکھنو کے بارے میں مرزا رسوا کے قابلِ اعتبار ناول امراؤجان ادا میں نہایت پُر اثر طریقے سے اظہار ہوا ہے۔ اس ناول میں باکمال طوائف امراؤجان ادا " اس کو ایک امرِ بدیہی سمجھتی ہے کہ اس دنیا میں شریف عورتوں اور طوائفوں کا وجود ہمیشہ رہے گا اور ان کے مابین ہمیشہ پریشان کن رقابت رہے گی۔۔۔ بہ ظاہر وہ یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ

زندگی کے دوسرے شعبوں سے متعلق لوگوں کی طرح طوائف بھی چال چلن کے قوانین و ضوابط کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے اور چناں چہ وہ اپنے اصولِ اخلاقیات کی پکی رہی ہے۔ جب وہ خود کو گنہ گار کہتی ہے وہ محض رسمی خوش بیانی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتی ہے کیوں کہ اس کے امرواقعہ پر مبنی، روکھے پھیکے اور معروضی لہجۂ بیان سے شاذ و نادر ہی کسی سچے احساسِ گناہ کا اظہار ہوتا ہے۔" معاشرہ طوائف کو اصل سماجی دھارے کے ایک جزو کی حیثیت سے قبول کرتا تھا۔ تقاریب میں مثلاً اولیا کے عرس میں گانے اور ناچنے کے لیے اس کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ نواب شمس الدین کے انگریزوں کے حکم سے پھانسی پانے کے بعد طوائفوں نے نواب کے انجام پر افسوس کرتے ہوئے ایک گیت تصنیف کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں طوائف کا کوٹھا شائستہ طور طریقے سیکھنے کا ایک دبستان تھا جہاں متمول خاندانوں کے نوعمر اراکینِ خاندان ٹھیک اسی طرح بھیجے جاتے تھے جیسے آج کل دولت مندوں کی بیٹیوں کو شائستہ اطوار سکھانے کے اسکولوں کو بھیجا جاتا ہے۔ اسے تہذیبی مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور اس نے خیال، گائکی اور کتھک کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔ غالب کے زمانے میں جاگیرداری نظام کے انحطاط کی وجہ سے قدردانوں کی تعداد بھی کم ہوگئی تھی اور ان کے پاس روپیہ پیسہ بھی اتنا نہیں رہا تھا، نتیجتہً طوائفوں کا بھی اپنے تہذیبی کمالات کے تعلق سے کم باریک بین ہوجانا لازمی تھا۔ پھر بھی سماج طوائف کو ایک نری رنڈی کے برابر نہیں گرداننا تھا۔ یہ تو کئی سال بعد کی بات ہے جب صدی کے اختتام پر ہندو اور مسلم احیاءِ مذہب کی تحریکوں کی نئی اخلاقیات کے زیرِ اثر انھیں موخر الذکر کے برابر گردانا جانے لگا۔ اس وقت تک طوائف ایک مخصوص طرزِ زندگی کے جزو لاینفک کی حیثیت سے برقرار رہی اور اس کے اور اسی طرح اس کے قدردانوں کے وجود کو محض اس اخلاقی رسوائی کے سیاق و سباق میں نہیں سمجھا جاسکتا جو آج کل کوٹھے سے جڑی ہوئی ہے۔

مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ غالب کی دہلی خود اپنے اس ادعا کی لطافت اور تمکنت کی وجہ سے یاد رکھی جائے گی جو ایک تہذیب کا جواز فراہم کرتا تھا، وہ ادعا جس پر شائستگی سے قائم رہا جاتا تھا اور بعض اوقات اس کو نشوونما دینے والے

سیاسی و معاشی نظام کی بے رحمانہ بیخ کنی کے باوجود قابلِ رحم ہٹیلے پن کے ساتھ اس پر اصرار بھی کیا جاتا تھا۔ برطانوی موجودگی کے استحکام سے علانیہ سیاسی سرگرمیاں عارضی طور پر معرضِ التوا میں پڑ گئی تھیں، اس کے بہ جائے تہذیبی زندگی کی خوبی رودادوں کی مساعی کا خاص مرکزِ توجہ بن گئی، نتیجتاً ایسے قابلِ تقلید معیار معرض وجود میں آئے جنھوں نے اوپر سے لے کر نیچے تک سماج کے ہر طبقے کو متاثر کیا۔ رائج قاعدوں کی رو سے شائستہ سماجی میل جول بجائے خود ایک مقصدِ اصلی تھا اور اس مقصد کے حصول میں ان کے استعمال سے ہی ان تہذیبی کمالات کا بہترین اور انتہائی اطمینان بخش اظہار ممکن تھا۔ نرم مزاج، مہذب سخن ور بادشاہ ظفر اس عہد کی ایک فطری پیداوار بھی تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی حیثیت اس کی کامیابیوں کے لیے ایک عامل یا اثر آفریں قوت کی بھی تھی۔ ان کا دربار تہذیب و شائستگی کا ایک دبستان تھا جس کے آدابِ مجلس اور طور طریقوں کی تقلید دکن جیسے دور دراز علاقوں تک میں کی جاتی تھی۔ " دلی کی اقتدار کے پیرس کی حیثیت کے ختم ہوجانے کے بعد بھی ایک عرصہء دراز تک اس کی تہذیب و شائستگی کے ورسیلز کی حیثیت برقرار رہی۔" کہا جاتا ہے کہ مشاعرے میں " اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں ... اس کو نہ بیٹھنا چاہیے تھا * تو (میز بان یا صدر منتظم) بہ جائے اس کے کہ اس کو وہاں سے اٹھاتے خود ایسی جگہ جا بیٹھتے جہاں اس کو بٹھانا چاہتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد کہتے : ارے بھئی ذرا ایک بات تو سننا۔ وہ آکر ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ ان سے باتیں کرتے رہتے۔ اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جس کو وہ خالی جگہ کے لیے موزوں سمجھتے، اس سے کہتے : تشریف رکھیے وہ خالی جگہ ہے۔ جب وہ جگہ بھرجاتی تو کسی بہانے سے اٹھ جاتے " (فرحت اللہ بیگ : دلی کا ایک مشاعرہ)۔ باریک بینی سے ملحوظِ خاطر رکھی جانے والی تمام نفاستوں کے ساتھ شائستگی کا یہ مظاہرہ آخر تک ان قوتوں سے بہ ظاہر بے خبری کے عالم میں جاری رہا جو کچھ ہی سالوں میں ۱۸۵۷ء کے طوفانِ عظیم کا باعث بننے والی تھیں۔ ۱۸۵۷ء اور بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کے ساتھ سارا معاشرتی ماحول فنا ہوگیا۔ غالب کی دلی کے اپنے عیوب بھی تھے مثلاً رشوت

* نشستوں کا نقشہ مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعرا کے رتبے کو شعرا کے رتبے کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بنایا جاتا تھا، ناگزیر طور پر یہ کام کافی پیچیدہ اور جھگڑے کا تھا۔

ستانی ، انحطاط ، ظلمت پسندی ، لاحاصل سازشیں اور بلاشبہ معاشی استحصال اور غربت۔ لیکن یہ اس معاشرتی اور ثقافتی نظام کا ایک جزو تھے جو انفرادی ردِّ عمل اور رویے کے لیے لنگر گاہ کام دیتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے عہد میں اس نظام کی باقاعدہ شکست و ریخت عمل میں آئی اور یہ غالب کے لیے مقدر تھا کہ وہ اس کے مشاہدے کے لیے زندہ رہیں۔

باب : تین

مضطرب صاحبِ بصیرت

غالب آگرے میں ۲۷ / دسمبر ۱۷۹۷ء کو پیدا ہوئے ۔ تاہم ان کا آگرے سے آبائی تعلق نہیں تھا ۔ ان کے دادا قوقان بیگ خاں جو ، جیسا کہ غالب نے ادعا کیا ہے کہ سمرقند سے ہندستان آئے تھے ، ایک فوجی قسمت آزما تھے اور مختلف اوقات میں پنجاب کے صوبےدار ، مغل بادشاہ شاہ عالم اور مہاراجہ جےپور کی ملازمت میں تھے ۔ قوقان بیگ کے خاصے بڑے خاندان کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ ان کے دو بیٹے عبداللہ بیگ خاں اور نصراللہ بیگ خاں اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے ، انھوں نے بھی قسمت آزمائی کے لیے بھاڑے کے سپاہی کا وہ پیشہ اختیار کیا جس کے لیے اٹھارویں صدی عیسوی کی متلاطم اور بکھراؤ کی سیاست میں عمدہ مواقع کی بہتات تھی ۔ یہ ایک غیر یقینی پیشہ بھی تھا اور خطرناک بھی ۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں غالب بہ مشکل چار سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا ۔ ان کے انتقال کے بعد نصراللہ بیگ نے غالب ، ان کے چھوٹے بھائی اور بہن پر مشتمل اپنے بھائی کے خاندان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا ۔ دو سال بعد ۱۸۰۶ء میں نصراللہ

بیگ بھی ، جو ترقی کرکے مرہٹوں کے تحت آگرے کے قلعہ دار بن گئے تھے اور پھر قلعہ انگریزوں کے حوالے کرنے کے صلے میں ان کی طرف سے انعام و اکرام کے مستحق قرار دیے گئے تھے ، انتقال کر گئے ۔ اس طرح سے نو سال کی عمر کو پہنچنے تک غالب اپنے باپ اور چچا دونوں سے محروم ہو چکے تھے ۔ لیکن ایک حد تک وہ اپنی عمر کے ان ابتدائی سالوں کی اتھل پتھل سے محفوظ رہے ۔ ان کے والد کی آگرے کے ایک متمول خاندان میں شادی ہوئی تھی ۔ ایک بھاڑے کے سپاہی کی زندگی کی بے اعتباریوں کے پیشِ نظر انھوں نے دور اندیشی سے اپنی بیوی کو آگرے میں اپنے والدین کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی تھی ۔ غالب اپنے ننہیال میں پیدا ہوئے تھے اور اپنے والد اور چچا کے انتقال کے بعد بھی وہاں بزرگوں کے سایہ ٔ عاطفت میں نسبتاً آسودہ زندگی گزارتے رہے ۔ ان کے بعد کے خطوط میں پائے جانے والے اذکار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے یہ ابتدائی سال ان کو خاصی وضاحت کے ساتھ یاد تھے ۔

" میں اور وہ ہم عمر تھے ۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے دو ایک برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں ۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی ۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت ۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی ۔ چوں کہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا ، اس واسطے جب چاہتے تھے ، چلے جاتے تھے ۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے ۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے ۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور " کالے محل " سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرہ کہ وہ "گڈریوں والا" مشہور تھا اور ایک کٹرہ کہ وہ "کشمیرن والا" کہلاتا تھا ۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے ۔ ۔ ۔ "

جیسا کہ کہ عموماً ہوتا ہے مرورِ زمانہ کے ساتھ ان کا بچپن کے بے فکری کے دنوں کا

ٹُر کا بڑھتا ہی گیا، خاص طور سے مصیبت کے دنوں میں جن کی بعد میں ان کی زندگی میں بہتات تھی۔ چناں چہ ان کے آگرہ چھوڑنے کے کافی عرصے کے بعد وہ اپنے ایک عزیز کے نام خط میں جو وہاں کسی کام سے گئے تھے آگرے کی شان میں یوں قصیدہ خوانی کرتے ہیں:

"خدا نہ کرے کہ میرا اکبرآباد کسی کو ناپسندِ خاطر ہو۔ خدا کرے ہر مسافر جب وہاں سے گزرے تو خدا سے اس کی سلامتی اور آبادی کی دعا مانگے۔۔۔ اس گل زمین کا ہر ذرہء خاک میرے وجود کے لیے مسرت بخش کشش رکھتا تھا اور اس گلشن کی ایک ایک پنکھڑی کو میں تہہِ دل سے دعائیں دیتا تھا۔"

یہ مدحیہ عبارت بادی النظر میں یاد داشت سے زیادہ شاعرانہ خوش دلی پر مبنی دکھائی دیتی ہے۔ وقت ناگوار یادوں کو دھندلا دیتا ہے، وطن کا ہٹر کا یادوں کو ایک ہلکا خوش گوار رنگ عطا کرتا ہے۔ نانا نانی کے ساتھ گزران سے غالب کو مادی آسائش ملی ہوگی اور اس کی بہ دولت وہ تغیر پذیر و غیر یقینی زمانے کے حالات سے بالراست متاثر ہونے سے بچ بھی گئے ہوں گے، لیکن باپ اور چچا کی بےوقت موت کے صدمے نے انھیں مستقل احساسِ محرومی بھی ضرور دیا ہوگا۔ اپنے حسب نسب پر یوں حد سے نازاں شخص کو یہ امر واقعہ کہ اس کے پاس اپنے نانا نانی کے ساتھ گزر بسر کے علاوہ اور کوئی چارہء کار نہیں تھا لازمی طور پر ناگوار گزرتا رہا ہوگا۔ بلا شبہ ان کی زندگی کے ابتدائی سال خاصے ذہنی و جذباتی تناؤ کے تھے اور شاید یہ محض ایک امرِ اتفاقی نہیں ہے کہ انھوں نے کافی کم سنی ہی میں شعر لکھنا شروع کیا، شاید اسی سال (۱۸۰۶ء میں) جب ان کے چچا کا انتقال ہوا۔ خوش قسمتی سے ان کی ابتدائی تعلیم ایسی تھی کہ اس کم سن طالبِ علم کی عمر کے لحاظ سے غیر معمولی ذکاوت کی نشوونما میں مددگار ثابت ہوئی۔ شیخ معظم، جن کا اس وقت آگرہ کے جید علما میں شمار ہوتا تھا، ان کے استاد تھے۔ شاید غالب نے میر اعظم علی کے مدرسے میں بھی تحصیلِ علم کی۔ اس وقت پڑھائے جانے والے روایتی علوم منطق، علم ہیئت، طب اور مابعدالطبیعیات کے ابتدائی اصول کی انھیں بہت عمدہ تعلیم دی گئی۔ لیکن ان کا اصل رجحان لسانیات اور ادب، خصوصاً فارسی پر دست گاہ کی طرف تھا۔ حسنِ اتفاق سے

فارسی اور عربی دونوں زبانوں کے ایک نام ور عالم عبدالصمد اسی زمانے میں آگرے میں وارد ہوئے۔ (ان کا اصل نام ہرمزد تھا۔ وہ پیدائشی زرتشتی تھے لیکن بعد میں مذہبِ اسلام قبول کرلیا تھا) ۔ غالب نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ عبدالصمد غالب کے گھر میں دو سال (۱۸۱۱ء تا ۱۸۱۲ء) مقیم رہے۔ غالب نے کبھی بھی کسی کو اپنا استاد تسلیم نہیں کیا لیکن جس پُر جوش پیرائے میں انھوں نے بعد میں عبدالصمد کا ذکر کیا ہے اسے ایک حد تک ایسا اقرار سمجھا جاسکتا ہے۔ بہ ہرحال یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ فارسی میں غالب کے بے کراں تبحر کی بنیاد انھیں ابتدائی سالوں میں پڑی۔

غالب نے نو سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی فارسی میں اشعار لکھنا شروع کردیا تھا۔ اپنی ساری عمر انھوں نے بہ بانگِ دہل فارسی کو اپنی معشوقہ اول قرار دیا لیکن ایسی شہادت ہے کہ اس ابتدائی عمر میں بھی وہ ساتھ ہی ساتھ اردو میں بھی لکھتے تھے۔ حالی نے لکھا ہے کہ کنھیالال نامی ایک شریف آدمی نے آٹھ یا دس سال کی عمر میں غالب کی تصنیف کی ہوئی ایک مثنوی اپنے ہاں محفوظ رکھی تھی۔ غالب اس کا وجود فراموش بھی کرچکے تھے لیکن سال ہا سال کے بعد جب یہ مثنوی انھیں دکھائی گئی انھوں نے اسے بڑی مسرت کے ساتھ پڑھا۔ ظاہر ہے کہ اس عمر میں لکھے ہوئے غالب کے اشعار میں اتنی خوبی تھی کہ وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آگرے کے ایک معزز امیر اور شاعر حسام الدولہ ایک دفعہ اس کم سن شاعر کے بعض اشعار لکھنو مشہور زمانہ شاعر میر کے پاس لے گئے۔ میر اپنی غیر معمولی شعری تخلیقی قوت کے لیے اتنے ہی مشہور تھے جتنے اپنی ترش روی اور شاعری میں اعلیٰ معیار پر پوری نہ اترنے والی ہر تخلیق کو حقارت کے ساتھ مسترد کردینے کے لیے۔ یہ امر واقعہ ہی کہ کسی نے محسوس کیا کہ غالب کا لکھا ان کو دکھایا جاسکتا ہے غالب کی شعری استعداد کے اعتراف کی شہادت ہے۔ غزل پڑھنے کے بعد میر کا چبھتا ہوا تبصرہ یہ تھا کہ اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ میر کے منھ سے نکلے ہوئے ایسے الفاظ کو حوصلہ افزائی پر ہی محمول کرنا چاہیے۔

۸/ اگست ۱۸۱۰ء کو جب غالب کچھ مہینے کم تیرہ سال کے تھے، ان کی شادی نواب

الہٰی بخش خاں کی بیٹی امراؤ بیگم سے کردی گئی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد انھوں آگرہ چھوڑ کر دہلی کی مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اس واقعے کی صحیح تاریخ کا علم نہیں۔ ۱۸۶۲ء میں لکھے ہوئے ایک خط میں وہ کہتے ہیں کہ میں گذشتہ اکیاون سال سے دہلی میں سکونت رکھتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ۱۸۱۱ء ہی میں دہلی کو منتقل ہوگئے۔ لیکن غالب کی وقت اور تواریخ کی یادداشت، بالخصوص زندگی کے آخری دور کے قریب، بہت صحیح نہیں رہ گئی تھی۔ عمومی اتفاقِ رائے اس پر ہے کہ وہ ۱۸۱۳ء اور ۱۸۱۵ء کے درمیان کسی وقت منتقل ہوئے۔ جو کچھ بھی ہو دہلی ان کے لیے نیا شہر نہیں تھا۔ جیسا کہ وہ خود تسلیم کرتے ہیں وہ سات سال کی عمر ہی سے دہلی اکثر جاتے رہتے تھے۔ ان کے خسر دہلی کے طبقہء امرا کے اہم اور ذی اثر رکن تھے، معروف تخلص تھا اور بہ جائے خود ایک مسلمہ شاعر تھے۔ ویسے بھی ایک حوصلہ مند شاعر کے لیے مغل دربار کا مستقر دہلی آگرے سے کہیں زیادہ مناسب ماحول فراہم کرتا تھا۔ گذشتہ صدی کی متواتر سیاسی افراتفری نے میر اور سودا کو اپنا پسندیدہ شاہ جہاں آباد چھوڑنے پر مجبور کردیا تھا۔ لیکن انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں برطانوی استعماری موجودگی کی بہ دولت دہلی میں سیاسی اعتبار سے کم و بیش سکون قائم ہوگیا تھا اور شہر میں کسی نووارد کے لیے یہ کوئی کم قابلِ لحاظ امر نہیں تھا۔ سنِ بلوغ کو پہنچ کر اور بالخصوص شادی کے بعد ننھیال میں سکونت غالب کے لیے یقیناً ناقابلِ قبول رہی ہوگی۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ ان کے نانا کے انتقال کے بعد ان کی ماں کے گھر میں مادّی خوش حالی کو بھی امرِ بدیہی نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔

چناں چہ مختلف حقائق کی یک جائی غالب کے اس اقدام کا باعث ہوئی۔ وہ دہلی وہاں کے طبقہء امرا میں اپنا مقام اور بہ حیثیت شاعر اپنا جائز حق حاصل کرنے کے عزمِ مصمم کے ساتھ آئے۔ ان کے باپ اور چچا کی بے وقت موت نے انھیں مغل پائے تخت میں اس اونچے مقام سے محروم کردیا جو بہ صورت دیگر انھیں یقیناً ملتا۔ طبقہء امرا کے ایک رکن ہونے کے اپنے حق پر اصرار کی ضرورت تھی۔ اپنی ساری عمر، لیکن نسبتاً کہیں زیادہ شدت سے ان ابتدائی سالوں میں جب کہ وہ اپنا ایک مقام بنانے میں لگے ہوئے تھے، غالب نے اپنے حسب نسب کے وصف و ثنا میں جی جان سے کوشش کی۔۔۔ بادی النظر میں یہ

ایسے غیر معمولی ذہین اور ذکی الحس شاعر کی شخصیت کا ایک مضحکہ انگیز بلکہ طفلانہ پہلو دکھائی دے سکتا ہے۔ لیکن ان کے زمانے میں اصل اور حسب نسب اور وہ رتبہ جو ان کی بہ دولت سماجی نظام میں ملتا تھا کسی شخص کی قابلیت کی مسلمہ دلیل کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ غالب اس نقطۂ نظر کو صحیح سمجھتے تھے۔ بہ حیثیت شاعر اپنا حق حاصل کرنے کے معاملے میں ان کا ادعا کہیں زیادہ حق بہ جانب تھا اور اسکا انھیں علم تھا۔ اگر کوئی واحد تنقیح طلب امر ایسا تھا جس کے بارے میں غالب کبھی مذبذب نہ رہے ہوں تو یہ شاعری سے ان کی اپنی فطری مناسبت تھی۔ مختلف علوم کے اصول کی اس نہایت عمدہ بنیادی تعلیم کی بہ دولت جو انھیں عمر کے ابتدائی سالوں میں ملی تھی ان کے قبل ازوقت نشوونما یافتہ ذہن کو ایسا تبحّر حاصل ہوگیا تھا کہ جو ان کی کم سنی سے مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ اور دہلی میں، جیسا کہ ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں، وہ ٹھان چکے تھے کہ اپنی شعری استعداد اور اپنے علم کو تسلیم کروا کر ہی چھوڑیں گے، اس یقین کے ساتھ کہ یہ ان کی مساعی کی قوت پر مبنی کوئی بات نہیں بلکہ ان کا حق ہے۔ ان کی ناقابلِ انکار غیر معمولی تخلیقی قوت کے پیشِ نظر یہ ذہنی تکبّر شاید حق بہ جانب تھا۔ لیکن بالکل آخر تک غالب کا خیال تھا کہ انھیں وہ ستائش اور قبولیت عامہ نہیں ملی جو ازروئے انصاف ان کا حق تھی۔ تاہم اس سے اپنی صلاحیت پر ان کا یقین کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ شاعری میں دوسرے درجے کی تخلیقات کو خاطر میں نہ لاتے ہوے (جس رویّے کی وجہ سے ساری عمر انھیں مناقشوں میں الجھنا پڑا) وہ شاید غیر شعوری طور پر خود کو اپنے پسندیدہ نام ور شاعر میر کی مشہورِ زمانہ نازک دماغی اور سخت گیری کے نمونے پر ڈھال رہے تھے۔ تاہم ان کی دل کو موہ لینے والی خوش طبعی اور درد مندی نے انھیں اپنی خلوت پسندی اور دوسروں سے الگ تھلگ رکھنے کی خواہش کو پوری طرح سے عملی جامہ پہنانے کی اجازت کبھی نہیں دی۔

دہلی میں ورود کے بعد غالب نے فصیل بند شہر کے قلب میں چاندنی چوک کے پاس ایک حویلی کرایے سے لے لی۔ اپنے خسر کی معرفت، جن کے ہاں اپنے ورود دہلی کے بعد ممکن ہے کہ وہ کچھ عرصے کے لیے ٹھہرے ہوں، انھوں نے طبقۂ امرا اور روساؤں کے حلقوں میں حقِ داخلہ حاصل کیا۔ تاہم دنیائے شاعری میں ان کی اولین پذیرائی کو خوش گوار

کہنا مشکل ہے۔ غالب کا ابتدائی اردو کلام بے حد مفرس تھا۔ اردو کو زبردستی ٹکسالی فارسی کا جکڑکوٹ پہنانے کی کوشش اس ادبی ماحول سے جس میں اردو عام رابطے کی زبان کی حیثیت سے فارسی کی جگہ لے رہی تھی اور ادبی اظہار کے نئے وسیلے کی حیثیت سے اعتبار اور مقبولیت حاصل کر رہی تھی توافق نہیں رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار کے خیالات کی ساخت اغلاق کی حد تک پے چیدہ تھی۔ بادی النظر میں غالب شوکت بخاری، اسیر اور بیدل جیسے فارسی شعرا کے مجرد کلام سے بڑی حد تک متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ غالب کے فلسفیانہ رجحان اور مابعدالطبیعیات میں ان کے لڑکپن کی دل چسپی کے پیشِ نظر یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ لیکن ان کے اشعار کے بے حد دقیق مضامین اوسط سامع کو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ شاعری میں مروجہ رسمی اشاریت اور فرسودہ تشبیہوں اور استعاروں کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وہ تصرف شاعرانہ کے مسلّمہ ڈھروں سے بےزار تھے اور ان کے کلام پر نکتہ چینی کی جسارت کرنے والوں کے محدود مبلغِ علم پر پیچ و تاب کھاتے تھے۔ انھیں ایسی نئی تشبیہوں اور نئے استعاروں کی تلاش تھی جو ادب میں نت نئے تجربوں کی آفاق کو وسیع تر کریں۔ ان قابلِ تعریف مساعی کے ساتھ بہت ممکن ہے کہ ان کی طبیعت کی کسی طرح قابو میں نہ آنے والی ایک خصوصیت، یعنی اوروں سے مختلف ہونے کی خواہش، بھی جُڑی رہی ہو۔ گمان ہوتا ہے کہ ایک مفہوم میں یہ توجہ حاصل کرنے کا وسیلہ تھا۔ ایک آرزومند شاعر کی حیثیت سے غالب یقیناً یہ چاہتے تھے کہ ان پر توجہ دی جائے۔ پامال روش سے بالکل الگ انداز میں شاعری کرنا ان کے ذہنی تکبّر اور فنی اعتماد سے توافق رکھنے والی ایک تدبیر تھی اور ایسا تاثر ناگزیر ہے کہ انھیں اپنے اس رویّے کی وجہ سے اٹھنے والے مناقشوں کے ہلکوروں سے ایک متمّردانہ مسرّت حاصل ہوتی تھی۔ اپنے اشعار کے "ابہام" ہی سے وہ اپنی بے ربطی نہیں بلکہ اپنے نکتہ چینوں کی فہم کے قصور کو ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نکتہ چینی دوسروں کے مقابلے میں بنیادی طور پر اپنی جداگانہ حیثیت پر ان کے یقینِ کلّی کو صحیح ثابت کرتی تھی اور اپنی فطری قابلیت کو عامیانہ تعلق کی آلودگی سے محفوظ رکھنے کی ان کی خواہش کو تقویت بخشی تھی۔

لیکن ان کی خود اعتمادی سے علمی طبقہ کچھ ایسا متاثر نہیں ہوا۔ اس زمانے کے ادبی

جوش و خروش کے ماحول میں ایک نووارد کی انا کو اگر ٹھیس لگے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور غالب اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ اگر غالب کسی مشاعرے میں موجود ہوتے تو چند شعرا عمداً کھڑے ہوجاتے اور کوئی پُر شوکت لیکن بے معنی شعر سناتے۔ ایک موقع پر دہلی کے ایک مشہور بذلہ سنج حکیم آغاجان عیش نے طعن آمیز طریقے سے غالب کا ایک شعر سنایا اور بڑی مایوسی سے ہار مانتے ہوئے کہا کہ " ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے "۔ دوسرے زیادہ باریکی سے کام لیتے تھے لیکن ان کے حملے بھی اتنے ہی سخت ہوتے تھے۔ ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رام پوری نے غالب سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے ان کے سامنے پڑھے :

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کُل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب یہ سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا " حاشا ، یہ شعر میرا نہیں ہے۔" مولوی عبدالقادر نے از راہِ مزاح کہا : " میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں اب بھی دکھا سکتا ہوں۔" آخر غالب کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمھارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

جب آگرے میں ایسی ہی تنقید کی گئی تھی تو اسے غالب نے ان کے لیے مخصوص حقارت کے ساتھ اسے مسترد کردیا تھا۔ دہلی میں بنیادی طور پر ان کا ردِ عمل ویسا ہی تھا اور صدمے کو پوشیدہ رکھنے کی ناکام کوشش میں انھوں نے خود کو اپنی ناقدری کرنے والے سامعین کو خوش کرنے کی خواہش سے بالاتر قرار دیا۔

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

بعض تنقیدوں سے انھیں سچ مچ حیرت بھی ہوتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ ان کے نقاد ان کی عیب جوئی میں غیر ادبی امور کو پیشِ نظر رکھنے کو ناواجب نہیں سمجھتے تھے۔ اپنی ایک اردو رباعی میں وہ طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں :

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل		سن سن کے اسے سخن ورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

گو کہ ان کے بعض نہایت دل کش اشعار اپنی سادگی میں غنائیت سے مملو ہیں ۔ اس امر کو وہ صیغہء راز میں نہیں رکھتے کہ خود ان کی ترجیح کیا ہے :

سخنِ سادہ دلم را نہ فریبد غالب
نکتہ ء چندز پیچیدہ بیانے بہ من آر

(غالب سخنِ سادہ میرے لیے دل فریبی کا سامان نہیں رکھتا ۔ میرے لیے تو پیچیدہ بیانی کے چند نکتے فراہم کرو) ۔ لاکلام انھیں اپنے اشعار کی خوبی پر کبھی کوئی شک نہیں تھا اور ابتدا میں انھوں نے مختلف مسلمّہ ادبی شخصیتوں کو اپنے اس یقینِ کلی کے غیر منکسرانہ اظہار سے برہم بھی کیا تھا :

گنجینہ ء معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

ان کی جبلی تنقید بے زاری کا باعث بلاشبہ خود اپنی شعری صلاحیت پر ان کا غیر متزلزل یقین تھا اور نتیجتہً یہ یقینِ کلیّ کہ چند ایک ہی اس لائق تھے کہ ان کے بارے میں صحیح رائے قائم کرسکیں :

کہتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

تاہم آخر الامر ایسا لگتا ہے کہ اس وقت جب کہ وہ دنیائے شاعری میں نئے نئے متعارف ہورہے تھے انھوں نے رائے عامہ کو خاطر میں نہ لانے کے اپنے رجحان کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر اپنی ادبی پذیرائی کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا ۔ وہ جانتے تھے کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے ۔ یہ ایک مصافی مصالحت بھی تھی اور نکتہ چینوں کے طنز و تعریض کی ایک حد تک معقولیت کا بادلِ ناخواستہ اقرار بھی تھا ۔ اپنے انتقال سے کچھ سال قبل ایک دوست کے نام خط میں انھوں نے تسلیم کیا کہ پندرہ اور پچیس سال کی عمر کے درمیان لکھا ہوا ان کا کلام واقعی ادق تھا اور جوں ہی انھیں اس کا پورا اندازہ ہو گیا انھوں نے یہ پُر تکلف دیوان پھاڑ دیا اور صرف دس یا پندرہ اشعار اگلے مجموعے کے لیے بچالیے ۔۔۔ بہ ظاہر مرورِ زمانہ

کے ساتھ ، جو کچھ ہوا اس کے بارے میں غالب نسبتاً زیادہ سکونِ قلب کے ساتھ لکھ سکتے تھے لیکن ان کی انا کے پیشِ نظریہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس وقت جب یہ واقعہ درحقیقت پیش آیا اپنے نکتہ چینوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ان کے لیے بہت ہی زیادہ کڑوی گولی کھانے کے برابر رہا ہوگا۔ یہاں مولوی فضلِ حق نے ، جن کی ادبی صلاحیتوں کے بارے میں غالب بہت عمدہ رائے رکھتے تھے ، بہت اہم کردار ادا کیا۔ مولوی فضلِ حق ہی کے مشورے سے غالب نے ۱۸۲۱ء میں مُرتّبہ اپنے اولین اردو دیوان سے (دو ثلث کے قریب) نسبتاً زیادہ مغلق کلام حذف کردیا۔

پھر بھی دہلی میں اس ابتدائی جھڑپ کے زخموں کو مندمل ہونے میں کافی وقت لگا۔ اس کی نشان دہی اس امر سے ہوتی ہے کہ غالب نے اگلے تیس سال تک اردو میں لکھنا تقریباً ترک کردیا اور ٹکسالی فارسی کی اقلیمِ اعلیٰ و ارفع کو منتقل ہوگئے جہاں وہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے نقادوں سے نبٹنے کے بہتر موقف میں ہوں گے۔ تاہم جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے ، چاہے وہ اردو ہو یا فارسی عجیب بات ہے کہ غالب ساری عمر بڑی آسانی سے شدید ترین ادبی مناقشوں کا مرکز بنتے رہے۔

ادبی محاذ پر نکتہ چینوں کی یورشیں غالب کو جلد ہی دہلی کے طبقہء امرا کے طرزِ زندگی سے خود کو ہم آہنگ بنانے سے روک نہیں پائیں۔ وہ خود کو طبقہء امرا کا ایک رکن سمجھتے تھے اور شعوری طور پر انھوں نے اپنے اس سماجی رتبے سے توافق رکھنے والا طرزِ زندگی اختیار کیا۔ حالی نے لکھا ہے کہ وہ باہر ہمیشہ پالکی ہی میں جاتے ، اپنے ہاں ملاقات کے لیے آنے والوں کے پاس بازدید کو ہمیشہ جاتے اور جو ملاقات کے لیے نہ آئے اس کے ہاں کبھی نہ جاتے۔ جلد ہی نہ صرف یہ کہ انھیں اس حلقے میں حقِ داخلہ مل گیا بلکہ ایسی مقبولیتِ عام بھی ملی جس میں ایک حد تک ذم کا پہلو بھی شامل تھا۔ ان کی بذلہ سنجی اور ظرافت کے دہلی کے شائستہ حلقوں میں ہر طرف چرچے تھے۔ اس وقت حاضر جوابی کے فن کو نہ صرف تیز فہمی بلکہ عمدہ تعلیم و تربیت کا ثبوت مانا جاتا تھا۔ حاضر جوابی کا تختہء مشق کوئی قریبی شخص بھی ہو تو بیش تر اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ، اس کا برا نہیں مانتے تھے۔ چناں چہ مثال کے طور پر غالب کا وہ مشہور ترکی بہ ترکی جواب ہی لیجیے جو انھوں نے اپنے قریبی دوست

حکیم رضی الدین خاں کو دیا تھا جنھیں غالب کے برعکس آم پسند نہیں تھے۔ ایک دن جب غالب ان کے ساتھ اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے دیکھا نیچے گلی سے ایک گدھا چلا جارہا تھا، اس نے رک کر آم کے چھلکے جو وہاں پڑے ہوئے تھے سونگھے اور آگے بڑھ گیا۔ حکیم رضی الدین سے یہ کہے بغیر نہ رہا گیا کہ دیکھو مرزا آم ایسی چیز ہے کہ اسے گدھے بھی نہیں کھاتے۔ غالب نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جواب دیا: "جی ہاں، بےشک گدھے آم نہیں کھاتے۔" ایک دفعہ غالب سے پوچھا گیا کہ آپ کے خیال میں لفظ "رتھ" مذکر ہے یا مونث۔ انھوں نے جواب دیا کہ: بھیا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھ۔" وہ واقعہ بھی ہے جب غالب خود شمع دان لے کر فرش کے کنارے تک آئے تاکہ ان کے ایک دوست جو بعد ملاقات جارہے تھے روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ جب دوست نے کہا کہ "قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا" غالب نے بڑی سنجیدہ شکل بناکر کہا "میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمع دان نہیں لایا بلکہ اس لیے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔"

دہلی کے بے شمار رشتوں سے باہم دگر مربوط روداروں کے حلقوں میں اس طرح کے واقعات زبان زدِ عام ہوگئے اور انھوں نے نوجوان شاعر کی معاشرے میں اولین پذیرائی کی اعانت میں اہم کردار ادا کیا۔ مزید برآں اپنے ذہنی تکبّر اور نشتر کی تیزی رکھنے والی بذلہ سنجی کے باوجود غالب بہ حیثیت ایک شخص سب سے محبت کا سلوک بھی کرتے تھے اور ملنسار بھی تھے۔ دوستوں کا وہ اپنے گھر پر بڑے تپاک سے خیرمقدم کرتے تھے اور ان کی شخصیت میں ایسا جادو تھا کہ جو ان سے ایک بار بھی مل لے چاہتا تھا کہ شناسائی ہمیشہ برقرار رہے۔ بلاشبہ ایک عبقری کے لیے مخصوص اکھڑپن بھی ان کی فطرت میں شامل تھا۔ وہ اپنے دوستوں پر مہربان تھے، دوست آسانی سے بنالیتے تھے اور ان کے مخلص دوستوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ لیکن ان کی انا اور ان کے ذہن کی پیچیدگی، مالی عدم تحفظ کے باعث ان کی کمزوریاں اور معاشرے میں اپنے وقار کے تعلق سے ان کی زود رنجی ان کی شخصیت کو بالکل پُرسکون رکھنے میں ممد بھی نہیں تھی۔ ان کا انتہائی بےچین اور حسّاس ذہن متضاد جذبات کی کش مکش اور کیفیت مزاج اور موڈ کی اچانک تبدیلیوں کو پوری آزادی دیتا تھا۔

بے ساختہ مسرت اور خوش دلی، جو ایک شاعر کے لیے غیر فطری نہیں ہے، چند ہی لمحوں میں افسردگی، بد دلی اور بے گانگی کی طرف میلانِ خاطر سے زائل ہوسکتی تھی۔ شاعرانہ دل گیری اتنی ہی آسانی سے طبیعت کے ہر بندش سے آزاد جوش و خروش اور حظِّ نفس کے سراسر مادی رجحان سے دور ہوسکتی تھی۔ ابھی ملنسار تو دوسرے ہی لمحے وہ علاحدگی پسند اور آدم بےزار بھی ہوسکتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ انتہا درجے کے چشم پوش تو اپنے مخالفین کے حق میں وہ کینہ پرور بھی ہوسکتے تھے۔ ایک سطح پر عالمِ مادّی کے ماورا اور اس کے تعینات سے بری تو دوسری سطح پر وہ سراسر عملی رجحان رکھنے والے دنیادار بھی ہوسکتے تھے۔ وہ پنی طبیعت کے متضاد امتیازی اوصاف کو اپنے زائچے میں طالع کے تضاد کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ ایک فارسی شعر میں اپنے قدرے مخصوص انداز میں وہ اعتراف کرتے ہیں:

برنیایم بار دا نیہائے طبعِ خویشتن
موجِ آبِ گوہرِ من کردہ طوفانی مرا

(مجھے اپنی طبیعت کے اضطراب پر کوئی قابو حاصل نہیں ہے،
میرے گوہر کی موجِ آب نے مجھے طوفانی بنادیا ہے)۔

ساری عمر تنقید کے تعلق سے وہ انتہائی حساس رہے اور بعض دلی یگانگتوں کے باوجود خارجی دنیا سے ان کے تعلقات میں ایک بے اطمینانی کی کیفیت کو بھانپ لینا کچھ ایسا مشکل نہیں ہے۔ شاعر کے مشاہدہء نفس سے ان کے اس یقینِ کلی میں شدت ہی پیدا ہوتی تھی کہ وہ مخالفتوں کا ہدف ہیں، ایک ایسے ماحول میں ہیں جو ان کی صلاحیتوں سے عناد رکھتا ہے اور ان کی غیر معمولی ذہانت و بصیرت کے ادراک سے قاصر ہے۔ بارہا ان کے اشعار میں ہم سروں کی ان کے تئیں مخالفت سے پہنچنے والے صدمے کا عکس دکھائی دیتا ہے:

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

شخصی طرزِ زندگی میں ان کے عادات و اطوار اور شغال ان کے طبقے کے دیگر افراد کی وضع کے ہی تھے۔ چناں چہ وہ شراب پیتے تھے اور تقویٰ فروش پارساؤں کو برہم کرنے کے لیے اپنی مے گساری کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے اور مذہبی ممانعتوں سے اپنی بے اعتنائی کا برملا اظہار

کرتے تھے :

امامِ شہر بہ مسجد اگر رہم نہ دہد
نہ جائے من بہ نیابش گہہِ مغاں خالی ست
(اگر امامِ شہر مجھے مسجد میں داخلے کی اجازت نہ دے تو کیا ہوا،
پیرِ مغاں کی بخشش گاہ میں تو میری جگہ خالی نہ رہے گی) ۔ یا پھر

جب مے کدہ چھُٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ ان کی موجودگی میں کسی نے شراب نوشی کی بے انتہا مذمت کی اور آگاہ کیا کہ شرابی کی دعا کبھی قبول نہیں ہوتی تو غالب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ جس کے پاس شراب موجود ہے پھر اس کم بخت کو اور کون سی دعا کی ضرورت ہے ۔ غالب کا ایک اردو شعر اسی خیال کی ترجمانی کرتا ہے :

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادہء گل فامِ مشک بو کیا ہے ؟

ان کے لیے واعظ کو برداشت کرنا مشکل تھا :

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

اگر انھیں کسی چیز سے نفرت تھی تو ریا کاری سے :

آلودہء ریا نہ تواں بود غالبا
پاکست خرقہء کہ بہ مے شست و شوکنند

(غالب آلودہء ریا نہیں ہوسکتا ۔ جس خرقے کو شراب میں دھویا گیا ہو پاک ہوتا ہے)

مذہبی ممانعت کے تعلق سے اپنے حقارت آمیز رویے کو ذہن نشین کرانے کے لیے وہ اکثر جان بوجھ کر شراب کے ذکر میں مذہبی اشاریت کو کام میں لاتے تھے ۔

زم زم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامہء احرام بہت ہے

رات پی زم زم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامہ ء احرام کے

تقلید پسندوں پر اس تمام طعنہ زنی کے باوجود حالی کا کہنا ہے کہ خود غالب اعتدال سے پیتے تھے۔ وہ روزانہ تھوڑی سی فرانسیسی شراب دو تین حصے عرقِ گلاب کے ساتھ پیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ جو حد انھوں نے اپنے لیے مقرر کی تھی اس سے تجاوز نہ کریں (اپنی اس کوشش میں وہ ہمیشہ کام یاب نہ ہوتے رہے ہوں، یہ دوسری بات ہے)۔ وہ اس صندوق کی کنجیاں جس میں شراب رکھی جاتی تھی، اپنے خان ساماں کلّو کو اس ہدایت کے ساتھ سپرد کردیتے تھے کہ جب وہ اپنے مقررہ حصے کی شراب پی لیں تو پھر صندوق نہ کھولا جائے۔ بلاشبہ ایسے بھی مواقع آتے تھے جب ان کی ہدایات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے پر کلّو کو برا بھلا بھی کہتے اور وہ آدمی سنی ان سنی کر کے اپنے کام میں لگا رہتا۔ بہ ظاہر شراب کی مقدار موسم کے ساتھ بدلتی رہتی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں لکھے ہوئے ایک خط میں وہ یاد کرتے ہیں کہ جب وہ چالیس کے پیٹھے میں تھے تو برسات کے موسم میں بالعموم ان کا معمول رات کے مقررہ حصے کے علاوہ دوپہر کے کھانے سے پہلے یا شام ہوتے ہوتے تین گلاس شراب پینے کا تھا۔

آیا خود پر عائد کی ہوئی ان پابندیوں پر وہ جوانی کے زمانے میں سختی کے ساتھ عمل بھی کرتے تھے، اس پر بحث کی کافی گنجائش ہے۔ تاہم غالب کے کلیاتِ فارسی اور اردو مجموعہ ء کلام دونوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں وہ حدود سے متجاوز اور بے امتیاز مے نوشی کی مذمت کرتے ہیں:

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر — جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے
پیمانہ براں رند حراست کہ غالب — در بے خودی اندازہ ء گفتار نہ داند

(غالب اس رند پر شراب کا پیمانہ حرام ہے
جسے بے خودی میں اپنی بات کا اندازہ لگانا نہیں آتا)

جو کچھ بھی ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کو شراب پسند تھی۔ حالانکہ وہ بلانوش نہیں تھے لیکن اگر بازار میں عدم دست یابی کی وجہ سے (جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہوا) یا

اس صورت میں جب کہ خریدنے کے لیے پیسے نہ ہوں اور ادھار نہ مل رہی ہو انھیں ان کا روزانہ کا حصہ رسد نہ ملتا تو انھیں انتہائی تکلیف ہوئی۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کے پاس مے نوشی کی آرزو مندی کی بر محل عقلی تاویل بھی تھی:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

دل خستہء غمیم و بود مے دوائے ما
باخستگاں حدیثِ حلال و حرام چیست

(ہمارے دل پر غم کی جراحت ہے اور شراب ہماری دوا ہے،
مجروح کے لیے حلال و حرام کی باتیں کیسی؟)

حالاں کہ وہ ہمیشہ نہایت تنگ دست رہتے انھوں نے شراب پر پیسہ خرچ کرنے کو یا جب بھی ممکن ہو اسے ادھار خریدنے کو کبھی غلط نہ سمجھا:

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

بعض اوقات شراب فروشوں کے پاس ان کے رقعات قرض کی مجموعی قیمت اچھی خاصی ہوتی۔ ۱۸۵۳ء میں اپنے شاگرد تفتہ کے نام خط میں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ایک دوست کی بھیجی ہوئی سو روپے کی ساری رقم ایک انگریز شراب فروش کا ادھار چکانے میں خرچ ہو گئی:

صرف بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے

وہ شخصی طور پر ترجیح فرانسیسی شراب شمپان کو دیتے تھے اور بہت بعد میں جب شراب کی قلت تھی انھیں گنّے کی شراب رم کی تسکین بخش خوبیوں کا علم ہوا:

صاف دردی کشِ پیمانہء جم ہیں ہم لوگ
وائے! وہ بادہ کہ افشردہء انگور نہیں

غالب کے جیسے مزاج والے شخص کے لیے شراب خوش گوار محفل کا ایک لازمی عنصر، شائستہ گفتگو میں ممد اور مہذب طرزِ زندگی کا سہارا تھی:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

فارسی اور اردو شاعری میں ابر آلود دنوں اور چاندنی راتوں کو مے نوشی کے لیے بالخصوص موزوں تناظر کی حیثیت حاصل ہے اور غالب اس حسنِ ذوق کی تائید کرتے ہیں:

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہ تاب میں

بہ قول حالی غالب اکثر شام میں بہ وقت مے نوشی اشعار موزوں کرتے ۔ تنہائی میں ان کی انگلیاں لٹکتے ہوئے کمر بند سے کھیلتی رہتیں اور جب بھی کوئی شعر موزوں ہوجاتا وہ اس میں ایک گرہ باندھ دیتے ۔ سونے کا وقت ہونے تک کمر بند پر متعدد گرہیں ہوتیں اور صبح گرہیں کھولتے ہوئے ان کو اشعار یاد آجاتے اور وہ انھیں قلم بند کرلیتے ۔ شراب ان کی تخلیقی صلاحیت اور قوتِ متخیلہ کو بڑھاوا دیتی تھی ۔ ایک دل کش اردو شعر میں وہ لکھتے ہیں

دیدار بادہ ، حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزمِ خیال مے کدہ ء بے خروش ہے

اسی مفہوم میں وہ کہہ سکتے تھے کہ:

خیالِ جلوہ ء گل سے خراب ہیں مے کش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

شراب ، ساقی اور مے کدے کا ذکر غالب کے کلام میں بار بار آتا ہے لیکن ہند ایرانی شاعری کی بہترین روایات کی مناسبت سے بیش تر علامتی مفہوم میں ۔ شاعر کی جنبشِ قلم سے شراب نوشی کے عمل کی قلبِ ماہیت ہوجاتی ہے ۔ شیشے کی کھنک اور تندیِ بادہ سے بے شمار موضوعات جڑے ہوئے ہیں ۔ ساقی فضلِ خداوندی بن جاتا ہے ، شراب خدائے برتر کی طرف سے زندگی کی دین بن جاتی ہے اور مدہوشی روشن ضمیر کی روحانی مسرت ۔ اس تصور کی سالمیت میں شراب انسان کو پستی کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ انسان اسے اپنی انتہائی آرزوؤں اور تمناؤں کی سطح تک بلندی عطا کرتا ہے:

منعِ بادہ کشی ناداں ہے لیکن اے اسد
بے ولائے ساقیِ کوثر کشیدن منع ہے

قمار بازی یعنی شرط بد کر چوسر کھیلنا غالب کا دوسرا شوق تھا۔ حسبِ معمول اسے بھی وہ کسی سے چھپاتے نہیں تھے۔ ایک دن موسمِ گرما میں رمضان کے روزے کے دوران غالب کے قریبی دوست، معروف شاعر اور اسلامی قانون کے عالم مفتی صدرالدین آزردہ ان سے ملنے کے لیے آئے اور دیکھا کہ غالب ایک دوست کے ساتھ چوسر کھیل رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر مفتی صاحب نے کہا کہ مرزا صاحب ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید ہوتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت میں کچھ شبہ سا ہورہا ہے۔ غالب نے انھیں خوش آمدید کہا اور جواب دیا:

"قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر بات یہ ہے کہ
جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے!"

مذہبی قدامت پسندوں کو خاطر میں نہ لانے کے ان کے رجحان سے اکثر خود انھیں کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا راستہ کھل جاتا تھا۔ حالی ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں جب کہ غالب نے اپنے خسر الٰہی بخش معروف کو جن کی مذہبی تقلید پسندی سے سبھی واقف تھے، جان بوجھ کر خفا کیا، حالاں کہ اس وقت غالب کا بڑی حد تک ان کی سرپرستی پر انحصار تھا۔ معروف نے اپنے سلسلے کے مشائخ کا شجرہ غالب کے حوالے کیا تھا کہ اس کی نقل کردو۔ غالب نے نقل تو تیار کردی لیکن مشائخ کے نام اس طرح لکھے کہ ایک لکھا تو دوسرا حذف کردیا۔ جب معروف نے اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ "حضرت! شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے سو زینے کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ سے نکال دی جائے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا۔ آدمی ذرا اچک اچک کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔" معروف نے برہمی کے ساتھ نقل پھاڑ ڈالی۔

مسلّمہ عقائد کے تعلق سے غالب کی بے اعتنائی اس زمانے کے وسیع المشرب، صوفی مزاج سے بہ خوبی ہم آہنگ تھی۔ وہ کبھی رمضان کے روزے نہیں رکھتے تھے اور اس کا اعتراف کرنے کے لیے تیار تھے۔ وہ اپنے عیوب کے معترف تھے، واعظوں کی ہنسی اڑاتے تھے اور عموماً ایسا لگتا ہے کہ خاصی ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزارتے تھے۔ وہ شکیل و جمیل تھے اور اس کا انھیں احساس تھا۔ کئی سال بعد ایک دوست کے نام خط میں وہ اپنی دل

کش شکل صورت کو اپنی مخصوص شوخی کے ساتھ یاد کرتے ہیں: "۔۔۔ بہ ہرحال تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا ، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے ۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا ، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے ۔" حالی اس کی تصدیق کرتے ہیں ۔ غالب بوڑھے ہوچکے تھے جب حالی کی ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی لیکن تب بھی دکھائی دیتا تھا کہ جوانی میں وہ بہت خوب صورت رہے ہوں گے اور متعدد لوگوں نے جنھوں نے غالب کو ان کی جوانی میں دیکھا تھا ، حالی سے اس کا ذکر کیا ۔ قدرتی بات ہے کہ عورتوں (بہ الفاظ دیگر طوائفوں) کے ساتھ غالب کا راز و نیاز قدرے جلد ، شاید آگرے ہی میں شروع ہوگیا ۔ آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد لکھے ہوئے ایک خط میں وہ آگرے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یہ اجڑا ہوا شہر اور یہ آباد خرابہ کبھی مجھ جیسے آشفتہ سر کی بازی گاہ تھا ۔۔ اس گل زمیں میں سوائے "مہر گیا" اور کوئی سبزہ نہ اگتا تھا اور شاخِ دل کے سوا کوئی اور شجر بارآور نہ ہوتا تھا ۔" دلی کا بھی وہی حال تھا ۔ جس طبقے سے غالب کا تعلق تھا اس کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی ۔ شہر کے بانکے سجیلے نوجوان سے خصوصاً اس صورت میں کہ وہ ایک نیا نیا شاعر بھی ہو یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ طوائف کے کوٹھے کی سیر کو بھی جایا کرے گا ۔ یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ غالب نے اس مسلمہ ضابطۂ اطوار سے انحراف کیا ہوگا اور اس طرح کے معاملات کے ذکر سے اخلاقی نقطۂ نظر سے کسی احساسِ جرم کا اظہار نہیں ہوتا ۔ مثال کے طور پر ۱۸۵۹ء میں لکھے ہوئے ایک خط میں وہ قدرے غیر شاعرانہ انداز میں مغل جان نامی ایک طوائف کے ساتھ اپنے خوش گوار ربط ضبط کی یاد تازہ کرتے ہیں ، جس کے ساتھ ان کی بے تکلفی تھی اور جس کے ساتھ وہ گھنٹوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے ۔

بہتیرے اتفاقیہ معاشقوں کے من جملہ ایک ایسا سچا عشق بھی تھا جس نے بہ ظاہر ان کی نفسیاتی ساخت پر گہرے زخم کا نشان چھوڑا ۔ اس واقعے کے بارے میں زیادہ معلومات دست یاب نہیں ہیں بہ جز ان دو اذکار کے جو خود غالب کے بعد کے خطوط میں ملتے ہیں ۔ اپنے ایک دوست مہر کے نام خط میں جن کی محبوبہ ان کو داغِ مفارقت دے گئی تھی وہ لکھتے ہیں :

"بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم دونوں کو بھی کہ زخم مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ با آں کہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔۔۔" اس خط پر تاریخ نہیں ہے لیکن اس کا تعینِ زمانی ۱۸۶۰ء کے آس پاس کیا گیا ہے۔ چالیس بیالیس برس قبل کا مطلب ہوا کہ اس معاشقے کے وقت غالب تیئیس سال کے رہے ہوں گے۔ ایک قریبی دوست مظفر حسین خاں کے نام لکھے گئے ایک اور خط میں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ ان کی جوانی کا ہے:

> " عہدِ جوانی میں جب میرے اعمال میرے بالوں سے بھی زیادہ سیاہ تھے اور سر میں پری رویوں کا سودا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، بد نصیبی نے تلخی سے بھرا ہوا ایک جام میرے سامنے بھی رکھا تھا اور دوست کے جنازے کی رہ گزار کے غم آثار نظارے نے میرے صبر و ثبات کو بھی غبارِ راہ کی طرح بکھیر دیا تھا۔"

یہ بات واضح ہے کہ یہ لڑکی ڈومنی یعنی ناچنے گانے والی لڑکی تھی اور یہ کہ معاشقہ چند روزہ تھا کیوں کہ جلد ہی، شاید الم ناک حالات میں اور قطعی طور پر عنفوانِ شباب میں اس کی موت واقع ہوئی۔ یہ بات بھی اتنی ہی واضح ہے کہ تعلق چند روزہ ہی سہی، نہایت گہرا تھا۔ غالب، مظفر حسین خاں کے سامنے اپنے کرب کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> " روزِ روشن میں سیاہ ماتمی کپڑے پہنے اپنی محبوبہ کے غم میں آنسو بہاتا ہوا میں بوریے پر بیٹھا رہتا اور تنہائی کی شبِ تار میں اس کی شمعِ خاموش پر پروانے کی طرح شعلہ در آغوش رہتا۔ کیسی کھلی ناانصافی ہے کہ اس نازک اندام کو سپردِ خاک کرنا پڑا جو بسترِ راحت پر میری شریک تھی اور جس کو وقتِ رخصت رشک کے باعث خدا کو سونپنے میں بھی مجھے ڈر لگتا تھا۔"

بالکل صریحی طور پر یہ تعلق اتنا ہی قلبی تھا جتنا کہ مادّی اور اس کی یاد کا سایہ غالب پر

ساری عمر منڈلاتا رہا۔

ایسا لگتا ہے کہ ڈومنی کی موت کے بعد غالب کا فطری ردِ عمل یہ تھا کہ مستقبل میں خود کو ایسے کسی تجربے کے کرب سے محفوظ رکھیں۔ ساتھ، جیسا کہ ان کا خاصّہ ہے، ان کی کوشش یہ رہی کہ اپنے شخصی تجربے کے صدمے کو ایک وسیع تر فلسفیانہ تناظر کے تحت لے آئیں۔ "محفل میں کتنی شمعیں فروزاں ہیں اور چمن میں کتنے گلاب کھلے ہیں! تو کیا پروانہ ایک ہی شمع کے غم میں جلتا رہے اور بلبل ایک ہی گلاب کے مرجھانے پر آہ و زاری کرتا رہے؟ آدمی کو تماشائے حسن، تماشائے رنگ و بو کا دیوانہ ہونا چاہیے، کسی ایک، اکیلی آرزو کا اسیر نہیں۔ بہتر ہے کہ محفلِ الفت میں وہ پھر ترانہ، مسرت الاپے اور ان خوب رویوں کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے بازو پھیلادے جن میں یہ صلاحیت ہے کہ اپنے عشاق میں ذوقِ حیات کو دوبارہ زندہ کریں اور خود بھی اس کا لطف اٹھائیں۔" ایسا سوچنا غم کی شدت کم ہونے پر نظریہ، لذّتیت کا سہارا لینے کے مرادف نہیں تھا اور نہ ہی یہ کسی ایک سچے قلبی تجربے کی اہمیت کو گھٹاتے ہوئے اتفاقی تعلقات کو ضرورت سے زیادہ وقعت دینے کی کوئی کوشش تھی۔ بلکہ یہ غم کے ناگزیر ہونے کو، مگر اس سے بھی زیادہ مسرت کے امکان کو تسلیم کرتے ہوئے ذاتی غم سے ماورا ہوجانے کی آرزو تھی۔ قادرِ مطلق کے کرم کو محض کسی ایک تجربے تک محدود نہیں کیا جاسکتا، اس سے اس کی تمام اشکال میں مسرت اندوز ہونا چاہیے۔ وجود کے تنوّع کا فلفسیانہ جواز ہے، یہ سراسر مادی، حسی انبساط کا لازوال سرچشمہ بھی ہے۔ ہمارے پاس اس کے مشاہدے کی صلاحیت ہونی چاہیے، ہمیں خود اپنی نظر کی کوتاہی سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے:

صد جلوہ رو بہ رو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

اس تناظر میں وہ رنج و الم کے ناپائدار ہلکوروں کا مذاق اڑا سکتے تھے اور اپنے دوستِ مہر کی سرزنش کرسکتے تھے کہ اگر ایسے ہی گرفتاری سے خوش ہو، تو چُنا جان نہ سہی، منّا جان سہی۔ وہ لکھتے ہیں۔ "کسی کے مرنے کا وہ غم کرے، جو آپ نہ مرے... آزادی کا شکر بجالاؤ... میں جب بہشت کا تصوّر کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور

ایک حور ملی ، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے ۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منھ کو آتا ہے ۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی ۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی ۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی شاخ ، چشمِ بددور ، وہی ایک حور ۔ ۔"

یہ غالب کی مخصوص ظرافت تھی جس سے وہ افسردہ دلی سے بچاؤ کے لیے سپر کا اور غم کی تلخی کو کم کرنے کے لیے مٹھاس کا کام لیتے تھے ۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مکتوب الیہ سے محبوبہ کی موت کا ذکر اس لاابالی پن سے صرف چالیس سال بعد ہی کرسکتے تھے جب کہ وقت نے خود ان کے " زخمِ مرگِ دوست " کو ایک حد تک مندمل کردیا تھا ۔ پیرانہ سالی میں بھی انھیں اعتراف تھا کہ ان کی پہلی محبوبہ کی یاد کی کسک ان کے دل میں اب بھی برقرار ہے ۔ اس کی موت کے وقت ان کا بے ساختہ کرب انتہائی جان لیوا تھا ، جس کی تلافی بعد کی عقلی تاویلوں سے نہیں ہوئی تھی ۔ یہ اس دل گداز نوحے سے ظاہر ہے جو اس کے مرنے پر انھوں نے لکھا تھا (اس کے کچھ اشعار ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں) اور جو بہ قول پروفیسر مجیب " ایک ایسے امرِ واقعہ کی نشان دہی کرتا ہے جو ان کے ساتھ شاذ و نادر ہی پیش آتا تھا ، یعنی شاعرانہ عشق و الم کی لطیف فضاؤں سے شدت سے محسوس کیے جانے والے ارضی غم و اندوہ اور سراسر مادی جذبے کے سچے ہیجان کی طرف نزول ۔"

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ، ہائے ہائے !
کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال ؟
دشمنی اپنی تھی ، میری دوست داری ، ہائے ہائے !
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا ؟
عمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری ، ہائے ہائے !
گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہوگیا ؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ، ہائے ہائے !
عشق نے پکڑا نہ تھا ، غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ، ہائے ہائے !

معاشقے کے رنج و الم سے قطع نظر کریں تو دہلی میں غالب کے ابتدائی سالوں کے بعض واقعات کو ان کی تلافی بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ بہ حیثیت شاعر ان کی شہرت اب تنازع فیہ ہونے کے باوجود مسلّمہ تھی اور روز افزوں بھی۔ جاگیردار رو داروں کے طبقے نے انھیں قبول کرلیا گیا تھا اور اس طبقے میں انھیں ایسی پیاری شہرت ملی تھی جو انھیں فو دوسروں کے مقابلے میں ایک امتیازی حیثیت بخشتی تھی۔ ان کے متعدد اچھے دوست تھے وہ اچھی شراب پیتے تھے، پابندی سے جمنے والی قمار بازی کی بیٹھکوں سے لطف اندوز ہوتے تھے اور طوائفوں کے کوٹھوں کو جایا کرتے تھے۔ بس ایک مسئلہ ابھر رہا تھا اور وہ تھا ان کے بڑھتے ہوئے دوالیہ پن کا۔ غالب کی واحد مستقل آمدنی باسٹھ روپے آٹھ آنے کی تھی۔ یہ اس موروثی پنشن میں ان کا حصہ تھا، جو انگریزوں کی طرف سے غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کے ورثا کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ اس زمانے کی ارزانی کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حقیر رقم نہیں تھی۔ لیکن اس معیار زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے جو غالب نے اختیار کرنا پسند کیا تھا یہ بالکل ناکافی تھی۔ ان کے شوق مہنگے تھے: فرانسیسی شراب اور قمار بازی، اور ان کا معاشقہ نہ صرف اپنی الم ناک شدت کی وجہ سے قابلِ توجہ ہے بلکہ محبوبہ کا خرچہ برداشت کرنے کے لیے ان کی آمادگی کی وجہ سے بھی۔ ایسا نہیں ہے کہ روپے پیسے کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس کے برعکس انھیں ساری عمر ان کی ضرورت کا شدت سے احساس رہا۔ روپے پیسوں کی بے شک اہمیت تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ ان کے دوسرے میلانات طبع کو قابو میں لاسکے۔ ان کی کمی ان کو زندگی بسر کرنے کے صحیح طریقے کے بارے میں اپنے قطعی تصورات کو جوکھوں میں ڈالنے پر کبھی مجبور نہیں کر پائی۔ ساری عمر ان کی ضرورت تو انھوں نے ضرور محسوس کی لیکن انھیں مقصدِ اصلی کی حیثیت سے قابلِ قدر کبھی نہیں سمجھا اور آگے چل کر جب انھوں نے اقرار کیا کہ روپے پیسے کو انھوں نے ہاتھ کے میل سے زیادہ کبھی نہیں سمجھا تو اسے اظہار حقیقت ہی پر محمول کرنا چاہیے۔

ناگزیر طور پر قرض لینے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا اور اتنے ہی ناگزیر طور پر قرض چکانے کا بھی کوئی وسیلہ نہ تھا۔ اس امر کی شہادت ہے کہ ابتداءً قرض [illegible] لیے سہل الوصول تھا، رشتہ دار زیادہ مہربان تھے، دکان دار زیادہ بامروّت تھے اور ساہوکار

ان کے خاندانی اسبابِ روشناسی سے اور معاشرے میں بہ حیثیت مجموعی ان کے رتبے سے زیادہ مرعوب تھے۔ وفات سے کچھ سال پہلے وہ حسرت کے ساتھ ان گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتے ہیں جب وہ متھرا داس، درباری مل یا خوب چند جین جیسے بہتیرے ساہو کاروں سے، انھیں بہ خوشی ایسے تمسک مہری دے کر آسانی کے ساتھ قرض حاصل کر لیتے تھے، فی الحقیقت جنھیں محفوظ رکھنے کی بھی ان ساہو کاروں کو زحمت نہیں اٹھانی چاہیے تھی کیوں کہ آخرکار وہ نہ تو قرض کی اصل رقم وصول کر پاتے تھے اور نہ ہی سود! مزید برآں اس وقت ان کے گزارے کے اخراجات ان کی پھوپھی ادا کرتی تھیں، لوہارو سے احمد بخش خاں وقتِ ضرورت رقوم بھیج دیا کرتے تھے اور آگرے سے ان کی والدہ جو ابھی بہ قیدِ حیات تھیں روپے پیسے بھیجتی تھیں۔

لیکن جب ان کے قرضوں میں اضافہ ہوا اور ادائگی سے قاصر رہے تو ان کے قرض خواہوں کے صبر کا پیمانہ بھی بھرنے لگا۔ ۱۸۲۶ء تک ان کے معاملات کا یہ پہلو خطرناک حالت تک پہنچ چکا تھا۔ اس بارے میں ان کے تفکرات میں اب ان کے بھائی کے خللِ دماغ کا رنج و ملال بھی شامل ہوگیا۔ بعد میں وہ اپنی زندگی کے اس دور کا ایک حد تک پچھتاوے کا رنگ لیے ہوئے مخصوص فصیح و بلیغ انداز میں ذکر کریں گے۔ اپنی "بے فکری" کے ان دنوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ناعاقبت اندیشانہ طرزِ زندگی پر مستقل مزاجی سے قائم رہتے ہوئے میں فرشِ مے کدہ پر ٹھوکر کھا کر جو گرا تو ایک طرف بھائی کی دیوانگی کے صدمے نے تو دوسری طرف قرض خواہوں کے مسلسل تقاضوں نے مجھے شدت کے ساتھ حقیقت کا احساس دلایا۔

چناں چہ بلاشبہ وقت آگیا تھا کہ اصلاحِ حال کے لیے کوئی تدبیر سوچی جائے۔ عادات و اطوار اور طرزِ زندگی میں تبدیلی بہت مشکل تھی۔ دوسرا واحد چارۂ کار آمدنی میں اضافہ تھا۔ یہی وہ حالات تھے جن میں انھوں نے انگریزوں کی عطا کی ہوئی پنشن میں اپنے حصے کے بارے میں تحقیقات شروع کیں۔ غالب اس نتیجے پر پہنچے کہ احمد بخش خاں نے جن کے ذریعے پنشن کی ادائگی ہوتی تھی، دھوکے سے غالب کے حصے کو مقررہ دس ہزار روپے سے گھٹا کر پانچ ہزار روپے قرار دے کر انھیں عمداً ان کے جائز حق سے محروم کیا ہے۔ اس

کے علاوہ پنشن کے جائز حق دار یوسف خاں یعنی غالب کے چھوٹے بھائی کو حصہ داروں کی فہرست سے خارج کرتے ہوئے انھوں نے اس میں خواجہ حاجی جیسے دعوی داروں کو شامل کردیا تھا جن کی غالب کے چچا سے کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ ان کا پہلا ردِّ عمل یہ تھا کہ احمد بخش خاں سے التماس کریں۔ "ہر ممکنہ طریقے سے میں نے اپنے حقوق کے سوال کو حرکت میں لانے کی کوشش کی اور بار بار تحریری طور پر بھی اور زبانی افہام و تفہیم کے ذریعے بھی اپنے معاملے کے بارے میں احمد بخش خاں کو توجہ دلائی۔۔۔" شروع میں ایسا لگتا ہے کہ رشتہ داری کے پاس و لحاظ نے غالب کو علانیہ نزاع سے باز رکھا۔ "چوں کہ احمد بخش خاں دو رشتوں سے میرے بزرگ اور قرابت دار تھے، اولاً اس طرح سے کہ میرے چچا نصراللہ بیگ خاں ان کے داماد تھے، ثانیاً اس طرح کہ میں ان کے بھائی الٰہی بخش خاں کا داماد ہوں۔ تو ان حالات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں احمد بخش خاں کی بزرگی اور قرابت داری کی عزت کرتا تھا اور اپنے ساتھ کی جانے والی نا انصافیوں کی اذیّت کو خاموشی سے برداشت کرتا تھا۔ میں نے اپنے بھائی کو بھی اپنی ناخوشی کا اظہار کرنے اور حکومت سے چارہ جوئی سے روکا۔" لیکن پھر متعدد واقعات یکے بعد دیگرے پیش آئے۔ ۱۸۲۲ء میں احمد بخش خاں نے اپنی گدی اپنے سب سے بڑے بیٹے شمس الدین خاں کے حق میں چھوڑ دی۔ شمس الدین غالب پر مہربان نہیں تھے کیوں کہ غالب کے شمس الدین خاں کے سوتیلے بھائیوں امین الدین اور ضیاء الدین سے زیادہ قریبی تعلقات تھے۔ فی الحقیقت امین الدین غالب کے نہایت قریبی دوستوں میں سے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں غالب کے خسر کا انتقال ہوگیا اور اس طرح اندر ہی اندر بڑھتی ہوئی ہم جدیوں کی اس نزاع کو حد کے اندر رکھنے والا ہاتھ بھی اب نہ رہا۔ اس وقت تک غالب کے قرضے نہایت تکلیف دہ ہوچکے تھے۔ انھیں مزید روپیے پیسوں کی ضرورت کا شدید اس وقت احساس ہوا جب کہ شمس الدین خاں نے انھیں پنشن کی مقررہ ادائیگیوں کے تعلق سے دق کرنا شروع کیا۔ پھر بھی غالب پُر امید رہے کہ احمد بخش خاں بیچ میں پڑ کر معاملے کی یک سوئی کردیں گے۔ لیکن بالکل صریحی طور پر موخرالذکر کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ اپنے لیے غالب کے پاس و لحاظ کا ناجائز طور پر فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹال مٹول کی تدبیریں اختیار کرنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ غالب ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔

جب اس انتظار کے بعد کہ احمد بخش خاں اپنا وعدہ پورا کریں گے وہ فیروز پور گئے اور ان سے کہا : " اب آپ اپنا وعدہ ایفا کریں اور قانونی مالکوں کو ان کے حقوق بحال کریں یا پھر مجھے اجازت دیں کہ میں اپنا معاملہ حکومت کے سامنے پیش کروں ۔" غالب لکھتے ہیں کہ احمد بخش خاں اس وقت ایک زخم کے نتیجے کے طور پر اپنے بسترِ علالت سے ابھی ابھی اٹھے تھے اور الور کی مختاری سے محروم ہوجانے کی وجہ سے بےحد دل شکستہ تھے ۔ چناں چہ وہ میرے سامنے رونے اور سسکیاں بھرنے لگے اور کہا " اے میاں ، تم میرے فرزند اور آنکھوں کی روشنی ہو ، دیکھو مجھے کیسا صدمہ پہنچا ہے ، کتنا ٹوٹ گیا ہوں اور کیسے میرا حق مارا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ میرے اور جنرل اختر لونی کے درمیان دوستی اور خلوص کا رشتہ بھی باقی نہیں رہا اور کچھ دن صبر کرو، تمھارے حقوق بالآخر پوری طرح بحال کردیے جائیں گے۔" اختر لونی کے انتقال کے بعد احمد بخش خاں نے یہ امید دلائی کہ وہ اس کے جانشین چارلس مٹکاف سے ایک ترمیمی سند جاری کروادیں گے ۔ مٹکاف کا قیام اس وقت بھرت پور میں تھا چناں چہ احمد بخش خاں نے غالب سے کہا کہ مٹکاف سے ملاقات کے لیے وہ ان کے ساتھ وہاں چلیں ۔ غالب لکھتے ہیں کہ " باوجود اس کے کہ اس تمام عرصے کے دوران میں اپنے بھائی کی بیماری کی مصیبت اور قرض خواہوں کے تقاضوں اور سخت اصرار سے پریشان تھا اور کسی طرح سے بھی سفر پر جانے کے لائق نہیں تھا ، پھر بھی صاحبِ موصوف سے اظہار عقیدت کی امید میں اپنے بھائی کو میں نے بخار اور ہذیان کی حالت میں چھوڑا ، اس کی نگہہ داشت اور نگہہ بانی کا کام چار آدمیوں کے سپرد کیا ، اپنے بعض قرض خواہوں کو مختلف وعدوں سے دلاسا دیا ، دوسرے قرض خواہوں کی نظروں سے خود کو چھپایا اور پوشیدہ رکھا اور کسی طرح کی سہولت کے بغیر ۔۔ بڑی مشکل سے احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور کے لیے روانہ ہوا ۔" لیکن فائدہ کچھ نہ حاصل ہوا ۔ احمد بخش خاں نے مٹکاف سے اس مسئلے پر گفتگو ہی نہیں کی ۔ غالب نے طے کیا کہ اب وہ اس معاملے میں اپنے ہی بوتے پر کارروائی کریں گے ۔ انھوں نے سنا تھا کہ گورنر جنرل مغرب کی طرف آرہے ہیں اور یہ کہ مٹکاف ان کی مشایعت کے لیے کان پور جائیں گے ۔ غالب کا ارادہ تھا کہ " کان پور جاؤں اور وہاں سے ان کے ہم رکاب واپس لوٹوں ، اس طرح سے خود کو سر چارلس مٹکاف سے متعارف کرواؤں ،

انھیں اپنی مصیبت، بے کسی اور قرض داری کی شرم ناک صورت حال سمجھاؤں اور صاف پاؤں ۔" غالب فیروز پور سے سیدھے کان پور روانہ ہوئے لیکن بد قسمتی سے منزلِ مقصود پر پہنچ کر بیمار پڑگئے اور اس طرح سے انھوں نے مٹکاف سے ملاقات یا پھر گورنر جنرل کے حضور میں عرضی پیش کرنے کا یہ عمدہ موقع کھودیا۔ لیکن اب لڑائی کا آغاز ہوچکا تھا اور انھوں نے عزم کرلیا کہ اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیے کلکتے ہی جائیں گے۔

معاملہ کافی اہم تھا، اگر ان کا دعویٰ تسلیم کرلیا جاتا ہے تو وہ اپنے جمع شدہ سارے قرضے ادا کرپائیں گے اور خرچ کرنے کے لیے ان کے پاس زیادہ روپے پیسے بھی رہا کریں گے۔ انھیں اپنے دعوے کی معقولیت پر ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا۔ دہلی کے بااثر انگریز حسب مدد تو کرسکتے ہیں لیکن آخری فیصلہ تو کلکتے ہی میں ہونا ہے۔ ان کا عزم کلکتہ ان کی عمر بھر کی سفر کی آرزو سے بھی بہ خوبی توافق رکھتا تھا۔ تبدیل آب و ہوا اور دہلی اور اس کے تمام مسائل سے چھٹکارا بھی بے شک وجہ ترغیب رہے ہوں گے۔ سفر اخراجات کا باعث تو ہوگا لیکن اس پر روپیہ لگانے کے لیے لوگ اس امید میں مل ہی جائیں گے کہ جیسے ہی غالب مقدمہ جیتتے ہیں یہ قرضہ اور پہلے لیے ہوئے قرضے سبھی یک مشت ادا ہوجائیں گے۔ غالب کلکتے کے لیے ۱۸۲۶ء کے آخر یا ۱۸۲۷ء کے شروع کی کسی تاریخ کو روانہ ہوئے۔

سفر سست رفتار اور دشوار تھا۔ وہ کشتی سے سفر کرنے کا مقدور نہ رکھتے تھے اور انھیں زیادہ تر گھوڑے پر سوار ہوکر یا لڑھیا یعنی بیل گاڑی پر " تنہا، دو تین خدمت گاروں کے ساتھ نہایت ناتوانی اور کم زوری کی حالت میں، کسی رختِ سفر یا سہولت کے بغیر" سفر کرنا پڑا۔ کان پور پہنچ کر، جہاں انھیں کوئی ڈھنگ کا معالج نہیں ملا، انھوں نے ایک کرائے کی پالکی پر گنگا پار کی اور لکھنو پہنچے۔ یہاں بحالیِ صحت تک انھوں نے کئی مہینے گزارے۔ اودھ کا پایۂ تخت لکھنو خاصی اہمیت کا حامل تہذیبی مرکز تھا۔ یہاں کے اربابِ علم کے لیے غالب بہ حیثیت شاعر غیر معروف ہر گز نہیں تھے۔ اس وقت ان کا مقصد چوٹی کے مراکزِ سرپرستی یعنی حکم راں نواب نصیرالدین حیدر اور ان کے با اثر ترین اراکینِ حکومت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا تھا۔ ان کی یہ کوشش کچھ ایسی کام یاب نہیں رہی۔ وہ نواب کے حضور میں باریاب نہ ہوسکے۔ گو کہ وہ نائب السلطنت آغا میر یا ان کے دستِ

راست سبحان علی خاں کنبوہ کو اپنا طرف دار بنا سکتے تھے لیکن کام یاب نہ ہوئے کیوں کہ انھوں نے ان سے اپنی ملاقات کی دو شرطیں رکھیں : ایک یہ کہ انھیں اس احترام کے ساتھ جس کے وہ مستحق ہیں باقاعدہ تعظیم دی جائے ، دوسرے یہ کہ انھیں رسمی نذر کی پیش کش سے معاف رکھا جائے۔ مربیوں کو ملتجی کی طرف سے شرطوں کا عائد کیا جانا اچھا نہیں لگتا۔ ایسا لگتا ہے کہ نواب سے ملاقات کی کوئی شکل نہ نکلنے کے بعد غالب کو اس مہم سے کوئی خاص دل چسپی نہیں رہی تھی ، انھوں نے نائب السلطنت کے ہاں پیش کرنے کے لیے دستور کے مطابق قصیدہ نہیں بلکہ نثر میں ایک مدحیہ عبارت لکھی تھی۔ یہ واقعہ غالب کی زندگی میں سرپرستانہ امداد کے سرچشموں کی تعظیم و تکریم پر آمادہ کرنے والی ان کی مالی حالت اور ایک شاعر اور طبقۂ امرا کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنی قدر و قیمت پر ان کے اس یقینِ کلی کے درمیان مستقل کش مکش کی بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے جس کی رو سے غلامانہ ذہنیت کا کوئی بھی اظہار ان کے لیے باعث ذلت تھا۔ یہ کش مکش اکثر انھیں اظہارِ احترام میں جھکنے کے تمام مراحل سے گزارتی لیکن لمحۂ آخر میں وہ پھر سیدھے کھڑے ہوجاتے۔

اس زمانے میں جب کہ ان کی زندگی بسر ہوئی وہ تونگروں اور صاحبانِ اختیار کی شان میں قصیدے لکھنے سے احتراز نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن اس طرح کے قصائد ان کی تخلیقی زندگی اور فن کا کم زور ترین پہلو تھے۔ اپنے کلیاتِ فارسی کے مقدمے میں وہ افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی نصف زندگی نادانوں کی مدح سرائی میں ضائع ہوئی۔ اسی وجہ سے ان قصائد کے سراسر مدحیہ اشعار مقابلتاً پھس پھسے ہوتے ہیں جب کہ تشبیب ہمیشہ زوردار ہوتی ہے۔ غالب کو اپنے قصیدے کے ممدوح کے مقابلے میں خود اپنے تفوق کا شدت سے احساس رہتا تھا اور وہ اکثر کنایتاً خود اپنی تعریف کے چند الفاظ قصیدے میں شامل کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ بڑی استادی سے ڈھونڈھ ہی نکالتے تھے۔

لکھنو سے وہ مئی ۱۸۲۷ء میں روانہ ہوئے اور بہ راہ باندا (جہاں کے نواب ذوالفقار علی بہادر ان سے واقف تھے اور جنھوں نے ان کی کچھ مالی اعانت بھی کی تھی) و الہ آباد (جس شہر نے ان پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا) بنارس پہنچے۔ بنارس نے انھیں بے حد متاثر کیا۔ یہاں انھوں نے علاقۂ نورنگ آباد میں واقع ایک کرائے کی حویلی میں تقریباً چار ہفتے

قیام کیا۔ ان نئے مقامات کے تعلق سے جو انھوں نے دیکھے غالب کا پُرجوش ردِ عمل ان کے سچے شوقِ سفر کا آئینہ دار ہے۔ اس کی وجہ سے وہ کسی شہر میں اپنے شخصی تجربے اور معروضی مفہوم میں اس شہر کی قدر و قیمت میں فرق کر پاتے تھے۔ لکھنو میں شاہی سرپرستی کے حصول کی اپنی کوششوں کی ناکامی کے باوجود خود شہر کی تعریف میں وہ بخل سے کام نہیں لیتے۔ وہ لکھتے ہیں:

"لکھنو کا کیا کہنا! وہ، ہندستان کا بغداد تھا۔" (خط بہ نام سیاح ۳۰ / جون ۱۸۶۰ء)۔

دہلی سے رخصت ہونے کے تقریباً ایک سال بعد غالب فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے۔ وہ شہر میں نووارد ضرور تھے لیکن اجنبی نہیں تھے۔ سارے سفر کے دوران تقریباً ہر اہم شہر میں ان کے دوست تھے۔ یہ بہ حیثیت شاعر ان کی بڑھتی ہوئی شہرت کی اور غیر ترقی یافتہ ذرائع ترسیل اور طویل فاصلوں کے باوجود شمالی ہندستان میں جاگیر دار رودادروں کے درمیان روابط کے ایک غیر رسمی نظام کی موجودگی کی شہادت ہے۔ وہ شملہ بازار میں مرزا علی سوداگر کی آرام دہ حویلی میں اقامت پذیر ہوئے جس کا دس روپے ماہانہ کرایہ ان کے ایک دوست راجہ سوہن لال کے ذریعے طے ہوا۔ چند ماہ قبل نواب احمد بخش کا انتقال ہو چکا تھا، چناں چہ کام کو بہ تعجیل سرانجام دینا اور بھی ضروری ہوگیا تھا۔ غالب چیف سکریٹری اینڈریو اسٹرلنگ اور اسسٹنٹ سکریٹری سائمن فریزر کی ملاقات کو گئے۔ ملاقات پُرتپاک تھی۔ معاملہ گورنر جنرل کی کونسل کے سامنے پیش ہوا اور طے ہوا کہ اسے فیصلے کے لیے دہلی میں متعین انگریز ایجنٹ کے ذریعے پیش کیا جانا چاہیے کیوں کہ عمل درآمد کے لحاظ سے متعلقہ عہدہ دار وہی ہے۔ غالب اس کے خلاف نہیں تھے۔ دہلی میں انگریزوں کے ایجنٹ سر ایڈورڈ کول بروک سے ان کی واقفیت تھی۔ غالب بہ ذاتِ خود ڈاک خانے گئے اور وہاں انھوں نے دس روپے خرچ کرکے دہلی میں اپنے وکیل پنڈت ہیرا لال کے نام مختار نامہ اور سبھی دوسرے متعلقہ کاغذات اس ہدایت کے ساتھ بہ ذریعہ ڈاک روانہ کیے کہ وہ کول بروک سے موافق مطلب رائے حاصل کریں۔ کلکتے میں اخراجات کی پابہ جائی کے لیے باندا کے نواب نے مزید کچھ رقم مستعار بھیجی تھی۔ غالب کے ذاتی خدم و حشم میں تین خدمت گار تھے

اور ایک کہار۔ وسائل میں اضافے کے لیے انھوں نے اپنا گھوڑا ڈیڑھ سو روپے میں بیچ دیا اور اپنا بجٹ ماہانہ پچاس روپے مقرر کیا۔ پھر خاصی خوش امیدی کے ساتھ وہ یک سو ہوکر اگلے دور کا انتظار کرنے لگے۔

انتظار کا یہ عرصہ جیسا بھی ہو اہم واقعات سے خالی بالکل نہیں تھا۔ غالب کا قیامِ کلکتہ اس طولانی اور بغض و حسد پر مبنی ادبی مناقشے کے حوالے سے بہ طور خاص قابلِ ذکر ہے جس میں مرکزی حیثیت غالب کو حاصل تھی۔ کلکتے میں ہر ماہ شمسی کے پہلے اتوار کو پابندی سے ایک مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ غالب کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی اور یہاں انھوں نے دو فارسی غزلیں پڑھیں۔ سامعین کی تعداد اچھی خاصی تھی، بہ قول غالب پانچ سو افراد موجود تھے۔ ان میں سے بعض نے غالب کے اشعار میں مستعمل کچھ تراکیبِ الفاظ پر اعتراض کیا اور اپنے دعوے کے ثبوت میں بہ طورِ سند اٹھارویں صدی عیسوی کے مشہور ہندستانی شاعر اور فارسی کے عالم قتیل کا حوالہ دیا۔ غالب بگڑ گئے۔ دہلی میں اپنے ابتدائی دنوں میں انھوں نے اپنے اشعار پر اس تنقید کا کہ یہ ناقابلِ فہم ہیں برا مانا تھا۔ لیکن اب زبان کی غلطی کا الزام، وہ بھی فارسی میں، جس پر عبور کو وہ اپنی امتیازی خصوصیت سمجھتے تھے، ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے فارسی زبان فارسی اساتذہ کے کلام کے مطالعے سے سیکھی تھی۔ اس زبان پر ان کو پورا عبور حاصل تھا اور یہ نتیجہ تھا سال ہا سال کے جفا شعارانہ مطالعے کا۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> "فارسی میں مبدءِ فیاض سے مجھے وہ دست گاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں، جیسے فولاد میں جوہر۔"

چناں چہ ایک ہندستانی شاعر قتیل کی سند کو انھوں نے فوراً مسترد کردیا۔ تیس سال سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی جب یہ موضوع زیرِ بحث آتا ہے تو غالب کے قلم سے آگ برستی ہے، وہ قتیل کو الو کا پٹھا کہنے سے پیچھے نہیں ہٹتے، فارسی میں استناد کا دعویٰ کرنے والے ہندستانیوں کو جھاڑ سناتے ہیں اور انکسار کی کسی ہچ کچاہٹ کے بغیر بالکل واضح کردیتے ہیں کہ گو کہ وہ خود ہندستانی ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ دوسروں کے برخلاف فارسی کی

میزانِ حق و باطل ان کے ہاتھ میں ہے۔

قتیل ایک نو مسلم تھے۔ ان کا اصلی نام دلوالی سنگھ تھا۔ بہ حیثیت ایک عالم کے ان کی بڑی عزت تھی اور ان کے شاگردوں اور مداحوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ غالب نے اپنے نکتہ چینوں کو برہمی کے ساتھ اور خلاف قاعدہ وار کرتے ہوئے یہ جواب دیا کہ میں فرید آباد کے کھتری دلوالی سنگھ کی سند تسلیم نہیں کرتا۔ اس پر برپا ہونے والا ہنگامہ نہ ہی غیر متوقع تھا اور نہ ہی کلکتے تک محدود۔ اپنے ایک خط میں غالب ذکر کرتے ہیں کہ نتیجتاً وقوع پذیر ہونے والے ادبی مناقشے میں ان کی مخالفت میں پیش پیش مولوی کرم حسین بلگرامی، مولوی عبدالقادر رام پوری، پٹنہ کے مولوی نعمت علی اور غالباً لکھنو کے مولوی علی احمد اور وجاہت حسین جیسے اشخاص تھے۔ ان کے حامیوں میں نواب اکبر علی خاں اور سراج الدین احمد خاں جیسے کلکتہ کے پرانے دوست شامل تھے اور خاصی اہم بات یہ کہ کفایت خاں بھی جو ہرات سے بہ عہدۂ سفارت کلکتے میں وارد ہوئے تھے اور جن کی مادری زبان فارسی تھی۔

مناقشہ جب تک جاری رہا اس سے غالب کو شہرت تو ضرور ملی لیکن ایک مرحلے پر پہنچ کر انھوں نے یقیناً اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس طرح کی نام وری دو دھاری تلوار کا بھی کام دے سکتی ہے۔ حلقۂ احباب کو وسعت دینے اور لوگوں کو متاثر کرنے کا مقصد تو اس سے قطعاً پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ غالباً شروع میں بہ حیثیت ایک اہلِ علم قتیل کی قابلیت کے بارے میں غالب کے خیالات اتنے ملامت آمیز یا حتمی نہیں تھے۔ یہ خود ان کی فارسی دانی پر ذرا سی بھی تعریض برداشت نہ کر پانے کی ان کی عادت تھی جس نے انھیں نامناسب وشنام آمیز الفاظ میں اپنے بے ساختہ ردِ عمل کے اظہار پر برانگیختہ کیا تھا۔ بدقسمتی سے اس مناقشے کے بعد راہِ عمل ہمیشہ کے لیے طے ہوگئی اور اپنے ناقدر شناسوں اور بدگویوں کے تعلق سے ان کے دل میں جذبۂ تنفر تازیست برقرار رہا۔ لیکن فی الحال انھوں نے اپنا نقطۂ نظر خاصا واضح کردیا تھا۔ دانش مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ اب مصالحت کرلی جائے تاکہ اس تلخی اور درشتی کا سدباب کیا جاسکے جس سے ان کے، بہ شمول مقدمۂ پنشن، دوسرے مفادات کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ان کے احباب کا بھی یہی مشورہ تھا اور چناں چہ غالب نے ایک معذرت نامہ بہ عنوان "بادِ مخالف" تصنیف کیا۔ لیکن ان کے بہت سے قصائد کی

طرح سے معذرت نامہ کے طور پر لکھی گئی اس مثنوی کے اصل مفہوم کے بارے میں بھی شاید ہی کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے۔ وہ غیر محتاط طرزِ کلام کے لیے معافی کے خواست گار ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے موقف کی معقولیت کے بھی مدعی ہیں۔ وہ اپنے حریفوں کی ایسے مبالغہ آمیز الفاظ میں تعریف کرتے ہیں کہ ان کا طنز کسی سے چھپا نہیں رہتا اور پھر بہ طور اظہارِ امرِ واقعہ کہتے ہیں کہ لوگ انھیں سعدیِ ثانی کہتے ہیں۔ وہ مبالغہ آمیز فروتنی کے رویّے کی مضحک نقل کرتے ہوئے اپنے مخالفین سے ہم دردی کی التجا کرتے ہیں مگر دوسرے ہی لمحے کہتے ہیں کہ وہ معرکہ ٔ کارزار میں کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ آخر میں وہ سب سے صلح صفائی کی پر جوش استدعا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ جن سے انھوں نے معاف کرنے اور بھول جانے کی استدعا کی تھی سوچتے رہے ہوں گے کہ آیا خود انھوں نے بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی معاف کرنے اور بھول جانے کا سلوک کیا ہے یا نہیں۔

ان کی سبھی ادبی سرگرمیاں اتنی متنازع فیہ یا بلند آہنگ نہیں تھیں۔ اپنے دوست نواب سراج الدین کی صلاح سے انھوں نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا ایک مجموعہ "گلِ رعنا" مرتب کیا۔ چھاپہ خانے کی بہ دولت، جو کلکتے میں آچکا تھا لیکن جسے دہلی پہنچنے میں ابھی کئی سال درکار تھے، وہ جدید فارسی اور اردو نثر سے اور ممکن ہے کہ حال میں قائم شدہ فورٹ ولیم کالج کی طرف سے کیے گئے انگریزی ادبیاتِ عالیہ کے تراجم سے بھی واقف ہوچکے تھے۔ کلکتے سے متعدد اخبار شائع ہوتے تھے (اس ادارے کو دہلی آنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا) اور یہیں غالب کو عمر بھر کی اخبار بینی کی عادت پڑی۔ انگریزوں کا دارالحکومت اور برِ صغیر کی سب سے بڑی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے، برطانوی موجودگی کی بہ دولت بہ روئے کار آنے والی تبدیلیوں کے مشاہدے کے لیے دہلی کے مقابلے میں کلکتہ بہ حیثیت مجموعی کہیں زیادہ وسیع اسٹیج فراہم کرتا تھا۔ ان میں سے بعض بالخصوص چھاپہ خانہ، نظامِ لاسلکی، دخانی انجن جیسی جدید ٹکنالوجی کی اختراعات غالب کے ذہن پر ایک دیرپا اثر چھوڑیں گی۔ بہ ظاہر یہ شہر دوسرے روایتی دل بہلاووں میں بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ اسی زمانے میں لکھی ہوئی ایک نظم میں غالب کلکتے کے نفیس بادۂ ناب، اس کے رسیلے میووں، اس کے سبزۂ فراواں اور سب سے بڑھ کر وہاں کی عورتوں کی دل فریبی کی پُر جوش مدح سرائی کرتے ہیں۔

وہاں کے آموں نے ان کو خاص طور سے متاثر کیا۔ ان کا ادعا تھا کہ ثمر ہائے بہشت بھی ان کی خوش بو اور ذائقے کی یاد کو ان کے ذہن سے محو نہیں کرسکتے۔

پنشن کے مقدمے میں، جو ان کے کلکتہ جانے کی اصل وجہ تھا، موافق مطلب فیصلے کے حصول کی ان کی مساعی، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، بارآور نہیں ہوئیں۔ آخری فیصلہ صادر ہونے تک وہ واقعات کے موڑ سے برہم اور دل شکستہ، دہلی واپس جاچکے تھے۔ صریحی طور پر انگریزوں کے تعلق سے ان کے احساسات میں بڑی تلخی تھی:

گفت ایں ماہ پیکراں چہ کس اند؟ گفت خوبانِ کشورِ لندن
گفتم ایناں مگر دلے دارند؟ گفت دارند لیکن از آہن

○○○

(پوچھا ہیں کون سب یہ مہ پیکر کہا لندن کے ہیں یہ سب دل بر
پوچھا: سینے میں ان کے دل ہے کیا؟ کہا: ہے، لیک ہے وہ لوہے کا!)

(ترجمہ: مضطر مجاز)

گو کہ وہ حیرت انگیز مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے اس معاملے کی پیروی کرتے رہے وہ انگریزوں سے کبھی بھی ابتدائی باسٹھ روپے آٹھ آنے سے ایک پیسہ بڑھ کر حاصل نہ کرپائے۔ تاہم ان کی اس امید کو کہ یہ ممکن ہے اور اس سلسلے میں بیس سال سے زیادہ عرصے پر محیط ان کی لگاتار کوششوں کو ان کی زندگی کے ایک اہم رشتہء امید و سعی و ناکامی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے ان کے تصوّرِ زندگی اور دوسروں کے ساتھ تعلقات پر ان مٹ نقش چھوڑا ہے اور ان کی حیات کے کسی بھی مطالعے میں اسے ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

جب غالب کلکتے سے واپس ہوئے تو ان پر چالیس ہزار روپے واجب الادا تھے اور یہ رقم اس زمانے کے لیے بہت بڑی تھی۔ مقدمے کے انجام سے قرض خواہ واقف تھے۔ اس خوش مزاجی اور بے باکی کے ساتھ ان کو ٹال دینا اب ممکن نہ تھا، جس سے کام لیتے ہوئے کلکتہ جانے سے قبل وہ ان سے نبٹے تھے۔ ان کا پیمانہء صبر لب ریز ہوچکا تھا۔ ۱۸۳۵ء میں ان کے خلاف کچھ نہیں تو چار ڈگریاں صادر ہوچکی تھیں۔ غالب کے لیے دو ہی راستے کھلے تھے: یا تو قرض ادا کریں اور یا پھر جیل جائیں۔ ادائگی قرض کا کوئی وسیلہ نہ تھا لیکن خوش

قسمتی سے وہ جیل جانے سے خود کو بچاسکتے تھے کیوں کہ اس زمانے میں نام ور اشخاص، جب تک کہ وہ اپنے مکان کی چار دیواری میں ہوں، حراست سے مستثنیٰ تھے۔ جب تک وہ گھر کے باہر نہ نکلیں محفوظ تھے، لیکن یہ شاید ہی مسئلے کا قابلِ قبول یا مناسب حل تھا۔ چار ماہ تک وہ اپنے ہی گھر میں اس طرح قید رہے کہ باہر قدم رکھنے کی ہمت نہ تھی۔ جیسا کہ خود وہ کہتے ہیں کہ ان کے جیسے مزاج کے آدمی کے لیے یہ اذیت کسی کافر کے دوزخ میں سو سال کے عذاب سے دو چند تھی۔

ایسا لگتا ہے کہ ایک موقع پر عدالت میں ان کی بہ ذاتِ خود حاضری ناگزیر تھی۔ مفتی صدرالدین آزردہ صدر نشینِ عدالت تھے۔ انھوں نے غالب سے دریافت کیا کہ آیا انھیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے۔ اس پر غالب نے اپنا مشہور شعر پڑھ کر سنایا:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

آزردہ مسکرائے، مقدمے کا فیصلہ غالب کے خلاف صادر کیا اور واجب الادارقم اپنی جیب سے سرکاری خزانے میں داخل کی۔

لیکن دراصل دیکھا جائے تو اس صورتِ حال سے شاعر کو پہنچنے والے صدمے کو نہ تو اس کی طنز آمیز ظرافت کم کر سکتی تھی اور نہ ہی آزردہ کی کریم النفسی۔ پنشن کے مقدمے میں ناکامی کا مطلب تھا مالی نقصان۔ یہ بدقسمتی کی بات تھی لیکن برداشت کے باہر نہیں تھی، یہ نازک وقت بھی گزر ہی جائے گا، اور کوئی چیز رہن رکھ دی جائے گی، نئے ساہو کار مل جائیں گے۔ اس کے علاوہ وہ کوئی واحد نادار مرزا صاحب تو تھے نہیں، یہ تو طبقۂ امرا کی ابتری کا زمانہ ہی تھا۔ دراصل جو بات ناقابلِ برداشت تھی وہ تھا وہ دھکا جو ان کے وقار کو پہنچا تھا، ممتاز امیر زادہ غالب کی درخواست کسی بھی عامی کی عرضی کی طرح سے ان ہی لوگوں نے نامنظور کی تھی جن سے دوستی اور بے تکلفی کا اسے بڑا دعویٰ تھا۔ ان کی نظر میں اس امیر زادے کی قدر و قیمت اب سب پر ظاہر ہو چکی تھی۔ یہ حقیقت اب سامنے آچکی تھی کہ اس کے پاس وہ اثر و رسوخ تھا نہ مطلوبہ روابط اور نہ ہی اس کی انگریزوں کے ساتھ ایسی بے تکلفی تھی جو لوگوں کو سماج میں اس کی وقعت کا احساس دلاسکتی۔ یہ ادعا کہ نئے حاکم انگریز،

سماج میں اس کے رتبے کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی ضروریات کے تعلق سے مثبت نقطہ نظر رکھتے تھے، ایک خیالی افسانہ تھا جو اس نے بڑے جتن سے گڑھا تھا۔ اس خیالی افسانے کا پول اب کھل چکا تھا۔ اس سے بد تر یہ کہ اس کے حریف نواب شمس الدین نے ثابت کردیا تھا کہ ان کا دعویٰ استحقاق انگریزوں کی نظر میں زیادہ معتبر تھا۔ اس طرح سے پنشن کے مقدمے میں ناکامی معاشرے میں وقعت کھودینے کے بھی مرادف تھی۔ غالب کی ساری دوڑ دھوپ کے تعلق سے انگریز کی بے اعتنائی نے انھیں خود اپنے ہم سروں کی نظر میں ذلیل کردیا تھا۔ اس نے ان کی انا کو بری طرح چوٹ پہنچائی تھی۔ برہمی اور دل شکستگی کے اس عالم میں انھوں نے طے کیا کہ اپنے ہم سروں کی صحبت سے احتراز کرتے ہوئے خود کو اپنی ذات میں محدود کرلیں گے، کیوں کہ ان میں سے بہتیرے انھیں اپنے برتاؤ اور بے ڈھنگی گفتگو سے ان کی ہزیمت کو یاد دلانے سے چوکتے نہیں تھے۔

۱۸۳۵ء میں غالب کے مخالف نواب شمس الدین کو دہلی میں برطانوی رزیڈنٹ ولیم فریزر کے قتل کی سازش کے الزام میں برسرِ عام پھانسی دی گئی۔ یہ دہلی میں ۱۸۵۷ء سے قبل کا انتہائی سنسنی خیز واقعہ تھا۔ فریزر کو ۲۲ / مارچ ۱۸۳۵ء کو اس وقت گولی مار کر ہلاک کردیا گیا تھا جب وہ راجہ کشن گڑھ کی کوٹھی میں منعقدہ ایک دعوت سے واپس آرہا تھا۔ قاتل کریم خاں کا سراغ لگا لیا گیا اور اس نے اقرار کیا کہ شمس الدین نے اسے معاوضہ دے کر اس کام کو سرانجام دینے پر مقرر کیا تھا۔ خاندانی نزاع میں فریزر شمس الدین خاں کے سوتیلے بھائیوں کا طرف دار تھا۔ شمس الدین خاں کے لیے فریزر کو بے دردی سے ختم کرنے کی وجہِ تحریک صاف تھی۔ ظاہر ہے کہ ان ڈرامائی واقعات سے غالب کو بھی گہرا تعلقِ خاطر تھا۔ ولیم فریزر ایک اچھا دوست تھا جب کہ شمس الدین ان کے پرانے دشمن تھے۔ پنشن کے مقدمے کے بعد انگریزوں سے ان کی ناراضگی نے انھیں انگریزوں کی دوستی کا کوشاں ہونے کی اہمیت سے غافل نہیں بنایا تھا بہ شرطیکہ وہ قابلِ رسائی ہوں۔ بادی النظر میں فریزر کے قتل پر ان کا رنج و ملال سچا دکھائی دیتا ہے۔ اسی زمانے میں تحریر شدہ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ اس قتل سے میرے لیے باپ کی موت کا غم تازہ ہوگیا، دل بے قابو ہو گیا اور میرے خیال وہ حال پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ اگر مبالغے کو نظر انداز بھی کریں

تو صاحب بہادر جیسے اہم سرپرست سے محروم ہو جانے پر ان کی غم گینی کا اندازہ لگایا ہی جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تحقیقات میں جو شمس الدین خاں کی گرفتاری کا باعث ہوئیں غالب بھی شریک تھے۔ انھوں نے ایک خط میں اس کا صریحاً اعتراف بھی کیا ہے جس میں وہ ذکر کرتے ہیں کہ شہر کا مجسٹریٹ ان سے واقف تھا اور واقعہ کی حقیقت حال تک پہنچنے اور قاتل کو رنگے ہاتھوں پکڑنے میں اس نے ان سے بھی مدد لی تھی۔ صورتِ حال کا یہ پہلو باشندگانِ دہلی سے، جن کی وفاداریاں شمس الدین خاں کے ساتھ تھیں، چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ شمس الدین خاں معصوم ہیں، انھیں سازش کا شکار بنایا گیا ہے اور دامِ فریب میں پھانسا گیا ہے۔ بہتیروں کی نظر میں ان کی حیثیت ایک شہید کی تھی۔ چناں چہ تعجب کی بات نہیں کہ شمس الدین خاں کی گرفتاری میں حکّام سے ملی بھگت کے شبہ میں غالب کو بڑی لعنت ملامت کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی مقبولیت اور شہرتِ عامّہ بے حد متاثر ہوئی۔

شمس الدین خاں کی گرفتاری اور انھیں پھانسی دینے پر عام برہمی اس فی الوقت ابتدائی ہل چل کی نشان دہی کرتی ہے جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں منتج ہوگی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو زیادہ گہرے مطالعے کا سزاوار ہے۔ بلاشبہ غالب کو کاسہ لیسی کا الزام دینا بے انصافی ہوگی۔ ان کا ردِّ عمل شمس الدین خاں سے دشمنی اور فریزر سے دوستی کے محدود چوکھٹے پر مبنی تھا۔ مخالف انگریز سیاق و سباق میں قوم پرستی کو ابھی ایک متاثر کن عامل کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ بہ ہر حال اس سارے واقعے سے انھیں نقصان کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آیا، فریزر کی موت کے ساتھ انھوں نے ایک کارآمد دوست کھودیا اور اپنے ہندستانی بھائیوں کی لعنت ملامت کے شکار الگ بنے اور فائدہ خاک نہ ہوا۔ گوکہ شمس الدین خاں کی جاگیر ضبط ہوجانے کے نتیجے میں اب انھیں پنشن راست انگریزوں کے خزانے سے ملنے لگی تھی، اس کی رقم کے اضافے کے لیے ان کی تمام مساعی ناکام ہی رہیں۔

پنشن کے مقدمے اور شمس الدین خاں کے واقعے کا ناخوش گوار نتیجہ یہ نکلا کہ غالب زیادہ تر خانہ نشین رہنے لگے۔ ان کی بیوی ایک نہایت راسخ العقیدہ خاتون تھیں، غالباً ناخواندہ تھیں اور یقیناً اس قبیل کی نہیں تھیں کہ ان کے آزاد خیال طرزِ زندگی اور آئے

دن کی بے راہ رویوں کو نظرِ کرم سے دیکھیں۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنی معمول کی عبادات ا روزوں میں اتنی مشغول رہتی تھیں کہ غالب نے اپنے گھر کو مذاق میں مسجدِ فتح پوری کا نـ دے دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس لحاظ سے ان دونوں کے درمیان بہت نمایاں فر تھا کیوں کہ مذہبی رسوم کے تعلق سے بے اعتنائی میں غالب بھی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ ا وجہ سے بہ قول حالی بے چاری اپنے کھانے پینے کے برتن شوہر کے استعمال کے برتنوں سـ الگ رکھتی تھیں۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی، سات بچّے پیدا ہوئے لیکن کوئی بھی سوا سا سے زیادہ نہ جیا۔ اپنے ایک خط میں غالب اس کا سرسری ذکر کرتے ہیں، لیکن اس سے پید ہونے والے گہرے خلا اور احساسِ محرومی کو گھٹا کر دکھانا ممکن نہیں۔ اپنی بیوی سے ہم خیال کا فقدان اس زمانے کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ مرد تعلیم یافتہ اور دنیا کـ مسائل کے ہم قدم ہوتے تھے، جب کہ عورتوں کو جو زیادہ تر ناخواندہ، پردہ نشین اور گھر کی چا دیواری کے باہر قدم نہ رکھنے والی ہوتیں، بندھی ٹکی تعریف کے بالکل مطابق تنگ نظر او صرف فضول گپ بازی اور خانہ داری کے دنیوی مسائل سے علاقہ رکھنے والا سمجھا جاتا۔ اس فاصلِ آب کے درمیان بچے پُل کا کام دیتے۔ ان کی غیر موجودگی سے اس امید اور تسکین کی نـ کنی ہوتی تھی جو روایات کی رو سے گھر بار اور رشتۂ ازدواج سے حاصل ہوتی تھی۔

غالب کے خطوط میں رشتۂ ازدواج کے ذکر سے ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ اسے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ سمجھتے تھے۔ بہتیرے دوستوں کو ان کا مشورہ یہ تھا کہ "پیو، کھاؤ مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔" وہ دوسروں کے ملاحظے میں سراہتے ہوئے یہ پرانا قول پیش کرتے تھے کہ آدمی کو دو باتوں سے احتراز کرنا چاہیے، ایک تو شادی سے چاہے دلہن شاہ زادی ہی کیوں نہ ہو اور دوسرے قرض لینے سے، چاہے اسے چکانے کی مدت قیامت تک ہی کیوں نہ ہو۔

ایک مشہور خط میں جس میں وہ اپنی زندگی کے اہم واقعات کا خلاصہ علامتی طرز میں بیان کرتے ہیں وہ اپنی شادی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "ساتویں رجب ۱۲۲۵ ہجری کو میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی۔۔۔"

ایک اور دوست کی غالباً دوسری بیوی کی موت پر غالب اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہیں:

> " امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے!"

ہمیں غالب کی ان باتوں کے ضرورت سے زیادہ لفظی معنی مراد نہیں لینے چاہییں، ان کی اس طرح کی رائے زنی بیش تر استہزائیہ ہوتی تھی، رشتۂ ازدواج کے تعلق سے مردوں کی روایتی ناپسندیدگی کا ایک جزو تھی اور سنجیدہ شکایت سے زیادہ اسلوبِ بیان اور طرزِ ادا کی غرض سے کی جاتی تھی۔ " اگر وہ اپنی اس شکایت کے تعلق سے سنجیدہ ہوتے کہ ان کی شادی سزائے حبسِ دوام تھی تو ہم اسے اہانت آمیز اور غلط قرار دیتے۔ لیکن ان کے خطوط دل آویز غلط بیانیوں سے بھرے ہوئے محض خوش بیانی کے نمونے ہیں۔" اس میں شک نہیں کہ بیڑیاں تکلیف ضرور دیتی تھیں لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ وہ ان کے عادی ہوگئے۔ بیوی کے ساتھ ہم خیالی کے فقدان کی وجہ سے ازدواجی رابطے میں کم زوری ضرور آئی لیکن وہ نیست و نابود نہیں ہوا۔ ساری عمر اکٹھا بسر کرتے ہوئے امراو بیگم اور غالب نے اپنے اختلافات سے سمجھوتا کرلیا اور وقت کی رو میں ایک ساتھ بہنے پر راضی ہوگئے۔ تاہل کی زندگی کے لیے ایسا موڑ زمانے سے بالکل غیر ہم آہنگ بھی نہیں تھا اور ان حدود کے اندر اس امر کی شہادت ہے کہ میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کی عزت اور لحاظ کرنے کا مقدور رکھتے تھے۔ دن میں کسی نہ کسی وقت غالب ہمیشہ کچھ وقت زنانے میں امراؤ بیگم کے ساتھ گزارتے اور اپنی طرف سے، اپنے مذہبی معمولات کے باوجود بیوی اپنے شوہر کی ضروریات کا خیال رکھنے سے کبھی نہ چوکتیں۔ غالب ویسے گھر بار کی ذمہ داریوں سے غافل رندِ خوش باش بھی نہیں تھے جیسا کہ وہ خود کو ظاہر کرنا پسند کرتے ہیں۔ ڈومنی والا معاشقہ شاید اس طرح کا آخری واقعہ تھا۔ علائقِ دنیوی کا بوجھ، بالخصوص مالی دشواریوں کے وقت، ان کو ناگوار ضرور گزرتا تھا، لیکن یہ غیر قرینِ قیاس ہے کہ انھوں نے ایک صاحبِ اہل و عیال کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے پیچھا چھڑانے کے بارے میں کبھی سوچا بھی ہو۔ اس

کے برعکس وہ اپنی حلقہ بگوشی میں اضافے پر خوش تھے۔ اپنی اولاد نہ ہونے کے پیش نظر انھوں نے اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں کو اپنا منھ بولا بیٹا بنالیا تھا۔ تبنیت کی تاریخ کا علم نہیں لیکن یہ علم ہے کہ غالب ان کو بہت چاہتے تھے۔ زین العابدین خاں اچھے شاعر تھے اور انھوں نے "عارف" تخلص اختیار کیا تھا۔ وہ غالب کے لیے مستقل فخر و مباہات کا سرچشمہ تھے۔ عارف، ان کی بیوی اور ان کے دو بچے غالب ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ غالب کے خطوط سے ان بال بچوں کے ساتھ ان کے تعلقِ خاطر کی کافی شہادت دست یاب ہے۔ عارف کے دو بیٹے، باقر علی اور حسین علی، بالخصوص ان پر جان دینے والے دادا کا مرکزِ توجہ تھے۔ فی الحقیقت بچوں سے غالب کی محبت ان کی سیرت کا نہایت دل پذیر پہلو ہے جس سے لوگ کم ہی واقف ہیں۔ ان کے بہتیرے دوستوں کی آل اولاد کے لیے وہ "چچا" تھے اور یہ چچا حضرت ان بچوں کی خیریت دریافت کرنا کبھی نہیں بھولتے تھے۔ مثال کے طور پر یہاں ہم ایسے ہی ایک دوست کے نام خط کا ایک دل چسپ اقتباس پیش کرتے ہیں:

"میرا بھتیجا اور پیاری بھتیجی کس طرح ہے۔ پہلے خط سے معلوم ہوا تھا کہ وہ دوات قلم لے کر الگ بیٹھتی ہے اور مجھ کو خط لکھا کرتی ہے اور جب لڑتی ہے تو کہتی ہے کہ میں مرزا صاحب کے ہاں چلی جاؤں گی۔ اب آپ اس سے مرزا صاحب کہنا موقوف کروایئے، اس سے مجھ کو چچا کہلوایا کیجیے۔"

۱۸۵۲ء میں عارف کی پینتیس سال کی کم عمری میں بے وقت موت غالب کے لیے ایک صدمۂ عظیم تھی۔ اس موقع پر غالب نے جو نوحہ لکھا اسے اپنے بیٹے کی موت پر ایک باپ کے کربِ روحانی کی ایک انتہائی دردناک شہادت کی حیثیت حاصل رہے گی:

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

عارف کی بیوی کا شوہر سے چند ماہ قبل ہی انتقال ہو چکا تھا ، وہ بھی غالباً اسی جان لیوا مرض تپِ دق کا نشانہ بنیں جس نے ان کے شوہر کی جان لی تھی ۔ ایک سال بعد غالب کی ایک پھوپھی کا انتقال ہوا جن سے انھیں بہ ظاہر بہت گہرا دلی تعلق تھا ۔ انھوں نے ہمیشہ غالب کا ایک بیٹے کی طرح خیال رکھا تھا اور غالب بچپن ہی سے انھیں ماں کے برابر سمجھتے تھے ۔ اس کی بھی شہادت ہے کہ شفقت کے علاوہ ان سے غالب کو مالی امداد بھی ملتی تھی ۔ غالب لکھتے ہیں :

" ان کی موت کے ساتھ یوں سمجھو کہ میں بہ یک وقت
اپنے باپ ، دادا ، تین چچاؤں اور تین پھوپھیوں سے محروم ہو گیا ۔"

شخصی زندگی میں غالب کے تعلقات خاطر ، جیسا کہ اس زمانے میں عام قاعدہ تھا ، ان کے اپنے مرکزی کنبے تک محدود نہیں تھے ۔ مشترک خاندان کے لیے مخصوص دلی تعلقات اور ذمہ داریوں کے پے چیدہ رشتوں کو مسلمہ طرزِ زندگی کی حیثیت حاصل تھی ۔ غالب کو اپنی تاہل کی زندگی سے ناخوش ، لاولد ، کسی سے کوئی تعلقِ خاطر نہ رکھنے والا اور غم و اندوہ سے مجبور ہو کر تنہائی اختیار کرنے والا گوشہ نشین تصور کرنا ایک مغالطہ ہو گا ۔ بہ حیثیت شاعر ان کی تنہائی اپنی جگہ پر لیکن ان کی روز مرہ کی زندگی میں ایک وسیع تر خاندان کے متصادم تعلقات کا اژدہام رہتا تھا ۔ شادمانی اور المیہ دونوں کا ورود ہوتا تھا لیکن چوں کہ نظمِ زندگی حصہ داری کا تھا تو اس سے مسرت کی تاثیر میں اگر اضافہ نہیں تو رنج و الم کا صدمہ کم ضرور ہوتا تھا اور اس صدمے سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت ملتی تھی ۔ غالب نے عارف کے بچوں کو اپنا کر خود کو سنبھالا اور بہ حیثیت ایک صاحبِ اہل و عیال اپنی زندگی کا ازسرِ نو آغاز کیا ۔ بڑا لڑکا باقر علی جو اپنے باپ کے انتقال کے وقت صرف پانچ سال کا تھا غالباً بعد میں جا کر والدۂ عارف کے ساتھ رہنے لگا لیکن باقر سے تین سال چھوٹا حسین علی اول تا آخر غالب ہی کے ساتھ رہا ۔ یہ لڑکے غالب کی آنکھ کا نور تھے اور ان کی شوخیوں اور اٹکھیلیوں سے ان کے گھر کی رونق بڑھتی تھی ۔ اپنے ایک خط میں وہ شکایت کرتے ہیں کہ " مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے ، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے ، ننگے تنگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں ، کہیں پانی لڑھاتے ہیں ، کہیں خاک اڑاتے ہیں ۔" لیکن یہ سب وہ بہ خوشی برداشت کرتے تھے ۔

زیادہ تر سوانح نگاروں کا رجحان غالب کی گھریلو زندگی کی سراسر ویرانی کی تصویر کشی کی طرف ہے۔ حقائق سے عدم توافق کے علاوہ ایسی تصویر فلسفی اور شاعر غالب کی مبارز طلبانہ اور زندہ دلانہ رواقیت سے بھی انصاف نہیں کرتی۔ انھوں نے ایک موقع پر لکھا تھا:

در جنوں بے کار نتواں زیستن آتشِ تیز ست و داماں می زنم
می ستیزم باقضا از دیر باز خویش را بر تیغِ عریاں می زنم
لعب با شمشیر و خنجر می کنم بوسہ بر ساطور و پیکاں می زنم

(اگر آگ تیز ہو تو میں اسے اور بھڑکاتا ہوں، میں موت سے لڑتا ہوں، میں بے نیام تلواروں پر ٹوٹ پڑتا ہوں، میں خنجروں سے کھیلتا ہوں اور تیروں کے بوسے لیتا ہوں)۔

مصیبت کو قادرِ مطلق کے محیطِ کل ہونے کا محض ایک پہلو سمجھ کر اسے بہ خوشی قبول کرنے سے ان کو ذاتی نقصان اور محرومیوں کو " روحانی تکلیف کی پر مسرت آب و تاب کے ادراک " میں قلبِ ماہیت کی طاقت ملتی تھی۔ نتیجہ تھا ایک مکمل فلسفیانہ تصورِ زندگی جو واضح تناسب میں مشیتِ الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے اور اسے قبول کرنے کے عناصر پر مشتمل تھا۔ یہ تصورِ زندگی خود کو ایک صحت مند حسِّ مزاح میں آشکار کرتا تھا۔ جہاں دوسرے ہتھیار ڈال دیتے تھے ہمارا شاعر سبقت لے جاتا تھا:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

انسانی صورتِ حال کا اپنا کرب و انبساط تھا، نشیب و فراز تھے، ہجر و وصال اور اس کے مسرت و افسردگی کے لمحات تھے لیکن اس کے تمام پہلوؤں میں ایک ایسا خلقی اہتزاز تھا جس کے صرف بے حس ہی منکر ہوسکتے تھے۔ غالب نے تجربے کے عمل ہی کو بہ ذاتِ خود ایک وجودیاتی مقصد کی بلندی عطا کی جس سے درد و غم کے وجود کے علی الرغم لطف اندوز ہونا چاہیے۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہوجائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

غالب کا خیال تھا کہ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی فتح مند ذوقِ حیات ہی کو

ہونا چاہیے اور اگر انسان کے ظرف میں زندگی کی گوناگونی کو قبول کرنے کے لیے وسعت کافی نہیں ہے تو گنجائش کی تلافی کے لیے اسے اپنی قوتِ احساس کو بڑھانا چاہیے اور یہی وہ ذہنی کیفیت تھی جس نے انھیں پیرانہ سالی میں بھی مختلف بیماریوں کے باوجود اپنے ادبی مشاغل کو جاری رکھنے کا حوصلہ دیا۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اس مفہوم میں غالب "شوق" یا آرزو مندی کی اصطلاح کے معنی کو ایک نئی آب و تاب اور زندگی کے تقاضوں سے نئی مناسبت عطا کرتے ہیں۔ ذوق و شوق اور آرزو مندی کا مطلب ہے تجربے کے جواز کا اقرار، تجربے سے اپنے کو الگ تھلگ رکھنا اس کی نفی کے مرادف ہے:

نشہ رنگ سے ہے واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

یہ ضروری نہیں کہ ذوق و شوق، آرزو اور تمنا کارگر بھی ہو۔ یہ تو بہ ذاتِ خود ایک مقصد ہے:

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

اور جب کسی منشا و مقصد کے بغیر شمولیت کا عزم کر ہی لیا تو محبت کے جواب میں محبت، تکمیلِ تمنا، دنیوی مظاہر کی ناپائداری جیسے قابلِ لحاظ امور ہر تجربے میں مضمر انبساط اور صلے دونوں کے امکان پر اثر انداز تو ہوسکتے ہیں لیکن اسے محدود نہیں کر سکتے:

نہیں نگار کو الفت، نہ ہو، نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

غالب کے زبان زدِ عام حسبِ ذیل شعر کو اس سیاق و سباق میں بہتر سمجھا جاسکتا ہے:

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا، مرے آگے

یہ سیدھا سادا نظریہء لذتیت نہیں ہے اور نہ ہی تنگ نظری سے کی جانے والی بعض تشریحوں کے باوجود، یہ اوباشی کو بڑھاوا دینا ہے۔ شعر کا موضوع لذت پسندانہ فنائیت نہیں بلکہ تجربے کی زندگی کے تقاضوں سے خداداد مناسبت ہے۔ یہ ہر حالت میں تجربہء زندگی کے جواز کا ادعا ہے اور چناں چہ اس رنج و الم اور صدمے کے باوجود جو اس کا ایک جزو لاینفک ہے، اس سے لطف اندوز ہونے کے حوصلے کا اعلان ہے۔ جیسا کہ انھوں نے ایک موقع پر لکھا اس دنیا کی مصیبتوں کا شکار ہونا خود شرافتِ نفس کی شہادت ہے۔ غالب خانقاہ نشین کے کنجِ عزلت کے قائل نہ تھے۔ زندگی کے گوناگوں مظاہر کے رنگ اور نظارے سے خود کو الگ تھلگ رکھنے کے لیے دیواریں تعمیر کرنے کی بہ جائے وہ دکھ درد کو دعوت دینا کہیں بہتر سمجھتے تھے:

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو، مژہ گر خوں چکاں نہیں

یا پھر

ہے تنگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

بے شک دکھ درد کو سوچ سمجھ کر قبول کرنے سے رنج و الم اور جدائی یا ہر روز کی جنگ و جدال کی تکان اور مایوسی کی شدت میں کمی تو آ سکتی تھی لیکن ان سے کلیتہً چھٹکارا نہیں مل سکتا تھا۔ بہ حیثیت شاعر غالب نے ان کی شدت میں سو گنا اضافہ کرکے، انھیں موضوعی رنگ دے دیا تھا اور وہ اپنے کرب کو بے ساختہ سادگی کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنا سکتے تھے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

•

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

اس زہر کا توڑ تھا فلسفے کا سہارا، جس کی طرف ان کا میلانِ طبع عمر کے کافی ابتدائی دور ہی سے تھا۔ کم سنی ہی میں ان کے پسندیدہ شعرا بے دل اور ناصر علی تھے جن کا کلام پے چیدہ اور مبہم مابعد

الطبیعیاتی غور و فکر سے مملو تھا۔ آگے چل کر وہ وجودِ حقیقی کی ماہیت، وحدت الوہیت یا دینوی مظاہر کی حقیقت جیسے مابعد الطبیعیاتی مسائل پر گرما گرم مباحث سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ان کی تحریروں سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اکثر ان کو بھی ان مناقشوں میں خواہی نہ خواہی گھسیٹ لیا جاتا تھا۔ لیکن بہ ظاہر، فلسفیانہ غور و فکر کے مختلف دبستانوں کے ابتدائی اصولوں سے بہت اچھی واقفیت کے باوجود، انھیں لاحاصل علمی مباحث پسند نہیں تھے اور دینیات کے ان عالموں کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں تھی جو ساری عمر ان مسائل کے تعلق سے بال کی کھال نکالنے میں صرف کردیتے تھے۔ ایک فارسی شعر میں وہ ازراہِ طنز و تعریض لکھتے ہیں:

برآر از بزمِ بحث اے جذبہء توحید غالب را

کہ تُرکِ سادہء ما بافقیہاں بر نہ می آید

(اے جذبہء توحید غالب کو بحث مباحثے کی بزم سے باہر نکال، کیوں کہ ہمارا تُرک سادہ فقیہوں سے عہدہ برا نہیں ہوسکتا)۔ ساری عمر انھوں نے وسیع المشربانہ صاف دلی کو ترک نہیں کیا اور فخر کے ساتھ اس کا اقرار کرتے تھے۔ بحث سے باخبر ہوتے ہوئے وہ اپنی تلاش کو کسی ایک فرقے یا گروہ کے عقائد تک محدود رکھنا یا کسی ایک شخص کو اپنا مرشدِ روحانی مان کر اس تلاش سے متعلق اپنے سوالات کو منجمد ہونے دینا نہیں چاہتے تھے:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

ایسا لگتا ہے کہ مسلمہ منزلِ مقصود کا محدود تصور نہیں بلکہ نئے آفاق کی فرحت اور پہلے سے طے شدہ جواب نہیں بلکہ چھان بین ان کی فلسفیانہ جستجو کے رہنمایانہ اصول تھے۔ چناں چہ جیسا کہ توقع کی جاسکتی ہے ان پر اکثر تشکیک کا نرغہ ہوتا تھا اور یہ اکثر اپنے زمانے سے کہیں آگے کے تصورات پر مشتمل ان کے بعض بہترین اشعار کی وجہ تحریک ہے۔ اگر ظاہر حقیقت نہیں ہے اور اس کے باوجود حقیقت ظاہر میں عیاں ہے تو پھر عقیدے کی متضاد حدود میں توافق کے ساتھ ساتھ یقینِ کلی کی ایک راہِ مستقیم کا تعین کیسے کیا جائے؟ اگر دنیا خدائے برتر کے فضل و کمال کے اظہار کی ایک بازی گاہ ہے تو پھر ایک فردِ بشر اپنے دکھ درد اور رنج و غم کی ناموافقت سے کیسے عہدہ برا ہو؟ اگر اس کی وحدت واحد حقیقت ہے

تو اس الجھاؤ میں ڈالنے والی کثرت کی کیا ضرورت ہے؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یا پھر کسی قدر مختلف رنگ میں:

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اس کے باوجود شک اور سوال زور پکڑ کر مایوسی میں کبھی متبدل نہیں ہوئے۔ ان سے فہم و ادراک سے خدائے برتر کی ازلی دل کش ماورائیت کے سامنے اور پریشان کن انسانی صورت حال کے ابعاد کی سنگینی پر شاعر کے تقریباً بچوں کے سے استعجاب و تحیّر میں بس اور اضافہ ہوتا تھا۔ نیز ہر بے جواب سوال پر ماتما کے قدموں میں، اس کی لیلا کے ایک اور اظہار اور اس کی خوش تدبیری کے سامنے عقلِ انسانی کی نارسائی کی ایک اور نشانی کی حیثیت سے بھی ڈالا جاسکتا تھا:

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

•

بر کمالِ تو در اندازہ کمالِ تو محیط
بر وجودِ تو در اندیشہ وجودِ تو دلیل

(فہم و ادراک میں) تیرے کمال پر تیرا کمال ہی محیط ہے اور عقل و فہم میں تیرا وجود ہی

تیرے وجود کی دلیل ہے)۔ روحانی اخذ و قبول کی اس صلاحیت کی بہ دولت غالب ایک شخصی فلسفیانہ بصیرت کی تشکیل کے لیے عناصر کا صحیح ذوق اور احتیاط سے انتخاب کرسکتے تھے۔ ایک سطح پر وہ حقیقت حقّہ کے ماسوا ہر شے کے عدم وجود کے ویدانتی ادّعا کے ذریعے خود کو دنیوی تجربے سے علاحدہ بھی کرسکتے تھے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقہ ٔ دامِ خیال ہے
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا

•

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

•

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

دوسری سطح پر وہ کائنات کے ہر پہلو کو الوہیت کا رنگ دے سکتے تھے، ہر ذرے میں خدائے برتر کے فضل و کرم کا جلوہ بھی دیکھ سکتے تھے اور دلیل بھی:

ہے وہی بد مستیِ ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

یا پھر جیسا کہ وہ ایک فارسی شعر میں کہتے ہیں:

سراغِ وحدتِ ذاتش تواں زکثرت جست
کہ سائرَ ست در اعداِ بے شمار یکے

(اس کی وحدت کا سراغ کثرت سے مل سکتا ہے، بے شمار اعداد کے لیے مشترک ایک کا مدد ہے)۔ یہی سرچشمہ تھا ہستیِ واجب الوجود کے بارے میں ان کے اس خیال کا کہ وہ

رحمتِ مجسم ہے، سورج کی حیات بخش شعاعوں کی طرح، جن کی تابانی انفرادی انا کی نا استواری اور کش مکش کو بے حقیقت بنادیتی ہے:

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

●

ہے تجلی تیرا سامانِ وجود　　ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

ایسی صورت میں خدا مندر میں ایستادہ بت میں مل سکتا ہے اور نہ مسجد میں اظہارِ عقیدت و عبادت کے ذریعے۔ تقلید پسند اس بات کے درپے تھے کہ الوہیت کو مذہبی رسوم و معمولات، حق و باطل، گناہ اور جزا کے تنگ دائرے میں محفوظ کرلیں۔ غالب کا تصورِ اخلاقیات خدائے برتر کی رحمت کے بارے میں ان کے متوازن اور اعلیٰ و برتر نظریے کی بہ دولت ان بندشوں سے آزاد تھا:

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے　　شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مذہبی اور ناصحانہ مفہوم میں حق و باطل فہمِ انسانی کی تفریق پسندی کی پیداوار تھے۔ لیکن خدائے برتر نے دنیا کی تخلیق اس لیے کی تھی کہ انسان اس سے لطف اندوز ہو۔ سچی روحانیت کے حامی تنگ نظری پر مبنی ایسی زمرہ بندیوں کو خاطر میں نہیں لاسکتے تھے اور چناں چہ غالب رسمی اخلاقیات، بالخصوص اس سے جو تقلید پسندوں کے مفاد میں ہے، اپنی بے زاری کا برملا اظہار کرتے ہیں:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

●

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یہاں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ اس طرح کے بیانات حظِ نفس اور عیاشی میں بغیر سوچے سمجھے مست رہنے کی دعوت نہیں تھے۔ ان لوگوں کو جو اس طرح کی باتوں کے ضرورت سے زیادہ

لفظی معنی مراد لینے کی طرف میلان رکھتے تھے غالب ان الفاظ میں متنبہ کرتے ہیں:

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی   ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

آزادیِ اخلاق غالب کے لیے ایک ایسا موقف تھا جو وسیع تر مفہوم میں مسرت کے اس شاعرانہ اور فلسفیانہ ادراک سے جڑا ہوا تھا جس کی رو سے تخلیق کا اصل اصول یہی ہے اور یہ خیال اپنشد کے اس اشلوک سے بھی بڑی حد تک ہم آہنگ ہے:

"جہاں مسرت ہے وہاں تخلیق ہے۔ جہاں مسرّت کا فقدان
ہے وہاں تخلیق کا بھی فقدان ہے۔ مسرت کی ماہیت کو سمجھو۔"

ایسی مسرت لازوال قدروقیمت کی حامل صرف عارضی مظاہر کے پس پردہ ذاتِ حقیقی کے ادراک ہی میں ہوسکتی ہے۔ اپنے مختلف اشعار میں غالب دل کش اور حیرت انگیز صراحت کے ساتھ اس ادراک کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں:

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

س موضوع کی طرف وہ اپنے کلیاتِ فارسی میں بھی رجوع کرتے ہیں:

قطرہ و موج و کف و گرداب جیحو نست و بس
ایں من و مائی کہ می بالد حجابے بیش نست

قطرہ، موج، جھاگ اور بھنور، سبھی دریا کے مختلف پہلو ہیں۔ "میں" اور "میرا" کی یہ ف زنی ایک حجاب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی)۔ اس ادراک کی روشنی میں غالب اتِ مطلق کے وجود کا اعلان بالکل واضح الفاظ میں کرتے ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا! کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے! نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟

نفرادی انا کی نفی اور خدائے برتر کے محیطِ کل ہونے کے پیشِ نظر اس کی کلیتہً بے حاصلی ا ادعا، حد سے زیادہ سادگی کی سطح پر، غالب جیسے بے حد حساس انا رکھنے والے شخص کے لیے، بادی النظر میں ایک ایسی بات دکھائی دیتی ہے جس میں تضاد بھی ہے اور جس میں ریا اری کا عنصر بھی شامل ہے۔ لیکن اس سے محض غالب کی اس پیچیدہ شخصیت کا امتیازی

خاصہّ ہمارے سامنے آتا ہے جو اگر ایک سطح پر اعلیٰ و ارفع روحانیت کی علم بردار تھی تو دوسری سطح پر ارضی و بشری تھی۔ شاید ان کی روحانی ماورائیت کے لمحات نتیجہ تھے اس احساس کا کہ وہ روز مرہ کی جدوجہد اور حبِّ جاہ کے لاحاصل جھمیلوں میں کس بری طرح پھنسے ہوئے اور اس روحانی آزادی سے کتنی دور ہیں جس کے لیے ان کا دل تڑپتا ہے:

تاچند پستِ فطرتیِ طبعِ آرزو　　　　یا رب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے

تاہم یہ امر ناقابلِ انکار ہے کہ تسکینِ روحانی کے سرمایہء محفوظ سے وہ محروم نہیں تھے۔ ان کی فلسفیانہ بصیرت کے بہتیرے اجزا میں سے دو کی ایسے عناصر کی حیثیت سے بہ آسانی نشان دہی کی جاسکتی ہے جو رنج والم اور مایوسی میں ان کے لیے سب سے زیادہ باعث تقویت تھے۔ پہلا عنصر تھا، جب بھی بحران اپنی منتہائے کمال کو پہنچے، قادرِ مطلق کی مشیت کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر خوشی سے آمادگی، ایک حد کے آگے جدوجہد کو راحت والم کے جذبات سے مستغنیٰ رواقی فلسفے کی رو سے فضول سمجھنا اور رواقیت کے لیے مخصوص اتنے ہی ضبط و استقلال کے ساتھ یہ یقینِ کلی کہ ایسا سمجھنے سے انھیں بحران سے عہدہ برا ہونے کی لچک ملے گی:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

دوسرا عنصر تھا راست صورتِ حال سے خود کو علاحدہ کرلینے کی ان کی صلاحیت: بہ ظاہر ہر لحاظ سے شریک و شاہد کی حیثیت سے برقرار رہتے ہوئے بھی خود اپنی حالت کا علائق دنیوی سے ماورا رہ کر مشاہدہ کرنے والا بن جانا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ تناسبِ باطنی کے احساس اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ حسِّ مزاح کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور کبھی کبھی پُرمسرت لاابالی پن اور بے ضابطگی کے اعلیٰ و ارفع اور بلند پرواز جذبات محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے:

چوں عکسِ پل بہ سیل، بہ ذوق بلا برقص
جارا نگاہ دار وہم از خود جدا برقص
نبود وفائے عہد دمے خوش غنیمت ست
از شاہداں بنازشِ عہدِ وفا برقص
ذوقے ست جستجو چہ زنی دم زقطعِ راہ

رفتار گُم کن و بہ صدائے درا برقص
سر سبز بودہ و بہ چمنہا چمیدہ ایم
اے شعلہ در گدازِ خس و خارِ ما برقص
ہم بر نوائے چغد طریقِ سماع گیر
ہم در ہوا اے جنبشِ بالِ ہما برقص
در عشق انبساط بپایاں نہ می رسد
چوں گرد باد خاک شو و در ہوا برقص
فرسودہ رسم ہائے عزیزاں فرو گزار
در سور نوحہ خواں و بہ بزمِ عزا برقص
چوں حشم صالحاں و ولائے منافقاں
در نفس خود مباش ولے برملا برقص
از سوختن الم زشگفتن طرب مجوئے
بے ہودہ درکنارِ سموم و صبا برقص
غالب بدیں نشاط کہ ● وابستہ ء کہ
بر خویشتن بہ بال و بہ بندِ بلا برقص

○●○

(جوں سایہ ء پل سیل پہ، باذوقِ بلا ناچ
جا اپنی نہ چھوڑ اور یوں ہی خود سے جدا ناچ
کرتا ہے وفا عہدِ وفا کون یہاں پر
ہو کر یوں ہی سرمستِ مے عہدِ وفا ناچ
کیا طیِّ مسافت کا جنوں، ذوقِ عمل مانگ
رفتار کو بھول اور بہ غوغائے درا ناچ!
ہم سبزہ تھے گلشن میں بہت جھوم چکے ہیں
اے شعلے ہمارے خس و خاشاک میں آ! ناچ!

کر ذوقِ سماع اخذ نواہائے چغد سے
جنبش میں پر و بالِ ہما کی بھی ذرا ناچ !
ناداں ! طربِ عشق کا پایاں ہی نہیں ہے
بن خاک ، بگولے کی طرح ، اور دکھا ناچ
کر ترک عزیزوں کی یہ فرسودہ سی رسمیں
کر گریہ طرب گاہ میں ، ہنگامِ عزا ناچ
صالح کا تبرّا نہ منافق کا تولّا ۔۔۔ !
آلودہ نہ کر نفس کو باذوقِ ابا ناچ !
جلنے میں تڑپ دیکھ نہ کھلنے میں طرب ڈھونڈ
مسموم فضا ہو کہ ہو آغوشِ صبا ناچ
تا چند نشاط و طرب و عیش یہ غالب
کر خود کو بلند اور بہ صد بندِ بلا ناچ !)
(ترجمہ: مضطر مجاز)

مرورِ زمانہ کے ساتھ بہ حیثیت شاعر غالب کی شہرت مسلسل بڑھتی گئی ۔ انھوں نے اپنا پہلا اردو مجموعہ ٔ کلام ۱۸۲۱ء میں مرتب کیا تھا ۔ ۱۸۲۵ء میں دوستوں کی فرمائش پر فارسی مکتوب نگاری کے عام اصول کے بارے میں "پنج آہنگ" نام کا ایک عام فہم کتاب چہ تالیف کیا ۔ ۱۸۲۸ء میں انھوں نے "گلِ رعنا" کے نام سے اپنے اردو اور فارسی کلام کا ایک ملا جلا انتخاب مرتب کیا ۔ ان کا اردو دیوان پہلی بار ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا اور فوراً ہی اس کے تمام نسخے فروخت ہوگئے ۔ ۱۸۴۷ء میں اسے دوبارہ چھاپا گیا لیکن بہ ظاہر یہ ایڈیشن بھی عام قارئین کی مانگ کو پورا کرنے سے بڑی حد تک قاصر رہا ۔ آگے چل کر یعنی ۱۸۵۵ء میں غالب شکایت کرتے ہیں کہ انھیں خود اپنے لیے ایک نسخہ بھی نہ ملا کیوں کہ ناشر نے پہلے ہی سے تمام نسخے کتب فروشوں کو تھوک کے حساب سے فراہم کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا ۔ ان کا فارسی کلام کلیات کی شکل میں ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا ۔

ادبی تفوق نے غالب پر مخصوص ذمہ داریاں بھی عاید کر رکھی تھیں۔ پنشن کے مقدمے میں شرم ناک ناکامی اور شمس الدین خاں کے واقعے سے پیدا ہونے والی تلخی کے بعد اپنے ہم چشموں سے قطع تعلق کی خواہش چند روزہ بھی رہی ہوگی اور بالعموم پوری بھی نہ ہوئی ہوگی۔ ان کا کافی وقت دوسروں کے اصلاحِ کلام میں صرف ہوتا تھا۔ یہ وہ بے معاوضہ کام تھا جس کی ایک سربرآوردہ شاعر سے توقع رکھی جاتی تھی۔ غالب کسی سے انکار نہ کرتے تھے اور ان کی شہرت میں اضافے کے ساتھ ان لوگوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی جو اپنے کلام کے بارے میں ان کی رائے جاننے کے آرزو مند تھے۔ اس کام کے تعلق سے ان کا رویہ سنجیدگی کا تھا اور وہ توقع رکھتے تھے کہ دوسرے اس کی قدر پہچانیں گے۔ ایک خط میں وہ اپنے نہایت زودگو شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کی نرمی سے سرزنش کرتے ہوئے انھیں اصلاحوں کے بہ غور مطالعے کا مشورہ دیتے ہیں۔ شعر کے وزن اور اس کی عبارت کو درست کرنے کے علاوہ وہ تفصیلی ہدایتیں اور توضیحیں بھی شامل کرتے۔ ان کی تنقید ہمیشہ بے لاگ اور اکثر دو ٹوک ہوتی لیکن رواداری کی کبھی نہ ہوتی۔ تفتہ کے نام ایک طویل مکتوب میں وہ ان کے لکھے ہوئے ایک مصرعے پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں لیکن یہ کہتے ہوئے گفتگو ختم کرتے ہیں کہ کچھ بھی کرو یہ بے معنی ہی رہے گا۔ کبھی کبھی ان کا تبصرہ تباہ کن بھی ہوسکتا تھا۔ تفتہ کے بعض اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے، جن کے ساتھ ایسا لگتا ہے کہ وہ ان امور کے بارے میں سب سے زیادہ مراسلت کیا کرتے تھے، وہ لکھتے ہیں: "ان تمام اشعار میں کوئی سقم نہیں ہے اور کوئی دل چسپ بات بھی نہیں ہے۔" خاص طور پر دل چسپ اعلیٰ درجے کی وہ ذہنی وسیع المشربی تھی جو صحیح محاورے کے استعمال میں ان کی رہ نمائی کرتی تھی۔ ایک دفعہ جب ایک شاگرد نے نام ور شاعر حزیں کے ایک شعر کا بہ طور سند حوالہ دیتے ہوئے ایک مخصوص محاورے کے استعمال کو حق بہ جانب ثابت کرنے کی کوشش کی تو غالب کا جواب یہ تھا کہ حزیں تو آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہو تو بھی اس کو سند نہ مانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔"

غالب ان تھک مکتوب نگار تھے اور انھیں لکھنے میں کافی وقت اور توجہ صرف کرتے، وہ اسے ایک ادبی مشغلہ سمجھتے تھے۔ ان کے بے شمار خطوط کی زبان بے ساختہ ہے، یہ تفصیلات اور دل آویز ضمنی اقوال و نکات سے بھرپور، تصنّع اور رسمی اندازِ بیان سے

بڑی حد تک پاک، بے بناوٹ اور بے تکلف سلیس گفتگو۔ وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:

"میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

خطوط کے پہنچنے میں وقت لگتا تھا لیکن اخبارات کا رواج شروع ہونے تک اور بڑی حد تک اس کے بعد بھی خبروں کی نشر و اشاعت کے ایک ذریعے کی حیثیت سے خطوط کی اہمیت برقرار رہی۔ غالب کے لیے سارے شمالی ہند میں پھیلے ہوئے اپنے بہتیرے دوستوں کے ساتھ خط و کتابت جاری رکھنا ایک اہم مشغلہ تھا۔ خطوط کے پہنچنے کا انتظار یا اپنے خدمت گار کلو کو خطوط ارسال کرنے کے لیے ڈاک خانے بھیجنا روز کا معمول تھا۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ ان کے حینِ حیات طبع ہوا۔ ان کا رجحانِ طبع صرف شعر گوئی کی طرف نہیں تھا بلکہ وسیع تر مفہوم میں اسے ادبی فضیلت کے سبھی لوازم پر دست گاہ سمجھنا چاہیے۔ اکثر دوسرے مصنفین اپنی علمی کاوشوں پر تقریظ یا پیش لفظ لکھنے کی ان سے فرمائش کرتے۔ وہ ان پر کافی محنت کرتے۔ ایک خط میں وہ تفتہ کو مطلع کرتے ہیں:

"دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔"

شعر گوئی کے لیے ان کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا، لیکن ایسا لگتا ہے کہ اشعار وہ زیادہ تر رات دیر گئے اس وقت کہتے جب کچھ آسودہ خاطری نصیب ہوتی۔ مشاعروں کا رواج عام تھا اور انھیں اس عہد کے ادبی جوش و خروش کے اظہار کے ایک مسلّمہ وسیلے کی حیثیت حاصل تھی۔ محلِ شاہی کی طرف سے ماہانہ کم از کم دو رسمی مشاعرے دیوانِ عام میں منعقد کیے جاتے لیکن امرا کے ایوانوں میں اور بہت سی غیر رسمی شعری محفلیں ضرور منعقد ہوتی رہی ہوں گی۔ ان مشاعروں اور ادبی محفلوں میں خاص قوتِ کشش کی حامل غالب کی شخصیت تھی۔ ان کی آواز بلند تھی اور وہ اسے کار گر طور پر استعمال کرتے تھے۔ بہ حیثیت شاعر ان کی امتیازی حیثیت کے اعتراف کے طور پر ان کے کلام سنانے کی باری بالعموم بالکل آخر میں آتی تھی۔ بعض اوقات جب انتظار کی گھڑیاں ان پر بھاری گزرتیں، بالخصوص جب شاعری کا معیار اونچا نہ ہوتا اور اشعار آب دار نہ ہوتے، تو وہ عذر معذرت کر کے کچھ دیر کی

رخصت حاصل کرلیتے ، شہر کی سیر کرتے ، تھوڑی سی پی لیتے اور پھر محفل کو واپس لوٹتے جو افق پر سپیدیِ صبح کے نمودار ہونے تک جاری رہتی ۔ ان کے قریبی دوستوں میں منشی نبی بخش حقیر ، مولوی فضلِ حق اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ شامل تھے ، موخر الذکر سے قریبی دوستی غالب کی کلکتے سے واپسی کے بعد شروع ہوئی ۔ یہ سبھی باکمال شعرا تھے اور اہلِ علم کہلانے کا پورا پورا حق رکھتے تھے ۔ غالب کے شاگردوں میں تفتہ اور علائی یعنی لوہارو خاندان کے علاء الدین احمد خاں ، شامل تھے ۔ ان کو اور بعض دوسروں کو ملاکر ایک ادبی حلقے کی حیثیت حاصل تھی اور یہ تقریباً روزانہ ملاقات یا مراسلت کے ذریعے ایک دوسرے سے ربط قائم رکھتے تھے ۔ اس طرح سے غالب کی روز مرہ کی زندگی آج کل کی کسی نام ور ادبی شخصیت کے نظام عمل سے مختلف نہیں تھی جس میں تصحیح کا کام ، شعرگوئی ، مضمون نگاری ، تنقیدی تبصروں اور دیباچوں کا لکھنا ، مباحث ، مذاکرات ، سیمیناروں اور شعر خوانی کی محفلوں میں شرکت ، ادبی مناقشوں کے متنازع فیہ مسائل پر اپنی بیش قیمت رائے کا اظہار ، ترتیب و تہذیب متن اور حلقہء درس کی صدرات جیسے فرائض شامل رہتے ہیں ، فرق بس اتنا تھا کہ دنیائے ادب پر چھائی ہوئی اس بے مثل بہار کے زمانے میں ماحول کچھ اور بھی زیادہ زور و شور کا اور سخت گیر تھا ۔ یہ مکمل ادبی تجربہ ، جس سے وہ شبانہ روز گزرتے تھے ، غالب کی زندگی کی بناوٹ کا ایک انتہائی اہم عنصر تھا ، جس کو ملحوظِ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے ۔

دہلی کالج کے قیام کے بعد ۱۸۴۲ء میں غالب کا نام فارسی کی مدرّسی کے لیے تجویز کیا گیا ۔ حکومت ہند کے سکریٹری طامسن نے انھیں اس سلسلے میں باضابطہ ملاقات کے لیے بلایا ۔ جب غالب پالکی سے اترے تو اس انتظار میں کھڑے رہے کہ صاحب سکریٹری ان کے استقبال کے لیے نکلیں گے ۔ یہ شرفا کی تشریف آوری کے موقع پر تعظیم و تکریم کا مقررہ عمل درامد تھا ۔ طامسن نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ اس کے خیال میں اس موقع پر دستور کی پیروی کا کوئی جواز نہیں تھا ، آخر کار غالب اس کے پاس نوکری کے ایک امیدوار کی حیثیت سے آئے تھے ۔ غالب کو یہ بہت ناگوار گزرا ، جیسے ان کی دکھتی رگ پکڑلی گئی ہو ۔ غالب نے طامسن کو جواب دیا کہ " سرکاری ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو ، نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے ۔ " طامسن نے کہا کہ میں ان امور کا تعین کرنے والے ضابطوں سے مجبور ہوں ۔ تب غالب نے اجازت چاہی اور

رخصت ہوئے۔ بے شک غالب کو روپے پیسے کی ضرورت تھی ، لیکن بعض مخصوص اقدار تھیں جن سے وہ نور اپنی نظر میں اپنی شناخت برقرار رکھنا چاہتے تھے اور جن کی قربانی دینے کے لیے وہ ہرگز تیار نہیں تھے۔ اس کے علاوہ کسی کالج میں تنخواہ پر ملازمت اس وقت تک ایک نیا تصوّر تھا ، جب کہ توقع کی جاتی تھی کہ ایک نام ور شاعر کی کفالت کا ذریعہ شاہی سرپرستی اور قدردان امرا کو ہونا چاہیے۔ بہ ہرحال کالج کے باہر ادبی سرگرمی غالب کے لیے خاطر جمعی کا ایک ذریعہ بھی تھی اور کافی وقت کا بھی مطالبہ کرتی تھی۔ کالج کی ملازمت میں قابلِ لحاظ امر محض روپیہ پیسہ تھا ، لیکن ہماری سبھی خواہشیں تو پوری ہونے سے رہیں۔

اس طرح زندگی بڑی حد تک پہلے ہی کی طرح بسر ہوتی رہی۔ گرمیوں میں وہ اپنے گھر کے صدر دروازے کی چھت پر واقع ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں دن گزارتے۔ جاڑوں میں وہ اس سے ملحق ایک برآمدے میں بیٹھ کر دھوپ کھاتے۔ شام میں تھوڑی سی شراب ، شطرنج اور چوسر ان کی معمول کی تفریح تھی اور آم ان کی ہمیشہ کی لت تھی۔ ادبی مشاغل ان کو مصروف رکھتے۔ تاہل کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے اپنے اور اتنے ہی اہم تقاضے تھے ، یہ ان کے لیے مسرت ، کا سرچشمہ بھی تھی لیکن شاید زیادہ تر رنج و ملال کا باعث۔ روپے پیسے کی کمی دماغی سکون میں ہمیشہ خلل انداز رہی اور صحت کے محاذ پر بھی بعض مسائل ابھر رہے تھے جو بیش تر جسمانی ورزش کے فقدان " نیز تقریباً کلیتہً گوشت اور روٹی پر مشتمل خوارک " کا نتیجہ تھے۔ اس رفتار سے آہستہ آہستہ سال گزرتے گئے یہاں تک کہ قماربازی کے الزام میں گرفتاری کا وہ واقعہ پیش آیا جس نے انھیں ہلا کر رکھ دیا۔ اس کا مختصراً ذکر اوپر آچکا ہے لیکن اس واقعے کی اہمیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس پر ایک غائر نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

غالب کو شرط لگا کر چوسر کھیلنا پسند تھا۔ ممکن ہے کہ مالی دشواریوں نے انھیں ایک حد تک ناعاقبت اندیش بنادیا ہو لیکن بعض مصنفوں کی طرف سے ایسے ادعا کے باوجود ، ان کا گھر جواریوں کا اڈہ نہیں تھا۔ وہ چوسر دوستوں کے ساتھ کھیلتے تھے اور اسے وہ اخلاقی طور پر غلط نہیں سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں انگریز عہدہ دار اس نئی اخلاقیات کے نقیب کی حیثیت اختیار کر رہے تھے ، جس میں تبلیغِ انجیل کا جوش تھا اور جو دیسیوں کو ان کی بری عادتوں سے چھٹکارا دلانے کے لیے جہاد کی علم بردار تھی اور کسی قسم کی رو رعایت کی قائل نہ تھی۔ یہ عہدہ دار

قمار بازی کو ایسی سماجی برائی سمجھتے تھے جس کی بیخ کنی ضروری تھی۔ ۱۸۴۱ء میں غالب کو متنبہ کیا جاچکا تھا جب کہ ان کے گھر پر چھاپا مارا گیا تھا اور ان پر قمار بازی کے الزام میں سو روپے جرمانہ عاید کیا گیا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں کیا واقعہ درپیش آیا ٹھیک سے معلوم نہیں۔ اپنے ایک خط میں غالب ذکر کرتے ہیں کہ دہلی کا کوتوال فیض حسن خاں ان کے خلاف تھا۔ (حقیقت کی اس رمق کو بہ صورتِ دیگر پُر لطف تجارتی ہندی فلم "مرزا غالب" میں افسانہ طرازی کے وافر اضافوں کے ساتھ کام میں لایا گیا ہے)۔ ایک بیان کے مطابق کوتوال نے اپنے آدمیوں کو غالب کے گھر پر چھاپا مارنے کے لیے برقع پوش خواتین کے بھیس میں بھیجا۔ غالب رنگے ہاتھوں جوا کھیلتے ہوئے پکڑے گئے۔ غالباً انھیں اب بھی یقین تھا کہ معاملہ دبا دیا جائے گا: آخر تو وہ طبقہء امرا کے ایک ممتاز رکن تھے، شہر کے مسلمہ سرکردہ شاعر تھے، ان سے انگریز عہدہ دار ناواقف بھی نہیں تھے۔ لیکن اس بار ان کی قسمت میں ایک شدید صدمہ لکھا تھا۔ مجسٹریٹ رابرٹس دہلی میں حال ہی میں تعینات ہوا تھا اور غالب کے پس منظر سے واقف نہیں تھا، نہ ہی اس نے یہ سب معلوم کرنا ضروری سمجھا۔ بہ قول غالب وہ بہت زیادہ کوتوال کے دباؤ میں آگیا۔ غالب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپے جرمانہ ادا نہ کریں تو قید میں اور اضافے کا حکم تھا۔ مقررہ جرمانے کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت سے معافی مل سکتی تھی۔ سیشن جج نے، جو غالب سے بہ خوبی واقف تھا، فیصلے کی توثیق کردی۔

جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی اس فیصلے سے ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ حکمِ سزا کی درشتی سے عوام میں خفگی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک معاصر اخبار نے احتجاج کیا کہ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جن کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، معمولی جرم میں اتنی سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر بیچ میں پڑے اور انگریز حکام سے غالب کی رہائی کا مطالبہ کیا لیکن انگریزی سرکار پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اعلیٰ حضرت کو مطلع کیا گیا کہ معاملہ زیر تحقیقات عدالت ہے۔ عدالتی کارروائی میں دخل اندازی مناسب نہ ہوگی۔

غالب کو قید کی پوری میعاد نہیں کاٹنی پڑی۔ وہ تین مہینے کے بعد رہا کردیے گئے۔

قید میں وہ مشقتِ تعزیری سے مستثنیٰ رہے۔ انھیں اجازت تھی کہ گھر سے بھیجا ہوا کھانا کھائیں، اپنے ذاتی کپڑے پہنیں اور ملنے آنے والوں سے ملاقات کریں۔ لیکن یہ گرمی کا موسم تھا اور انھوں نے تکلیف ضرور اٹھائی ہوگی۔ درحقیقت انھیں میعاد پوری ہونے سے قبل غالباً سیول سرجن ڈاکٹر راس کی رائے کی بنا پر رہا کیا گیا۔ سارے معاملے کا اصل صدمہ پہنچانے والا پہلو وہ ذلّت تھی جو اس کی وجہ سے انھیں برداشت کرنی پڑی۔ غالب کو، جو ایک امیر زادے، دانش ور، رنج و الم اور مسرت و شادمانی کے نغموں کے خالق حساس شاعر تھے، ایک معمولی مجرم کی طرح جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ نئے حاکموں کی نظر میں ان کی حیثیت کے بارے میں اگر کسی کو کوئی خوش فہمی تھی تو اب کلیتہً دور ہو گئی ہوگی۔ ظلل اللہ فی الارض مغل بادشاہ کی بے بسی اور تناسبِ معکوس میں فرنگیوں کے اختیارات وضاحت کے ساتھ آشکار ہوگئے۔ موخرّ الذکر کی خوش نودی حاصل کرنے کی مساعی لاحاصل ثابت ہوئیں۔ یہ ایک نیا نظام اقدار تھا، نئے سیاسی نظام کے سہارے قائم شدہ بے رحم میزانِ حق و باطل تھی، جسے آپ یا تو تسلیم کریں یا پھر مصیبت اٹھائیں اور اس مصیبت میں کوئی آپ کا ساتھ بھی نہیں دے گا۔ ذاتی سطح پر یہ غالب کے لیے انتہائی حیرت انگیز انکشاف تھا۔ ان کے دہلی کے اکثر احباب، یہاں تک کہ قریبی اور عزیز از جان رشتہ داروں نے بھی ان سے منھ موڑ لیا اور حکّام کے منظورِ نظر بنے رہنے کی اپنی مساعی میں بڑی زود حسی سے کام لیا۔ غالب کے نہایت قریبی دوست اور رشتہ دار، لوہارو کے امین الدین خاں نے اخبار میں یہ توضیح شائع کروا کے کہ غالب سے ان کی کوئی یک جدی رشتہ داری نہیں ہے، اس تعلقِ باہمی کے داغ کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ان کے بھائی ضیاء الدین احمد خاں کا رویہ بھی کچھ کم معاندانہ نہیں تھا۔

واحد اور قابلِ ذکر استثنائی حیثیت مصطفیٰ خاں شیفتہ کی تھی۔ شیفتہ نے ہر ممکنہ کوشش کی کہ غالب کی سزائے قید منسوخ کردی جائے۔ انھوں نے مقدمے اور مرافعے کے اخراجات برداشت کیے اور جب کام یابی نہ ملی تو غالباً انھی نے جرمانہ ادا کیا۔ غالب کے زمانہء اسیری میں وہ ان سے تقریباً روزانہ ملاقات کرتے تھے۔ دوسروں کے رویے کے بالکل برعکس ان کے اس حسنِ سلوک کی وجہ سے غالب تا عمر شیفتہ کے مرہونِ منّت رہے۔ جیل میں لکھی گئی اپنی مشہور جسیہ نظم میں غالب شکلِ انسان میں انھیں خدائے تعالیٰ کی رحمت

مجسّم قرار دیتے ہوئے انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ غالب پکار اٹھتے ہیں کہ جس کا شیفتہ جیسا دوست ہو اس کو تو مرنے کا بھی غم نہ ہونا چاہیے۔ اسی نظم میں دوسرے احباب کی " وفاداری " کے بارے میں تلخی اور شدید طنز سے بھرپور بند بھی ہیں۔ غالب کہتے ہیں کہ ان کے برتاؤ نے قید خانے کو آزاد دنیا سے کہیں بہتر جگہ کی حیثیت دے دی تھی۔

رہائی کے بعد غالب کی ذہنی کیفیت شدید دل شکستگی کی تھی۔ اسی معاشرے کو واپس لوٹنے کا خیال، جس نے آڑے وقت، جب انھیں سہارے اور دلاسے کی ضرورت تھی، ان سے طوطا چشمی کی تھی، ان کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے یہ مشہور اشعار جن میں سماج کی بے رحمی کی تصویر الفاظ میں کھینچی گئی ہے، اسی زمانے میں لکھے ہوں :

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاس باں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

غالب کے ایک فارسی خط میں، جسے حالی نے نقل کیا ہے، ہمیں ایسے ہی خیالات کی آوازِ بازگشت سنائی دیتی ہے۔ " میری آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں، تو ہندستان میں نہ رہوں۔ مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو، خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہء رحمۃ اللعالمین دل دادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے، جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں، سر بہ صحرا نکل جاؤں۔"

سزائے قید کی وجہ سے ان کے گھریلو انتظامات یقیناً درہم برہم ہوگئے ہوں گے۔ اس پر یہ امرِ واقعہ دلالت کرتا ہے کہ رہائی کے بعد وہ اپنے پرانے گھر کو واپس نہیں لوٹے بلکہ بہادر شاہ ظفر کے پیر و مرشد نصیرالدین کالے میاں صاحب عرف کالے شاہ کے مکان

کو منتقل ہوئے جہاں شاہ صاحب نے غالب اور ان کے کنبے کو رہنے کا ٹھکانہ دیا تھا۔ یہ میاں کالے صاحب کے بہادر شاہ کے ساتھ تعلقات ہی تھے جن کی بہ دولت غالب پہلی بار مغل دربار میں باضابطہ باریاب ہوئے۔ بادشاہ کے معالج حکیم احسن اللہ خاں نے بھی، جو غالب کے قریبی دوست تھے، ضرور ان کی سفارش کی ہوگی۔ واقعہ اسیری سے غالب کی شہرت بہ حیثیت شاعر متاثر نہیں ہوئی تھی۔ بہ ہرحال بیش تر عوام کی نظر میں، ان کے سنگ دلانہ برتاؤ کے باوجود، غالب مجرم کبھی نہیں تھے۔ فرنگی سرکار حاکم تھی اور اس کے من کی موج کے آگے تو سب بے بس تھے۔ جب غالب رہا ہوگئے تو بہتیرے ایسے تھے جنھوں نے ہمت جٹا کر اپنی درپردہ ہم دردی کا اظہار کیا۔ بادشاہ نے سزائے قید کی منسوخی کے لیے باضابطہ انگریزوں سے ربط قائم کیا تھا۔ یہ نام ور شاعر اور امیرزادہ غالب کے تئیں ان کا فرض تھا۔ لیکن ذاتی سطح پر غالب کے ساتھ ان کے تعلقات زیادہ خوش گوار نہیں تھے۔ بہادر شاہ ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے، لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں، وہ اپنے باپ اکبر شاہ ثانی کے منظورِ نظر نہیں تھے۔ اکبر شاہ ثانی تو آخر تک انگریزوں سے چھوٹے بیٹے شہ زادہ سلیم کو بہ حیثیت ولی عہد تسلیم کرنے کی استدعا کرتے رہے تھے۔ غالب نے اکبر شاہ ثانی کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا، جس میں انھوں نے کچھ زیادہ ہی خوش بیانی سے شہ زادہ سلیم کی خوبیوں کی بھی مدح سرائی کی تھی۔ جب بہادر شاہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے اپنے حریف کے تعلق سے غالب کی طرف داری کو فراموش نہیں کیا۔ "اس داغ کو دور کرنے کے لیے غالب کو تیرہ سال اور پندرہ مدحیہ قصیدے درکار ہوئے۔" آخر کار ۱۸۵۰ء میں بادشاہ نے ان کو نجم الدولہ، دبیرالملک، نظام جنگ کے خطابات مرحمت کیے اور سالانہ چھ سو روپے تنخواہ پر خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔

ان واقعات سے جذباتی طور پر غالب کو بحال ہونے میں مدد ملی۔ سماج میں ان کی حیثیت کو بڑھاوا ملا، وہ بھی عین اس وقت جب کہ اس کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن ابتدائی احساسِ کام رانی کا جوش جلد ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ تاریخ نویسی تحقیقی ریاضت کا تقاضہ کرتی تھی اور ایسا لگتا ہے کہ وہ جلد ہی اس سے تھک گئے اور اگر وہ اس پر قائم رہے تو صرف تنخواہ کی خاطر۔ پہلے چھ مہینوں یعنی جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک وہ بابر سے آگے نہیں بڑھ پائے۔

طے یہ ہوا تھا کہ انھیں تنخواہ شش ماہی ملا کرے گی۔ غالب، جن کے پاس زرِ

نقدن ہمیشہ کمی رہتی تھی۔ ماہانہ تنخواہ کو ترجیح دیتے تھے اور شروع میں انھوں نے طے کیا کہ اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ سارے منصوبے ہی سے پیچھا چھڑا لیں گے۔ اپنے مخصوص بے مثل انداز میں انھوں نے بہادر شاہ کو راست مخاطب کرتے ہوئے ایک نظم لکھی جس میں ماہانہ تنخواہ کی ادائگی کا سوال اٹھایا:

میری تنخواہ جو مقرر ہے　　اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک　　خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بہ قیدِ حیات　　اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض　　اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا　　ہوگیا ہے شریک ساہو کار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ　　تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

وہ ماہانہ تنخواہ لینے میں تو کام یاب ہوئے لیکن اپنے تاریخی بیانیہ کو ہمایوں سے آگے لے جانے میں انھیں کام یابی نصیب نہ ہوئی۔ ۱۸۵۱ء تک ان کا ردِّ عمل کہیں زیادہ دو ٹوک ہوچکا تھا اور وہ اس فرضِ منصبی کو ایک دردِ سر سمجھنے لگے تھے۔ منصوبہ اپنی طبعی موت ہی مرگیا۔ دربار کو اس میں دل چسپی باقی نہ رہی اور غالب نے اس کی تجدید کی کوشش بھی نہیں کی۔ جو کچھ وہ لکھ چکے تھے بالآخر ۱۸۵۴ء میں "مہرِنیم روز" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس سارے کاروبار کا واحد اہم نتیجہ یہ نکلا کہ غالب خاصے طویل عرصے تک پُر تکلف فارسی عبارت لکھتے لکھتے تھک کر، بیس سال سے بھی زیادہ لمبے وقفے کے بعد، اردو کی طرف لوٹے اور اسے اپنے مکاتیب میں اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔

کارِ مفوضہ کی نوعیت دربار سے غالب کے سرد مہرانہ تعلقات کی واحد وجہ نہیں تھی۔ غالب کی نظر میں استادِ شہ کی حیثیت سے شیخ محمد ابراہیم ذوق کا انتخاب ظفر کی ادبی سوجھ بوجھ کا ثبوت ہرگز نہیں تھا۔ غالب شہر کے مسلّمہ سرکردہ شاعر تھے جب کہ ذوق سرکاری سرخیلِ شعرا تھے۔ ان کی کبیدگی اور مخالفت سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن غالب ایک سرائے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے ذوق کو سامنے گلی میں محلِ شاہی کو جاتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ قریب سے گزرے تو غالب نے بہ آوازِ

بلند رائے زنی کی :

" بنا ہے شہ کا مصاحب ، پھرے ہے اتراتا ۔ "

طعنہ بہت شدید تھا اور جیسا کہ توقع رکھی جاسکتی ہے ذوق نے بادشاہ سے شکایت کی ۔ غالب ابھی سرائے ہی میں تھے کہ شاہی آب دار اس پیغام کے ساتھ آیا کہ اعلیٰ حضرت کا حکم ہے کہ مرزا نوشہ فوراً ملاحظے میں پیش ہوں ۔ معقول توضیح ضروری تھی کیوں کہ حملہ استادِ شہ پر تھا اور صاف انکار لاحاصل تھا ۔ لال قلعے کو جاتے ہوئے غالب نے حسبِ ذیل اشعار موزوں کیے ، جن میں بڑی باریکی سے بادشاہ کو بے جا طرف داری پر ملامت بھی کی گئی ہے اور جو ساتھ ہی ساتھ ذوق سے مخاطب ہو کر کہے گئے اہانت آمیز فقرے کے سیاق و سباق کو کلیتہً بدل بھی دیتے ہیں :

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ " تو کیا ہے ؟ "
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے ؟
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے ؟
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے ؟

ooo

رہی نہ طاقتِ گفتار ، اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے ؟
بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے ؟

بدلے ہوئے سیاق و سباق میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس پر اعلیٰ حضرت ناراض ہوتے ۔ لیکن حقیقتِ واقعہ سے بادشاہ بھی واقف تھے اور سارا شہر بھی ۔ ایک اور بھی سنگین واقعہ دسمبر ۱۸۵۱ء میں پیش آیا ۔ اس کا سبب تھا بہادر شاہ ظفر کے بیٹے شہ زادہ جواں بخت کی شادی ۔ جواں بخت کی ماں زینت محل بہادر شاہ ظفر کی چہیتی بیوی تھیں اور بادشاہ پر

ان کا بڑا اثر تھا۔ ان کی تحریک پر بہادر شاہ کوشش کررہے تھے کہ انگریز جواں بخت کو ولی عہد تسلیم کرلیں، حالاں کہ وہ اور شہ زادوں سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ چناں چہ تعجب کی بات نہیں کہ جواں بخت کی شادی کے انتظامات بڑی دیدہ ریزی سے کیے جارہے تھے اور شہر میں اس کی وجہ سے بڑا جوش و خروش تھا۔ زینت محل نے غالب سے اس موقع پر سہرا لکھنے کی فرمائش کی۔ غالب نے فرمائش کی فوراً تعمیل کی اور سہرا روایتی انداز میں لکھا، بہ جز آخری شعر کے، جو ذوق سے ان کی اس رقابت کے سیاق و سباق میں، جس سے سب واقف تھے، عمداً اشتعال انگیز تھا:

ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

بادشاہ کو اپنے استاد کی یہ اہانت ناگوار گزری۔ انھوں نے ذوق سے مبارزت قبول کرنے اور ترکی بہ ترکی جواب لکھنے کو کہا۔ تب ذوق نے بھی ایک سہرا لکھا جس کے آخری شعر میں، غالب ہی کے انداز میں، شعر گوئی کا دعویٰ کرنے والوں کو للکارا کہ اگر صلاحیت ہو تو اس سہرے کے برابر لکھ کر دکھائیں۔

ذوق کے سہرے کو محلِ شاہی کے پیشہ ور مغنیوں نے بڑی شہرت دی اور دوسرے دن اسے مقامی اخباروں میں شائع بھی کیا گیا۔ شروع میں غالب نے سوچا کہ ان کے متنازع فیہ شعر کا صرف ذوق نے برا مانا ہے۔ گو کہ نجی طور پر وہ یہ ماننے کو تیار تھے کہ شاید تصرفِ شاعرانہ کی حدود سے انھوں نے تھوڑا بہت تجاوز کیا ہو، ان کا ابتدائی ردِ عمل ذوق کے جوابی حملے کو نظر انداز کرنے کا تھا۔ لیکن اس خاصی شہرت سے جو اس سہرے کو دی جارہی تھی غالب نے اندازہ لگا لیا کہ بات خود بادشاہ کو ناگوار گزری تھی۔ تب انھوں نے بادشاہ کے حضور میں اپنی مشہور معذرت پیش کی:

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشہء آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہء عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں ؟
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ، ہو مجھے پر خاش کا خیال
یہ تاب ، یہ مجال ، یہ طاقت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ ! ہاں اس سے مدّعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے ، سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں ، جنوں نہیں ، وحشت نہیں مجھے
قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ ، کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اس سارے واقعے کا اگلے کئی دنوں تک ہر طرف چرچا رہا ۔ معذرت نامے میں مسکینی اور فروتنی کے مبالغہ آمیز اقرار کے ذریعے بہ ظاہر غالب معافی کے خواست گار تھے ۔ لیکن اس کے ذو معنی اور چبھتے ہوئے استہزائیہ فقروں کے وسیلے سے وہ مبارز طلبانہ اعلان کررہے تھے کہ جب عہدِ گزشتہ کے نام ور فرماں رواؤں کی زبان فارسی میرا تمغہء امتیاز ہے تو ریختے میں کوئی میرا مقابلہ کرہی نہیں سکتا اور بہرکیف میری ذاتی وقعت کا انحصار تو میری عالی نسبی پر ہے نہ کہ شعر گوئی پر (سب جانتے تھے کہ ذوق کم اصل تھے) ۔ آخری شعر میں چھکے چھڑا دینے والی کاٹ تھی ۔ یہ ادعا کہ میں سچ کہتا ہوں ایک عمومی بیان تھا لیکن یہ سب پر ظاہر تھا کہ اس کے ذریعے وہ سہرے میں اپنی ابتدائی لن ترانی کے حق بہ جانب ہونے پر زور دے

رہے ہیں! لفظوں کے اس دل چسپ کھیل سے بادشاہ کی خفگی دور ہوئی ہو یا نہ ہو، اس سے وہ محظوظ تو ضرور ہوئے ہوں گے۔ دلی والوں کے لیے جو ادبی نوک جھونک کا تماشا بڑے شوق سے دیکھنے کے عادی تھے یہ بلاشبہ نہایت عمدہ سامانِ تفریح تھا۔

ذوق کا ۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا۔ ان کی جگہ غالب استادِ شہ مقرر ہوئے۔ بادشاہ خود ایک ممتاز شاعر تھے۔ ذوق کی طرف اپنے میلانِ خاطر کے باوجود وہ بہ حیثیت شاعر غالب کی اصلی قدر و قیمت سے ناواقف نہیں تھے۔ انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کی شاعری کی بہار کے تین سرکردہ شاعر غالب، ذوق اور مومن تھے۔ مومن کا ۱۸۵۱ء میں انتقال ہوچکا تھا۔ تین سال بعد ذوق کے انتقال پر غالب کا انتخاب ناگزیر تھا۔ قرینِ قیاس ہے کہ یہ تقرر شاید ہی ان کے جذبات میں ضرورت سے زیادہ جوش و خروش کا باعث رہا ہوگا۔ ان کی قدر شناسی حد سے زیادہ دیر میں کی گئی تھی۔ اس وقت غالب ستاون سال کے تھے اور اب بھی انھیں ملک الشعرا کے اس رسمی خطاب سے نہیں نوازا گیا تھا جو ذوق کو حاصل تھا۔ بادشاہ کی مالی حالت ایسی تھی کہ مادی فائدے کی امید موہوم ہی تھی۔ تقررِ تنخواہ میں کسی اضافے سے مربوط نہیں تھا۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ غالب اس بات کو دراصل نہ بھول سکتے تھے اور نہ ہی معاف کرسکتے تھے کہ ظفر نے ابتداً استادِ شہ کی خدمت پر ذوق کا انتخاب کیا تھا۔ اس سے نہ صرف اس خدمت کی قدر و قیمت میں کمی آئی بلکہ، غالب کی نظر میں، بادشاہ کی ادبی صلاحیتوں پر بھی حرف آیا۔ ان کی یہ بدگمانی کبھی دور نہ ہوسکی کہ بہادر شاہ بہ حیثیت شاعر غالب کی قدر شناسی کی اہلیت نہیں رکھتے۔

ایسا لگتا ہے کہ بادشاہ کے کلام پر اصلاح کے کام سے وہ فکر پر زیادہ زور ڈالے بغیر بس سرسری طور پر نبٹ لیتے تھے اس سے اس احساس کی آئینہ داری ہوتی تھی کہ اس کلام پر بس اتنے ہی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ایک چشمِ دید گواہ نے ایک دفعہ دیکھا کہ انھوں نے دیوانِ عام میں بیٹھے بیٹھے اور بات چیت کرتے ہوئے ظفر کے اشعار کے ایک پلندے پر کچھ ہی منٹوں میں اصلاح کردی۔ اصلاح ہوچکی تو انھوں نے پرچے چوب دار کے حوالے کیے کہ بادشاہ تک پہنچادے اور کام سے سبک دوشی پر بڑے اطمینان کا اظہار کیا۔

اشارہ واضح ہے۔ اصلاحِ کلام کا کام وہ نہ صرف سرسری طور پر بلکہ بادلِ ناخواستہ

کیا کرتے تھے ۔ تاہم بہ حیثیت استادِ شہ بعض فرائض منصبی سے وہ پہلو تہی نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں مختلف تقاریب ، مثلاً عیدین ، کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر جب بادشاہ کی ایسی منشا ہو مدحیہ قصائد کا پیش کرنا بھی شامل تھا ۔ غالب کے لیے یہ فرائض ناگوار سے ناگوار تر ہوتے جا رہے تھے ۔ ۱۸۵۵ء میں عید کے موقع پر نہ قصیدہ لکھا ، نہ قطعہ اور نہ ہی رباعی بلکہ دو تین اشعار فی البدیہہ موزوں کر کے سنا دیے ، جن کی انھوں نے اپنے پاس نقل بھی نہیں رکھی ۔ اگلی عید پر ٹال مٹول کی ایسی ہی کوشش پر حکیم احسن اللہ خاں نے سخت اعتراض کیا اور باقاعدہ قصیدے پر اصرار کیا ۔ غالب کو محض یہ جبر اور دستور کی لاحاصل پابندی ہی ناگوار نہیں گزرتی تھی ۔ گو کہ جب انھیں اپنی روشِ خاص پر چلنے کی ضرورت نہ ہوتی وہ فکر پر زیادہ زور ڈالے بغیر بھی شعر لکھ سکتے تھے ، اس وقت تک ان کے لیے سنجیدہ شعر گوئی کا کام حد سے زیادہ کاوش کا متقاضی ہوگیا تھا کیوں کہ ان کی افتادِ طبع اور تربیت ایسی تھی کہ اپنی طرزِ خاص میں لکھنے کا کام وہ بڑی جاں کاہی سے سرانجام دیتے تھے ۔ وہ اس کا ذکر شاید ۱۸۵۵ء یا ۱۸۵۶ء کے ایک خط میں کرتے ہیں :

> " میں شاعرِ سخن سنج اب نہیں رہا ، صرف سخن فہم رہ گیا ہوں ، بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گون ہوں ۔ بناوٹ نہ سمجھنا ، شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا ۔ اپنا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیوں کر کہا تھا ۔ "

بادشاہ کو ان کی دربار میں تقریباً روزانہ حاضری درکار تھی ۔ اپنے متعدد خطوط میں غالب ذکر کرتے ہیں کہ صبح نو بجے تک وہ قلعہ کے لیے روانہ ہوجاتے ہیں ۔ جہاں پناہ کے من کی موج اس کی متقاضی ہوتی تو یہ نظام الاوقات خاصہ کڑا بھی ہو سکتا تھا ۔ ایسے بھی دور آتے جب بہادر شاہ دربار روزانہ منعقد کرتے ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ غالب قلعے کے لیے صبح آٹھ اور نو بجے کے درمیان روانہ ہوتے ، دوپہر کو بہ عجلت کھانا کھانے کے لیے گھر واپس لوٹتے ، چار پانچ گھڑی دم لیتے ، اور اکثر شام کو پھر دربار میں حاضر ہوجاتے ۔ بادشاہ کی خواہش ہر حال میں واجب التعمیل ہوتی ۔ مثال کے طور پر سارے دن کے دربار کے بعد وہ غالب کو شام میں پتنگ بازی میں اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دیتے (یہ اس زمانے میں امرا کا پسندیدہ فرصت کا

مشغلہ تھا) انکار ممکن نہ ہوتا۔ غالب جنھوں نے کبھی باضابطہ ملازمت نہیں کی تھی اس رفتار کے دستور العمل کے عادی نہیں تھے اور اپنے دوستوں سے شکایتاً کہتے کہ رات کو مزدوروں کی طرح تھک کر پڑ رہتا ہوں۔ یہ شعر شاید انھوں نے اسی زمانے میں لکھا ہے:

غالب! وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

لیکن اس ملازمت میں کچھ ایسی خوبیاں بھی تھیں جن سے اس کے عیوب کی تلافی ہوجاتی تھی۔ دراصل تعلقاتِ باہمی کے اطمینان بخش نہ ہونے کے باوجود ذاتی سطح پر بادشاہ اور غالب دونوں اکثر بے تکلفانہ دل لگی سے لطف اندوز ہوا کرتے۔ اپنے استاد کی شہرت، ان کی عمر اور بہ حیثیت امیرزادہ ان کے رتبے کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بادشاہ ان کے شخصی برتاؤ اور فرائضِ منصبی کی بجا آوری میں کافی رعایت سے کام لیتے تھے۔ غالب اس سے واقف تھے، لیکن حد سے زیادہ بے تکلف بننے کے لیے صورتِ حال کا غلط استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کے باہمی عمل میں اعتدال، لطافت، احترام، خوش طبعی اور شائستگی کا وہ صحیح امتزاج تھا جسے اس عہد کی تہذیبی خوش سلیقگی کی بہترین علامت کی حیثیت حاصل تھی۔ ایک موقع پر جب بادشاہ دربار میں موجود تھے گفتگو ازمنہء وسطیٰ کے درویش حضرت نظام الدین اولیاؒ اور فارسی گو شاعر امیر خسروؒ کے قریبی تعلقات کے بارے میں چھڑ گئی۔ غالب نے، جو اپنے ذہن کی چستی اور فی البدیہہ شعر گوئی کے لیے مشہور تھے فوراً حسبِ ذیل شعر موزوں کر کے سنایا:

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

سراج الدین بادشاہ کا اصلی نام تھا، انھوں نے تخت نشینی کے بعد ہی اسے بہادر شاہ میں تبدیل کیا۔ وہ اپنے استاد کی جولانی طبع کے اس بے ساختہ مظاہرے سے یقیناً بہت محظوظ ہوئے ہوں گے۔ دراصل یہی وہ مشترکہ حسِ مزاح تھی جس کی بہ دولت وہ ان متنازع فیہ امور کے تعلق سے بھی جن کے بارے میں ان کے خیالات بنیادی طور پر مختلف تھے مرورِ زمانہ کے ساتھ رواداری اور ہم آہنگی کا موقف اختیار کر پائے۔ بادشاہ ایک دین دار مسلمان تھے، پنج وقتہ نماز کے پابند تھے اور روزوں کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ غالب مذہبی رسوم پرستی

سے بے زار تھے اور ماہِ رمضان کے روزے کبھی نہیں رکھتے تھے ۔ ماہ رمضان کے اختتام پر ایک دفعہ بادشاہ نے غالب سے دریافت کیا کہ تم نے کتنے روزے رکھے ۔ بغیر کسی جھجک کے اور متین چہرہ بنا کے غالب نے جواب دیا : " پیر و مرشد ایک نہیں رکھا " ۔ اس کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ان کا بس ایک روزہ چھوٹا اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ایک روزہ بھی نہیں رکھا ۔ بادشاہ جانتے تھے آخر الذکر بات صحیح تھی ۔ لیکن وہ مسکرائے اور معاملے کو نظر انداز کیا ۔ اسی رنگ میں غالب نے ایک دفعہ ظفر کو حسبِ ذیل اشعار پڑھ کر سنائے :

افطارِ صوم کی کچھ اگر دست گاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

یہ امرِ واقعہ کہ غالب بادشاہ سے ان الفاظ میں مخاطب ہوسکتے تھے وہ بھی اس موضوع پر جس کے بارے میں بادشاہ کے خیالات عقیدہ پرستانہ تھے ظفر کی رواداری کا بھی بہت بڑا ثبوت ہے اور اس خوش گوار خصوصی تعلق کا بھی جو بادشاہ اور استادِ شہ کے درمیان اب قائم تھا ۔

دنیوی حیثیت سے ۱۸۵۴ء یعنی وہ سال جب وہ استادِ شہ بنے غالب کا بہترین دور تھا ۔ اس سے پیشتر اسی سال بادشاہ کے فرزند اور ولی عہد مرزا فخر الدین المتخلص بہ رمز بھی ان کی شاگردی میں آچکے تھے جہاں غالب کی سالانہ تنخواہ چار سو روپیے مقرر ہوئی تھی ۔ مرزا فخرالدین کی شادی نواب شمس الدین کی بیوہ سے ہوئی تھی ۔ اس امرِ واقعہ کے پیشِ نظر کہ غالب کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ انھوں نے شمس الدین کو مجرم قرار دینے میں انگریزوں کی مدد کی تھی ، یہ امرِ واقعہ کہ مرزا فخر الدین نے غالب کو اپنا استاد مقرر کیا نوجوان شہ زادے کی عالی ظرفی پر بھی دال ہے اور شہر کے مانے ہوئے سرکردہ شاعر کی حیثیت سے غالب کی شہرت پر بھی ۔ کم و بیش اسی زمانے میں اودھ کے فرماں روا نواب واجد علی شاہ پر اثر انداز ہونے کی غالب کی متواتر مساعی بھی بار آور ہوئیں ۔ واجد علی شاہ نے ان کے لیے ازراہِ عنایت سالانہ تنخواہ پانچ سو روپے مقرر کی ۔ غالب کے لیے ، جن کی مالی حالت ہمیشہ سقیم رہی ،

آمدنی میں یہ اضافہ نہایت خوش آئند تھا۔ لیکن یہ خوش گوار صورت حال بالکل ہی عارضی ثابت ہوئی، جیسے طویل اور ناقابلِ تغیر زوال سے قبل پہاڑ کی چوٹی پر روشنی کی کرنیں دم بھر کے لیے روشنی بکھیر دیں۔ اس وقت تک غالب بوڑھے ہوچکے تھے اور ان کی صحت تیزی سے بگڑ رہی تھی۔ دہلی کی روایتی بیماریوں ملیریا بخار اور دل کے پھوڑے سے غالب بچ نہیں پائے۔ ان پر اکثر قولنج کے شدید حملے بھی ہوجاتے تھے۔ ان کی بصارت کم زور ہوگئی تھی اور انھیں اونچا سنائی دیتا تھا۔ " مہر نیم روز " کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں کہ ان کی انگلیوں کے جوڑ اکڑ گئے ہیں اور ان کے لیے قلم پکڑنا مشکل ہوگیا ہے۔ ان کے اس زمانے کے خطوط میں وہ اکثر اپنی گرتی ہوئی صحت، دانتوں کے گرنے، بڑھتی ہوئی گراں گوشی، چہرے کی جھرّیوں، ہاتھوں کے رعشے اور بالوں کے جھڑنے کا ذکر کرتے ہیں۔

مومن اور ذوق کی موت ان کے لیے ایک صدمہ تھی۔ حالاں کہ ذوق میدانِ شاعری میں ان کے مدِّ مقابل تھے اور یہ مقابلہ اکثر ذاتی طنز و تعریض پر بھی منتج ہوتا تھا، لیکن بہ ہر حال وہ ان کے ساتھی شاعر اور معاصر بھی تھے، ایک ایسے تاریخی دور کے شاہد عینی تھے جس سے وہ اکٹھا گزرے تھے، ایک مخصوص معاشرتی ماحول کے تسلسل کی علامت تھے۔ ان کی موت نے غالب کو یکایک ان کی بڑھتی ہوئی کبر سنی کا احساس دلایا۔ جب تین سال قبل مومن کا انتقال ہوا تھا تو ایک دوست کے نام خط میں غالب نے لکھا تھا: " دیکھو بھائی ہمارے بچے مرے جاتے ہیں، ہمارے عزیز مرے جاتے ہیں۔ قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پادر رکاب بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس تینتالیس برس ہوئے، یعنی چودہ چودہ، پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اور اس میں ربط پید ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔ حضرت! چالیس بیالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا، دوست تو کہا ہاتھ آتا ہے۔ " تاہم اپنی اس دل گیری کے باوجود وہ اب بھی اپنی پر جوش خوش مزاجی کامظاہرہ کرتے ہیں، خوش وقتی کے مختصر لمحوں کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور مزہ لے لے کر خاص طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں۔ مومن اور عارف کے انتقال کے کچھ ہی عرصے بعد ۱۸۵۳ء میں تفتہ کے نام خط میں وہ بچوں کی سی شادمانی کے ساتھ انھیں مطلع کرتے ہیں " قرض متفرق سب ادا ہوا، بہت سبک دوش

ہوگیا۔ آج میرے پاس سینتالیس نقد بکس میں اور چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔۔۔ الحمدللہ علیٰ احسانہٖ۔"

لیکن ایسی جولانی کے مظاہروں میں اب بہ تدریج کمی آتی ہے اور غالب رفتہ رفتہ سمجھ جاتے ہیں کہ ان کی زندگی کا بہترین دور ختم ہوا اور زوال کا ناگزیر دور شروع ہوچکا ہے۔ ان کا ذہن اب موت کے سوال کی طرف بار بار متوجہ ہوتا ہے کہ انھیں اور کتنے دن جینا ہے اور کتنے دن تصنیف کا کام جاری رکھ سکیں گے۔

۱۸۵۴ء میں اس امر کا سبھی کو علم ہوگیا کہ انگریزوں کا ارادہ برائے نام مغل بادشاہ کے اختیارات میں مزید قطع برید کا ہے۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ کا الحاق کرلیا۔ اسی سال مغل ولی عہد مرزا فخرالدین کا انتقال ہوا۔ غالب ان دو ذرائع سے اپنی آمدنی سے محروم ہوگئے۔ مغل بادشاہ کے مستقبل کے غیر یقینی ہونے کی صورت حال اور بھی زیادہ تشویش کا باعث تھی۔ حالات روز بہ روز بدتر اور ڈراؤنے ہوتے جارہے تھے۔ غالب فکرمند تھے کہ ان کے شاگرد ولی عہد مرزا فخرالدین کی موت کے بعد مغل دربار سے ان کا تعلق بادشاہ کی زندگی تک ہی یقینی تھا۔ بہ ظاہر مرزا فخرالدین سے غالب کے تعلقات نہایت مخلصانہ تھے۔ مقررہ تنخواہ کے علاوہ شاہ زادے کی طرف سے غالب کے پوتوں (یعنی عارف کے دو بیٹوں) کی میوہ خوری کے لیے ماہانہ دس روپے بھی ملتے تھے۔ اب یہ آمدنی بھی بند ہوگئی۔

لیکن اگر غالب کو معلوم ہوتا کہ ۱۸۵۷ء کی اتھل پتھل میں جلد ہی روزمرہ کی زندگی کے یہ جانے بوجھے نشیب و فراز کلیتہً تہس نہس ہونے والے ہیں تو وہ ان چھوٹے نقصانوں پر فکرمند بالکل نہ ہوتے۔ اس روح فرسا واقعے کے بعد وہ اور بھی کئی سال جییں گے اور دیکھیں گے کہ ان کی اپنی آنکھوں کے سامنے وہ سارا سماجی نظام، جس سے اور صرف جس سے ان کی اقدار معنویت اور زندگی کے تقاضوں سے مناسبت کی حامل تھیں، بہ تدریج شکست و ریخت کے عمل سے گزرتا ہے۔ نہ ہی غالب، نہ ہی دہلی اور نہ ہی وہ تہذیب جو ان دونوں کو ایسے اٹوٹ رشتے میں باندھے ہوئے تھی، کبھی اپنی اصلی حالت کو لوٹ پائیں گے۔

○●○

باب : چار

۱۸۵۷ء کا صدمہء جاں کاہ

۱۸۵۷ء سے ایک تاریخی دور کے اختتام کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں مغلوں کی، بڑی محنت سے بنائی ہوئی صدیوں پرانی، سماجی اور تہذیبی عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ غالب کے مقدر میں لکھا تھا کہ وہ ایک عہد کے اختتام کے لاچار اور دل شکستہ شاہدِ عینی کی حیثیت سے ۱۸۶۹ء تک جییں۔ نظریہء حیات کے لحاظ سے گنگا جمنی اور ظاہری شکل کے لحاظ سے شُستہ و شائستہ اور نستعلیق، وہ ترقی یافتہ اور خود اعتماد تہذیب جو ان کی زندگی اور کارناموں کا آسرا اور سہارا تھی اب اپنی اصلی حالت کو کبھی نہ لوٹے گی۔ انھیں لال قلعے یعنی قلعہء معلیٰ کو فوجیوں کی بارکوں میں متبدل دیکھنے کے لیے جینا پڑے گا۔ ان کو وہ دن بھی دیکھنا پڑے گا جب حضور پرنور، ظل اللہ فی الارض بے صدائے نقیب اور خوش خوانوں کی نغمہ سرائی کے بغیر جلاوطن کردیے جائیں گے اور پردیس سے واپس کبھی نہ لوٹیں گے۔ وہ دن دیکھنا بھی ان کے نصیب میں ہے جب ان کی پیاری دلّی کے ساتھ منصوبہ بند طریقے سے ایسا بے رحمی کا سلوک کیا جائے گا کہ اس کو پہچانتا بھی مشکل ہوجائے گا۔

سبھی کو معلوم ہے کہ وہ معروضی وجوہ کیا تھیں جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا باعث ہوئیں، ان کا متعدد علمی کاوشوں میں تفصیل سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ چناں چہ یہاں ان کے اعادے سے احتراز کیا جائے گا۔ تاہم موضوعی سطح پر شاید ہی ایسی کوئی شہادت ملے کہ اس اتھل پتھل کا دلّی والوں کو بہ ظاہر پہلے سے کوئی سان گمان تھا یا ان کے لیے یہ انقلابِ عظیم کوئی متوقع بات تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مبہم سی بے چینی ضرور تھی۔ لیکن بنیادی طور پر اس کا مرکزِ توجہ شاہی حکومت کے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائیاں تھیں۔ لوگوں کو عام طور پر اس کا علم تھا کہ انگریزوں کا منصوبہ یہ ہے کہ مغلوں کی سکونت کو لال قلعے کے شاہی پس منظر سے ہٹا کر کہیں شہر کے باہر قطب صاحب کے پاس منتقل کردیا جائے اور ظفر کے جانشین کا خطاب "شاہ" نہیں بلکہ "شہ زادہ" ہو۔ محلِ شاہی اور شہر میں کم از کم چند افراد ایسے ضرور تھے جن کا خیال تھا کہ شہنشاہ ایران یا زار روس فرنگیوں کو نکال باہر کرنے اور مغل شاہی خاندان کی عہدِ گذشتہ کی عظمت کو بحال کرنے کے لیے مداخلت کریں گے۔ فی الحقیقت دو ماہ قبل اس مضمون کا اشتہار کہ شاہِ ایران اپنے مظلوم مسلم ہم مذہبوں کی مدد کو آئیں گے چند گھنٹوں کے لیے جامع مسجد کی دیواروں پر چسپاں پایا گیا تھا۔ بعض نجومی اور فال نکالنے والے بھی، جن میں خود محلِ شاہی کے اندر کے ایک رمال "روسی رس پوتن کے ایک دھندلے ابتدائی نمونے" پیرزادہ حسن عسکری شامل تھے، نامبارک واقعات کے ظہور کی پیشین گوئی میں سرگرم تھے۔ لیکن دہلی کی گپوں اور افواہوں کے بہاؤ میں ان کی حیثیت معمولی گردابوں اور بلکوروں کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۱/ مئی ۱۸۵۷ء کو جب دلّی میں بغاوت کا آغاز ہوا شاید ہی کوئی امر ایسا رہا ہو جو غالب کو خبردار کرتا کہ یہ دن ان کی زندگی کے بندھے ہوئے ڈھرے میں ایسی بنیادی تبدیلی لائے گا۔

میرٹھ کے سپاہیوں کی پہلے پہل بہادر شاہ ظفر نے اس وقت شناخت کی جب وہ کشتیوں کے پل پر سے اپنے گھوڑے پویہ دوڑاتے ہوئے آرہے تھے۔ ظفر اپنے نجی کمرے میں بیٹھے جمنا پار ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے فوراً اپنے معتمدِ خاص حکیم احسن اللہ خاں کو، جو غالب کے بھی قریبی دوست تھے، طلب کیا۔ صبح کے کم و بیش سات بجے تھے اور ابھی تک شہر قریب آتے ہوئے طوفان سے بے خبر تھا۔ دہلی کالج کے طالبِ علم اپنی

اپنی جماعتوں میں تھے ، کلکتے سے اخبار حسبِ معمول آچکا تھا ، کلکٹر کی عدالت کا اجلاس جاری تھا اور غالب غالباً قلعہ ء معلیٰ کو جانے کی تیاری کر رہے تھے : دلی والے موسم گرما کے ایک عام دن کے بندھے ہوئے کاموں سے نبٹنے کے لیے جاگ پڑے تھے ۔ تھوڑی ہی دیر میں سپاہیوں کے دستے لال قلعے کی فصیلوں تک پہنچ گئے اور بہادر شاہ ظفر سے التجا کی کہ انھیں اندر آنے دیا جائے ۔ ظفر نے اس شورش کو پسند نہیں کیا اور سپاہیوں کو داخلے کی اجازت دینے کی بہ جائے انھوں نے شاہی محل کے پہرہ داروں کے انگریز کمیدان کیپٹن ڈوگلاس کو طلب کیا ۔ سوار آگے بڑھ گئے اور شہر میں دریا گنج کے قریب راج گھاٹ دروازے سے داخل ہوگئے ۔ اب شہر کے لوگوں کو اور دہلی میں تعینات فوجی دستوں کو باغیوں کے ساتھ آملنے میں دیر نہیں لگی ۔ انگریزوں اور اینگلو انڈین افراد کا بلاتردد قتلِ عام کیا گیا ۔ سب سے پہلے قتل کیے جانے والوں میں مشہور و معروف نو عیسائی ڈاکٹر چمن لال بھی شامل تھے ۔ غالب کے روزنامچے میں ان واقعات کا یہ اندراج ملتا ہے : "۱۶ / رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ / مئی ۱۸۵۷ء اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں ، جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا ۔۔۔ ان مدہوش سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور محافظ مہمان نواز ہیں ، دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے ۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے ، جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا ، ادھر سے رخ نہیں پھیرا ۔۔۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور دغوغا سنا ۔ چاہتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اتنے میں شور مچ گیا کہ اندرونِ قلعہ صاحب اجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیے گئے ۔ ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں ۔۔۔ " شام ہونے تک دیوانِ خاص سے ملحق باغوں میں سپاہیوں کے سرگروہوں اور مشتعل مغل شہ زادوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا تھا جو بہ یک آواز پر جوش استدعا کر رہے تھے کہ بادشاہ اس بغاوت کے حق میں دعا کریں اور اپنا آشیرواد دیں ۔ بادشاہ کو تامل تھا لیکن ان کے لیے شاید ہی کوئی دوسرا چارہ ء کار تھا اور انھوں نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ اس سارے ہنگامے سے ہوسکتا ہے کہ کچھ فائدے کی صورت بھی نکل آئے ۔ انھوں نے

بغاوت کے حق میں دعا کی اور اپنا آشیرواد دیا۔ دہلی نے بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ چار ماہ سے زاید عرصے تک یعنی ۱۳/ ستمبر ۱۸۵۷ء تک جب کہ انگریزوں نے شہر پر دوبارہ قبضہ کیا یہ جھنڈا اونچا لہراتا رہے گا۔

غالب کے اس بغاوت میں شمول کی نوعیت کیا تھی؟ یہ مسئلہ کسی قدر متنازع فیہ ہے۔ غالب اور ان کے طبقے کے دیگر بہتیرے افراد کے لیے، ان منقسم وفاداریوں کے دھندلکے کے پیش نظر جس میں ان کی زندگی بسر ہورہی تھی یہ بغاوت، فی الحقیقت ایک بھیانک خواب تھا۔ انگریز بالفعل حاکم تھے۔ مغل بادشاہ ازروے قانون احترام کی علامت تھے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل کے سالوں کے سیاسی جھٹ پٹے میں، اس موقف کی بنیادی لغویت کو مرکز توجہ بنائے بغیر، دونوں کے سامنے اظہار اطاعت کو کسی نہ کسی طرح ہم آہنگ بنالینا ممکن تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے واقعات سے دفعتہً یہ دھندلکا چھٹ گیا۔ اب ضروری ہوگیا کہ آپ اپنے موقف کا دو ٹوک انتخاب کرلیں: آپ یا تو انگریزوں کے خلاف اور مغل بادشاہوں کے حامی ہوسکتے ہیں یا بہ صورت دیگر مغل بادشاہ کے خلاف اور انگریزوں کے حامی۔ غالب نے "دستنبو" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی جو بہ ظاہر ایک روزنامچہ ہے، جسے انھوں نے جیسے جیسے ان پرآشوب مہینوں میں واقعات رونما ہوئے بے ساختہ لکھا۔ کتاب شدت سے انگریزوں کی طرف دار ہے اور بغاوت کے تعلق سے سنگ دلی کی حد تک پر ملامت ہے۔ اگر ہم اس کتاب کے لفظی معنی مراد لیں تو ہمارے لیے یہ نتیجہ نکالنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ غالب نے ۱۱/ مئی ۱۸۵۷ء کو ہی غیر مبہم طور پر اپنے موقف کا انتخاب کر لیا تھا اور وہ یہ تھا کہ انگریز ہندستان کے واحد قانونی فرماں روا ہیں۔ جنھوں نے ان کے خلاف بغاوت کی وہ بے ڈھنگے اور گنوار و نمک حرام ہیں اور بغاوت کا قلعہ قمع صاف اور فلاح و بہبود کی واپسی کا پیش خیمہ ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس کتاب کے لفظی معنی مراد لینا ہمارے لیے ممکن ہے؟ دست یاب شہادت ہمیں ایسا کرنے سے خبردار کرتی ہے۔ "دستنبو" شاید ہی ۱۸۵۷ء کے واقعات کی ایک بے ساختہ روداد یا غالب کے خیالات کا حقیقی اظہار ہے۔ "دستنبو" شہر پر انگریزوں کے دوبارہ قابض ہونے کے بعد یا کم از کم بالکل آخر میں اس وقت لکھی گئی

جب یہ واضح ہوگیا کہ بغاوت ایک سعی رائیگاں ہے اس کا محدود مقصد انگریزوں کی نظر میں غالب کی بے گناہی ثابت کرنے میں مدد دینا تھا۔ ایسا کرنا ذہنی کاسہ لیسی کی بات نہیں تھی، یہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی بات تھی۔ فتح مند انگریزوں کو رحم دلی سے کوئی سروکار نہیں تھا، ذرا سا شبہہ بھی کسی کو پھانسی پر چڑھانے کے لیے کافی تھا۔ غالب کے سامنے دو مقصد تھے: اولاً اپنے خلاف کسی انتقامی کارروائی کا تدراک کرنا، ثانیاً اپنے خلوصِ نیت کو اس حد تک ثابت کرنا کہ انگریز ان کی پنشن کے دوبارہ اجرا پر آمادہ ہوجائیں۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے، یہ بھی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی بات تھی۔ مغل دربار کے خاتمے کے بعد غالب کسی اور ذریعہء آمدنی کی آس نہیں لگا سکتے تھے اور انتہائی تنگ دستی کا شکار تھے۔ اس طرح سے "دستنبو" حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ تھا۔ گو کہ ظاہری شکل میں یہ کتاب ایک بیانیہ تھی، اسلوب بیان میں یہ قصیدے سے مشابہ کوئی چیز تھی اور قصیدہ، جیسا کہ سب جانتے ہیں فرماں روا کو داد و دہش پر آمادہ کرنے کے لیے شاعروں کا قدیم اور آزمودہ نسخہ تھا۔ اس کی توقع نہیں رکھی جاتی تھی کہ شاعر قصیدے میں کی جانے والی وافر اور پر شوکت مدح سرائی اور اس میں مذکورہ ضمنی باتوں پر فی الحقیقت یقین بھی رکھتا ہے۔ قصیدہ ایک محدود مقصد رکھتا تھا اور وہ تھا صاحبان اختیار کو متاثر کرنا۔ "دستنبو" کا تعلق بس اسی صنفِ ادب سے تھا۔ جاگیردارانہ ماحول کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے غالب بس اسی طریقے سے اپنی حفاظت کرنا جانتے تھے۔ آگے ہم دیکھیں گے کہ وہ خود بھی "دستنبو" کو اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسری شہادت بھی موجود ہے جس سے بغاوت سے ان کے تعلق کا اور اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے حقیقی خیالات اس طرزِ خیال سے بالکل مختلف تھے جس کی "دستنبو" جیسی پرزور طریقے پر انگریزوں کی طرف دار کتاب کے مصنف سے توقع رکھی جانی چاہیے۔

غالب نے "دستنبو" میں انگریزوں کی مدح سرائی اسی بلند آہنگی سے کی ہے جیسے کہ قصیدے میں کی جاتی ہے اور اتنی ہی کھلی ہوئی سخن سازی کے ساتھ بھی۔ انگریزوں کے ہر ذکر کو ستائشی اسمائے صفت کے ساتھ شروع کرنا اس شخص کے لیے کوئی ایسی مشکل بات نہیں تھی جس کو اقرار تھا کہ اس نے اپنی آدھی عمر احمقوں کی بھٹی میں صرف کی ہے۔

چناں چہ وہ ملکہ ء وکٹوریہ کو " ملکہ ء انصاف پسند ، فلک رفعت ، ستارہ حشم " لارڈ کیننگ کو " سکندر جاہ ، فریدوں حشم " اور سرجان لارنس کو " حاکمِ مہربان ، خورشید طلعت ، ستارہ حشم " قرار دیتے ہیں۔ انگریزوں کے لیے عموماً " بہادر ، نیک سرشت ، باہمت ، شیر دل اور انصاف پسند " جیسے دوسرے اسمائے صفت استعمال کیے گئے ہیں جب کہ باغیوں کے ہاتھوں ماری جانے والی انگریز عورتوں کو " پری چہرہ ، نازک بدن خواتین " قرار دیا گیا " جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچی چاندی کی طرح دمکتے تھے ۔ " ایک مقام پر غالب خطیبانہ انداز میں پکار اٹھتے ہیں : " تم نہیں دیکھتے ہو کہ " دامن " و " دام " اور " داد " و " دد " میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے علاوہ دوسری حکومت میں انصاف کی امید رکھنا بالکل نادانی ہے ۔ " یہ اس شخص کے رشحات قلم ہیں جس نے زرِ کثیر اور اپنی آدھی عمر انگریزوں سے انصاف پانے کی کوشش فضول میں صرف کی تھی ! انیسویں صدی عیسوی کے ہندستان میں شاعر اور ادیب کے لیے بغیر سوچے سمجھے خوشامدانہ الفاظ کی بھرمار کردینے کی صلاحیت پر عبور معمول کی بات تھی ۔ یہ روزی روٹی کی اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی بات تھی اور کسی طرح سے بھی تخلیقی عمل سے بے آہنگ نہیں تھی ۔ فی الحقیقت یہ تخلیقی عمل کو جاری رکھنے کے لیے وسائل کے حصول کی ایک لازمی شرط تھی ۔ غالب کے لیے زیادہ مشکل کام شہر پر دوبارہ قبضے کے بعد انگریزوں کی سفاکی کو بہ جا ثابت کرنا یا پھر لیپاپوتی کے ذریعے اس پر پردہ ڈالنا تھا ۔ وہ اس پہلو کا کسی قدر ذکر کرنے سے گریز نہیں کرسکتے تھے ۔ یہ اپنے بیانیہ کو اعتبار و استناد کا جامہ پہنانے کی کوشش کے لیے لازمی تھا ۔ لیکن ان کی یہ کوشش کسی طرح سے بھی معقول نہیں ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : " میں نے ابھی کہا کہ غضب ناک شیروں (یعنی انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی کچھ بے سر و سامان لوگوں کو قتل کرنا اور چند مکانوں کو جلانا جائز سمجھا ۔ ہاں ، جس مقام کو لڑکر فتح کرتے ہیں ، لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں ۔ " چند صفحات کے بعد : " مشہور بھی یہی ہے کہ عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں ، قتل نہیں کرتے ۔ ۔ ۔ (اگر چہ انگریزوں) کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی (لیکن انھوں نے) ضبط کیا ۔ " لیکن اسی صفحے پر : " شہر کے اندر کے رہنے والے ۔ ۔ ۔ سب کے دل درد سے بھرے ہوئے ہیں اور سب قتلِ عام کے خوف سے ہراساں

ہیں۔" اور پھر: "مختصر یہ کہ فاتحین نے راستے میں جس شخص کو پایا قتل کردیا۔ شہر کے عالی خاندان اور صاحبِ عزت افراد عزت اور آبرو کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔" اسی انداز میں لکھتے ہیں: "جمعے کے دن محرم کی ۲۶ / تاریخ تھی اور ستمبر کی ۱۸ / ۔۔۔ فاتحین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کرلیا۔ کشت و خون اور پکڑ دھکڑ کی (آفت) اس گلی تک آگئی، خوف سے لوگوں کے دل دہل گئے۔۔۔ (چاندنی) چوک کے آگے قتل و خون کا بازار گرم ہے اور راستہ پر خطر ہے۔" اسے چھپانے کی غالب کی تمام کوششوں کے باوجود حقیقت بے ارادہ ظاہر ہوجاتی ہے۔ ان کے حقیقی خیالات دوستوں کے نام ان کے خطوط کے لیے مختص تھے۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے یہاں بھی اپنی جان کے خوف سے وہ انتہائی محتاط تھے۔

اصل فکر مغل دربار سے اپنے تعلق کو کم کرکے دکھانے کی تھی۔ انگریز خصوصی جوش کے ساتھ ان سب کی تلاش میں تھے جن کے بارے میں شبہہ تھا کہ وہ دربار کے اندرونی حلقے سے تعلق رکھتے تھے۔ شاعری میں استادِ شہہ ہونے کے ناطے غالب پر شبہہ تھا۔ ممکنہ انتقامی کارروائیوں کے خلاف پیش بندی ضروری تھی۔ محل شاہی سے اپنے تعلقات سے سراسر انکار تو بےوقوفی ہوگی۔ لیکن وہ اس تعلق کو ہلکا کر کے تو بیان کرسکتے تھے، اس کی اہمیت کو کم سے کم کر کے دکھا سکتے تھے اور خود کو بادشاہ کے حلقہ ہائے مقربین کے حاشیے پر محض ایک ملازم کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اس تعلق کی ماہیت کو گھٹا کر تو دکھا سکتے تھے۔ "دستنبو" کے ابتدائی صفحات ہی سے وہ یہی طرز عمل اختیار کرتے ہیں:

> "اس کتاب کے پڑھنے والے یہ سمجھ لیں کہ میں نے ۔۔۔ انگریزی حکومت کے نان و نمک سے پرورش پائی ہے اور بچپن سے ان فاتحینِ عالم کے دستر خوان کا ریزہ چین ہوں۔ سات آٹھ سال ہوئے کہ بادشاہِ دہلی نے مجھے بلایا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں تیموری خاندن کے بادشاہوں کی تاریخ لکھوں، جس کے عوض ۶۰۰ روپے سالانہ دیا جائے گا۔ میں نے اس خدمت کو قبول کرلیا اور کام میں مشغول ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد

بادشاہ کے استاد کا انتقال ہوگیا اور اصلاحِ شعر کا کام بھی مجھ سے متعلق کردیا گیا۔ (یہاں وہ چابک دستی قابلِ توجہ ہے جس کے ساتھ غالب سرسری طور پر اپنے استادِ شہ بننے کا ذکر کرتے ہیں)۔

میں بوڑھا اور کم زور تھا، نیز گوشہء تنہائی میں بیٹھے رہنے اور آرام کرنے کا عادی ہوچکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہرے پن کی وجہ سے بارِ خاطر حاضرین ہو جاتا تھا۔ کوئی بات کر رہا ہے اور میں اس کے ہونٹوں کی جنبش پر نظر جمائے ہوئے ہوں۔ مجبوراً ہفتے میں ایک دو بار قلعے میں جاتا تھا، اگر بادشاہ محل سے برآمد ہوتے تھے تو کچھ دیر حاضرِ خدمت رہتا تھا ورنہ دیوانِ خاص میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا آتا تھا۔

اس مدت میں جتنا کام مکمل ہوجاتا اس کو اپنے ساتھ لیے جاتا تھا یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا تھا۔ یہ تھا میرا تعلق اور میرا کام۔ لیکن یہ تیز رفتار آسمان اس خیال میں محو تھا کہ ایک نئے انقلاب کا خاکہ مرتب کرے اور میرے اس سکون و آرام کو جس میں آسائش و فراغت کا کوئی حصہ نہیں تھا اور جو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک تھا، تباہ کردے۔"

لیکن یہ کافی نہیں تھا۔ مانا کہ انھوں نے بغاوت کی حمایت نہیں کی لیکن وہ اس کی مخالفت میں بھی تو کچھ کر سکتے تھے؟ غالب اس ممکنہ الزام کے خلاف بھی پیش بندی فوراً ہی کرتے ہیں:

"کچھ مسکین، گوشہ نشین جن کو انگریزی حکومت کی مہربانی سے کچھ نان و نمک میسر تھا، شہر کے مختلف علاقوں میں ایک دوسرے سے دور زندگی کے دن گزار رہے تھے، (ایسے مسکین و صلح پسند) جو تیر و تبر کے فرق سے ناواقف تھے اور

> اندھیری راتوں میں چوروں کے غل سے ڈر جاتے تھے ، جن کے ہاتھ تیر و تلوار سے خالی تھے ۔ سچ پوچھو تو ایسے لوگ ہر گلی کوچے اور شہر کے ہر حصے میں ہیں ۔ یہ وہ لوگ نہیں جو لڑائی کے ارادے سے کمر کس کر تیار ہوسکیں ۔ اس کے باوجود (کہ ایسے صلح پسند و خیر خواہ شہر کے ہر حصے اور ہر گلی کوچے میں تھے) اس وجہ سے کہ تیز بہنے والے پانی کو خس و خاشاک سے نہیں روکا جاسکتا ، اپنے کو مجبور سمجھ کر ہر شخص غم گین و ماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا ۔ "

وہ بغاوت کے اشخاص ڈراما کے اہم ترین اداکار " سپاہی " کی نکتہ چینی خصوصی شدت کے ساتھ کرتے ہیں ۔ گمان ہوتا کہ یہاں مصلحت اور ذاتی رائے میں توافق پایا جاتا ہے ۔ غالب انسانی مساوات پر عقیدہ رکھنے والوں میں سے نہیں تھے ۔ ان کی وفاداری جاگیردارانہ نظام مدارج کے ساتھ تھی ، جہاں ان کے خیال میں ان کا جائز مقام چوٹی کے آس پاس تھا ۔ اس نظام کو جسے دستور قدیم کی حرمت حاصل تھی انگریزوں کی طرف سے روز افزوں خطرہ تھا ۔ لیکن یہ اسی آسانی سے " فسادی پیادہ سپاہیوں " ، " عوام کالانعام " اور " انبوہِ سرکش " کے حملوں سے بھی ریزہ ریزہ ہوسکتا تھا چناں چہ اگر وہ متکبر انگریزوں کے وکیل نہیں تھے تو سپاہیوں کی اکڑ کی بھی تائید ہرگز نہیں کرتے تھے ۔ اس امر کی شہادت ہے کہ جب بغاوت شروع ہوئی تو اپنی طاقت اور قدر و قیمت کے نئے احساس سے شہ پاکر سپاہی اس اطاعت شعاری کے تعلق سے بڑی حد تک لاپروا ہوگئے تھے جس کی جاگیردار طبقہ ، امرا کے افراد ان سے توقع رکھتے تھے ۔ رویے کی اس تبدیلی پر سب سے پہلے بادشاہ نے دھیان دیا اور انھوں نے برملا اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا ۔ اپنے عہدہ داروں کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے سخت الفاظ میں شکایت کی کہ ان کے حضور میں سپاہیوں کا گنوار و برتاؤ نہایت قابلِ اعتراض تھا ۔ اپنے بیٹے مرزا مغل کے نام خط میں بھی وہ یہی راگ الاپتے ہیں : " وہ (یعنی سپاہی) ناشائستہ طور پر ملبوس ، پگڑی کے بغیر گھوڑے پر سوار (قصرِ شاہی کے) اندر چلے آتے ہیں ۔ ۔۔ حالاں کہ جب کبھی انگریزی حکومت کا کوئی عہدہ دار بھی محل میں آتا تو وہ دیوانِ عام کے

دروازے پر گھوڑے سے اتر جاتا اور آگے پیدل چلتا ۔ ۔ ۔" سپاہی بہادر محبانِ وطن تھے ، لیکن ان کی خاصی تعداد لوٹ اور غارت گری کی عام کم زوری سے بچی ہوئی نہیں تھی ۔ بہادر شاہ شکایت کرتے ہیں : " ۔ ۔ ۔ سپاہیوں نے دن ہو یا رات ۔ ۔ ۔ بازار لوٹے ہیں ۔ اس بہانے سے کہ کوئی انگریز اندر چھپا ہوا ہے وہ لوگوں کے ذاتی مکانوں میں گھس جاتے ہیں اور انھیں لوٹ لیتے ہیں ۔ وہ تالے توڑ کر کواڑ اور دروازے اٹھالے جاتے ہیں اور نہایت بے شرمی سے اندر کاسامان لوٹ لیتے ہیں ۔ "

جاگیر دار بزرگِ خاندان غالب کو عوام کا لانعام کی بے باکی اور ان کا جابرانہ طرزِ عمل ناگوار گزرتا تھا ۔ اس صورت حال پر ان کی ماتم سرائی میں حقیقی کراہت کی گونج سنائی دیتی ہے :

" (زمانے کی) اس بے نیازی و بے امتیازی کو کیا کہوں کہ وہ کم رتبہ لوگ ، جو سارا دن مٹی بیچنے کے لیے زمین کھودتے تھے ، ان کو مٹی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی محفل میں رات میں آتشِ گل سے چراغ روشن رہتے تھے ، اندھیرے گھروں میں ناکامی و نامرادی کے غم میں مبتلا ہیں ۔

کوتوال شہر کی زن و دختر کے علاوہ ساری نازنینانِ شہر کا زیور بزدل اور سیہ کار رہ زنوں کے قبضے میں ہے ۔ (زیور اور آرائش سے معرا ہونے کے بعد) ان نازنینوں میں جو ہلکا سا اندازِ ناز باقی رہا تھا ، اس کو نو دولت گدازادوں نے چھین لیا کہ ان کی خودنمائی کے کام آئے ۔ جو محبت کرنے والے نازنینوں کے ناز اٹھاتے تھے ، وہ اب ان بدنہادوں کے ناز اٹھانے پر مجبور ہیں ۔ ان گھٹیا لوگوں کے دماغوں میں غرور اس حد تک سما گیا ہے کہ اگر ان کی حرکات کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کچھ بگولے چکر کھاتے پھر رہے ہیں اور چھچھورے ہر وقت اس طرح ناز خود نمائی میں محو رہتے ہیں ، گویا پانی کی سطح پر کچھ تنکے

بہتے چلے جا رہے ہیں۔

> بڑے بڑے عالموں اور نام وروں کی آبرو مٹی میں ملادی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزت، وہ بے اندازہ زر و جواہر اور عزت و آبرو کے مالک ہیں۔ جس کا باپ گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا، وہ ہوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے۔ جس کی ماں پڑوسی کے گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی وہ آگ پر حکم چلانے کا مدعی ہے۔ کمین، آگ اور ہوا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔۔۔"

چناں چہ غالب کی طرف سے سپاہیوں کی مذمت کی تہ میں میلے کچیلے عوام کالانعام کے تعلق سے طبقاتی تنفر کا جذبہ بہ طورِ اساس کار فرما ضرور ہے۔ ان کے ذہن کے کسی نہاں خانے میں یہ خیال ضرور ہے کہ ایسے لوگوں کی اپنے آقاؤں سے وفاداری کے معاہدے کی خلاف ورزی غیر اخلاقی اور نمک حلالی کے جاگیر دارانہ اصول کے بر خلاف تھی۔ لیکن اس اساس پر کھڑی کی گئی عمارت کی غالب جان بوجھ کر حشو و زوائد سے تزئین و آرائش کرتے ہیں تاکہ " دستنبو " کے انگریزوں کی طرف داری سے مملو مشمولات کو تقویت پہنچے۔ سپاہیوں کے خلاف ان کے خیالات کا اس دو ٹوک انداز سے اظہار شروع سے محض اس وجہ سے ممکن نہ تھا کہ جب بغاوت شروع ہوئی تو انگریزوں کی فتح کو ایسا مآلِ کار سمجھنا مشکل تھا جو پہلے سے طے ہو۔ سپاہیوں اور ان کے سرگروہوں کے اقتدار کے نئے مرکز کی حیثیت سے ابھرنے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا اور ان لوگوں کے لیے انگریزوں کی طرف داری کے جذبات انتہائی ناقابلِ برداشت تھے، انگریزوں کے ہم درد اور مخبر ہونے کے ذرا سے بھی شبہہ پر یہ لوگ بیسیوں کو قتل کر چکے تھے۔ دستنبو میں ہمیں باور کرانے کے لیے انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہو کیا غالب واقعی بغاوت کے دوران اپنے خیالات کو قلم بند کرنے کی غلطی کرسکتے تھے؟ دہلی کی لڑائی میں انگریزوں کو فتح آسانی سے نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ۳۰، ۳۱ / مئی کو ہنڈن ندی کے پاس پہلی راست جھڑپ میں انھوں نے فتح ضرور پائی۔ ایک ہفتہ بعد بدلی کی لڑائی بھی انھوں نے جیتی۔ لیکن شہر میں اس کی وجہ سے لوگ پست ہمت

بالکل نہیں ہوئے تھے ۔ اس کے برعکس ، سرگروہوں کی کثرت کی وجہ سے پیدا ہونے والی الجھنوں اور وسائل کی انتہائی قلت کے باوجود عام موڈ جوش و خروش اور رجائیت کا تھا ۔ پہاڑی سلسلے سے چپکے ہوئے ناکافی برطانوی فوجی دستے خستہ حالت میں تھے ۔ ان کی تعداد کم تھی ، ضروریات کا ذخیرہ گھٹتا جارہا تھا اور کمک دور تھی ۔ موسمِ گرما اپنی شدت پر تھا ، بود و باش کی انتہائی غیر تشفی بخش صورتِ حال ، پیچش اور ملیریا بخار سے ہونے والا جانی نقصان قابلِ لحاظ تھا ۔ اس کے برخلاف شہر میں بد انتظامی سے ہونے والے نقصان کی کم از کم ابتداً انقلابی جوش و خروش اور جیتنے کے عزم سے معقول تلافی ہوجاتی تھی ۔ عام خیال یہ تھا کہ محصور انگریزوں کی شکست فاش کچھ ہی دنوں کی بات ہے ۔ بدلی کی شکست کے ایک ہی دن بعد ہندستانی فریق نے پھر سے جتھہ بندی کی اور اس پہاڑی سلسلے پر جہاں انگریز فوجی دستے تعینات تھے شدت کے ساتھ حملہ شروع کیا ۔ قیادت کی ذمہ داری واقعی بہادر شاہ ظفر نے قبول کرلی تھی ۔ ان کے بڑے بیٹے مرزا مغل کو سپہ سالار اور چھوٹے چہیتے بیٹے جواں بخت کو وزیر مقرر کیا گیا تھا اور کوتوال کو اپنے کام میں حسبِ معمول لگے رہنے کی ہدایت دی گئی تھی ۔ بنیادی انتظامی ڈھانچہ برقرار رکھا گیا تھا گو کہ عہدوں کے نام اب فارسی میں تھے ۔ بعض پرانے منصبوں مثلاً شریعت اسلامی کے اعلیٰ ترین شارح صدرالصدور کے منصب کو پھر سے رواج دیا گیا ۔ بعض جدتیں عمل میں لائی گئیں جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر مجلسِ انتظامی کی جدت تھی ۔ " اس کا فرضِ منصبی مالی اور فوجی دونوں طرح کے امور کی نگرانی تھا اور اس کے دس ارکان میں چھ فوجی اور چار غیر فوجی نمائندے شامل تھے ۔ ۔ ۔ مقصود ایسا لگتا ہے کہ وسیع ترین اختیارات کی حامل جنگی کابینہ تھی ۔ ۔ ۔ " بعض وقت کے وقت روبہ عمل لائے جانے والے امور کی شہادت بھی ملتی ہے جن سے بدلتے ہوئے توازنِ قوت کے تعلق سے لچک اور اثر پذیری کا اظہار ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر بریلی سے آنے والے لائق لیکن متکبر سرگروہ محمد بخش خاں کو ، جو ایک بڑی اور وفادار فوجی جمعیت کا سردار تھا اور جس کے پاس سرکاری خزانے کی امداد کے لیے روپیہ پیسہ بھی تھا ، ازراہِ مروت " صاحبِ عالم بہادر " یعنی صوبہ دار اعلیٰ کا خطاب دیا گیا ، جو اس وقت تک مغل دربار کے لیے انوکھا تھا ۔ درپیش مسائل ہمت شکن تھے ۔ الجھنیں کافی تھیں اور سازشیں اور

بھی زیادہ تھیں، لیکن سبھی معاصر روئدادوں اور دستاویزات سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کا دربار تمام امور کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھا اور اپنے فرائض سرگرمی کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔

اس صورتِ حال میں یہ نہایت دور از قیاس ہے کہ استاد شہ اور قلعہ معلیٰ میں روزانہ حاضری دینے والے غالب خود کو ان امور سے علاحدہ رکھ سکتے تھے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ امر واقعہ کہ غالب درباری سازشوں سے پوری طرح باخبر تھے خود دستنبو سے ظاہر ہے۔ غالب کے قریبی دوست حکیم احسن اللہ خاں بادشاہ کے معتمد علیہ اور مشیرِ خاص تھے۔ دربار میں بعض لوگوں کو شبہہ تھا کہ حکیم صاحب انگریزوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔ غالب دستنبو میں اس واقعے کا ذکر، مناقشے کی تفصیلات دیے بغیر، ضمنی طور پر کرتے ہیں۔ لیکن اس شخص کی مذمت میں جو غالباً احسن اللہ خاں کے خلاف مہم چلانے والے گروہ کا سرغنہ تھا، وہ جو الفاظ استعمال کرتے ہیں کسی بے تعلق اور دور سے مشاہدہ کرنے والے کے شاید ہی ہوسکتے ہیں: "برے سے برا غلام اپنے آقا سے اس طرح پیش نہیں آسکتا بہ شرطےکہ وہ ولدالحیض نہ ہو۔ یہ خبیث، نمک حرام، جس کے منھ پر چیچک کے داغ ہیں، بےحیائی کے سبب سے جس کی آنکھیں پھیل گئی ہیں اور دہانہ فراخ ہوگیا ہے، اپنے آپ کو زہرہ و مشتری کی طرح سمجھتا ہے۔ ہر طرف کولھے مٹکاتا ہوا، انداز دکھاتا ہوا گزرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش خرامی میں کبک و تدرو کو شرماتا ہے۔ میں نے اس کا نام اس لیے نہیں لکھا کہ وہ ایک گدازادہ، گم نام ہے۔" صرف اس مناقشے کا واقف کار ہی اس طرح سے ذاتیات پر حملہ کرتے ہوئے مذمت میں اتنے درشت الفاظ استعمال کرسکتا ہے۔

جنوری ۱۸۵۸ء میں نواب رام پور کے نام ایک خط میں غالب بڑی احتیاط کے ساتھ اور دبی زبان میں اپنے رول کا اعتراف کرتے ہیں: "اس ہنگامے میں اپنے کو میں نے دربار سے الگ ہی رکھا۔ لیکن اس اندیشے سے کہ اگر یک قلم ترکِ آمیزش کرتا ہوں تو کہیں میرا گھر تاراج نہ کردیا جائے اور خود میری جان کو خطرہ لاحق نہ ہوجائے، میں باطن میں بےگانہ اور بہ ظاہر آشنا بنا رہا۔" نواب رام پور مسلمہ طور پر انگریزوں کے طرف دار تھے، زمانہ انتہائی کشیدگی کا تھا، انگریزوں کی بربریت اپنے عروج پر تھی۔ غالب سے ساری حقیقت

بیان کرنے کی توقع شاید ہی کی جاسکتی ہے بالخصوص ایک خط میں جب کہ اس کے راستے میں پکڑے جانے کا احتمال بھی رہا ہوگا۔ وہ دربار سے "بہ ظاہر آشنا" بنے رہنے کا اقرار کرنے کو تیار تھے، یہی بات خاصی معنی خیز ہے۔ انگریزوں کا شبہ صحیح تھا کہ ان کی یہ شناسائی اور تعلق کہیں زیادہ گہرا تھا۔ غالب خوش قسمت تھے کہ محلِ شاہی کے کاغذات میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملی جس سے ان پر بالیقین الزام عاید ہوتا ہو۔ ۱۸۵۸ء میں تفتہ کے نام ایک خط میں غالب اطمینان کی سانس لیتے ہیں کہ شاہی کاغذات کی تلاش میں اب تک ان کو ماخوذ کرنے والی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی ہے۔ بہ ظنِ غالب انگریزوں کے شہر پر دوبارہ قبضے کے عین قبل دستاویزات کی بڑی تعداد عمداً تلف کردی گئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ الزام سے پوری طرح بچ نہیں پائے۔ بغاوت کے دوران ایک اخبار کی اطلاع تھی کہ بہادر شاہ ظفر کے نام سے جو سکّے جاری کیے گئے تھے ان کی پشت پر کندہ کیے جانے کے لیے شعر غالب نے کہہ کردیا تھا۔ انگریزوں کے پاس اس اخباری اطلاع کی ایک نقل تھی اور کمشنر غالب سے استفسار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اطلاع صحیح تھی۔ غالب نے اس کو غلط ٹھہرانے کی کوشش کی۔ اپنی صفائی میں ان کا یہ کہنا تھا کہ " بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا" ان کے لیے باعثِ تقویت یہ امر تھا کہ اس وقت تک دربار کی دستاویزات میں کوئی ایسا کاغذ کا پرزہ دست یاب نہیں ہوا تھا جس کی بنا پر راست ان پر الزام عاید ہوتا ہو۔ وہ یہ دلیل لاتے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں جیسے دربار کے اہم عہدہ دار ان کے بے گناہی کی تصدیق کرسکتے ہیں۔ تاہم اپنے دوستوں کے سامنے وہ یہ ماننے کو تیار تھے کہ اگر انھوں نے یہ سکہ کہا تو اس لیے کہ ان کے پاس کوئی دوسرا چارہء کار نہ تھا اور اس لیے ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر باغی سپاہیوں کے لیے عام معافی کا اعلان ہوسکتا ہے تو شاعر کے لیے دو مصرعے کیوں معاف نہیں کیے جاسکتے۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں: "اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب نے مغل بادشاہ کا ساتھ دیا اور ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کے تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینے کے پُرمسرت موقع پر ایک سکّہ کہہ کر دیا۔ یہ سکّہ جس کا اب تک علم نہ تھا منشی جیون لعل نے اپنے (اصل) روزنامچے میں نقل کیا ہے اور مٹکاف نے اپنے انگریزی ترجمے میں اسے حذف

کردیا ہے سکّہ حسبِ ذیل ہے:

بر زرِ آفتاب و نقرۂ ماہ سکّہ زد در جہاں بہادر شاہ

(بہادر شاہ نے آفتاب کے سونے اور چاند کی چاندی پر اس جہاں میں اپنا سکّہ ڈھالا ہے)

دربار سے ان کے باقاعدہ تعلق کی تصدیق ایک اور شہادت سے بھی ہوتی ہے۔ منشی جیون لعل کے درباری روزنامچے میں ۱۳/ جولائی ۱۸۵۷ء کو یہ اندراج ملتا ہے: "مرزا نوشہ" (غالب کا عرف) اور مکرم علی خاں نے انگریزوں پر بادشاہ کی فتح کی خوشی میں ایک قصیدۂ مدحیہ پڑھا۔" اس کی بھی شہادت ہے کہ اگست ۱۸۵۷ء میں جب انھوں نے ایک اور قصیدہ پیش کیا تھا بادشاہ کی طرف سے انھیں خلعتِ فاخرہ سے نوازا گیا تھا۔

بغاوت کے دوران ہندستانیوں کے لکھے ہوئے دوسرے بیانیوں کی طرح سید مبارک شاہ نے بھی، جو اس زمانے میں بہادر شاہ کے تحت دہلی میں کوتوالِ شہر تھے، اپنے بیانیے میں انگریزوں کی نظر میں خود اپنی اور اس وقت کے دیگر ممتاز ہندستانیوں کی بے گناہی ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "حکیم (احسن اللہ خاں) کو فکر تھی کہ باغیوں کے لشکر کو دہلی آنے سے باز رکھنے کا کوئی ذریعہ تلاش کریں۔ لیکن اگر وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے تو فوراً مار ڈالے جاتے۔ ایک موقع پر وہ طیش میں آگئے، سپاہیوں کو برا بھلا کہتے ہوئے للکارا: "تم یہاں فساد برپا کرنے کے لیے کیوں آئے ہو؟ تم اگر لڑنا چاہتے ہو تو باہر جاکر کیوں نہیں لڑتے؟" اس سے ساری دلی کو شبہ تھا کہ حکیم صاحب دل سے انگریزوں کے طرف دار ہیں۔ اسی طرح لارڈ لیک کے قدیم جاگیردار نواب احمد بخش کے بیٹے نواب امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں درحقیقت حکومتِ انگریزی کے خیر خواہ تھے، لیکن ان کے دلی خیالات اور جذبات کا پتہ کیسے چلتا؟ لوگ تو صرف ظاہری اعمال سے رائے قائم کرسکتے ہیں (ان نوابین نے نہ تو باغیوں کے ساتھ کسی طرح کی شرکت کی تھی اور نہ ہی بادشاہ کے بیٹوں کے شریکِ کار تھے) اور ان کی وفاداری انگریزی فوج کے دہلی پر قبضے کے بعد ہی حتمی طور پر ثابت ہوئی۔ اسی زمرے میں شہر کے صدر امین مفتی صدرالدین آزردہ کو بھی رکھا جانا چاہیے جن سے شہ زادوں اور سپاہیوں دونوں نے بار بار فتویٰ دینے کی فرمائش کی کہ وہ جس جہاد میں لگے ہوئے ہیں جائز و برحق اور منشاءِ ربانی کے مطابق ہے۔

مفتی صاحب نے ایسا فتویٰ دینے سے ہمیشہ گریز کیا ۔۔۔ " غالب کے شمول کے بارے میں مبارک شاہ لکھتے ہیں: " لشکر میں واقعی اس اطلاع کی شہرت تھی کہ مرزا نوشہ اور مرزا الٰہی بخش بھی انگریزوں سے موافقت رکھتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ باغیوں کی شکست و ہزیمت کے دل سے آرزومند تھے۔ لیکن اس اطلاع کو محض جزوی طور پر قابلِ یقین سمجھا گیا۔ " اگر شہ زادوں یا سپاہ کو محاصرے کے دوران اس پر واقعی یقین ہوتا تو وہ انھیں بیخ دبن سے نسیت و نابود کر دیتے، نہ عمر کا لحاظ رکھتے اور نہ جنس کا۔ ان کے بیوی بچے اور سبھی متعلقین تہ تیغ کردیے جاتے۔ شہر پر قبضے کے بعد ہی ان افراد کی راہ روش کا علم ہوا۔"

ایک ایسے بیانیے میں، جس کا بین طور پر مقصد ہی بغاوت میں اہم شخصیتوں کے شمول پر لیپ پوت کرنا تھا، یہ امر واقعہ کہ مبارک شاہ یہ کہنے کو تیار ہیں کہ غالب کے بارے میں اطلاع کو شہ زادوں اور سپاہیوں نے محض جزوی طور پر ہی قابلِ یقین سمجھا، اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اس دور میں دربار سے غالب کا تعلق اس حد تک عملی تھا کہ اس کو کلیتہً نظرانداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ مبارک شاہ بھی غالب کے بارے میں اسی قطعی انداز میں لکھ کر دوسرے لوگوں کے تعلق سے اپنے بیان کو قابلِ اعتبار باور کرانے کی کوشش کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اس طرح سے دستنبو میں موافق انگریز جذبے کا اظہار جتنا زیادہ پر زور ہو اتنی ہی زیادہ وضاحت سے اس تصنیف کی حقیقت منکشف ہوتی ہے، وہ یہ کہ یہ محض بغاوت میں غالب کے واقعی شمول پر پردہ ڈالنے کی ایک اختراع پسندانہ کوشش تھی۔ وہ اپنے حقیقی خیالات کو قلم بند کرنے سے ڈرتے تھے، لیکن دوستوں کے نام خطوط سے ان کے ان خیالات کا بڑی حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حسبِ ذیل اقتباسات اسی عہد کے ہیں جس کی نام نہاد روداد دستنبو ہے اور جس میں غالب نے شروع سے آخر تک انگریزوں کی مدح سرائی کی ہے:

- دسمبر ۱۸۵۷ء، بہ نام تفتہ: " مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔"
- دسمبر ۱۸۵۷ء، بہ نام حکیم غلام نجف خاں: " تمھارا خط پہنچا ۔۔۔ تم جو کہتے ہو کہ:

"تم نے کبھی مجھ کو خط نہیں لکھا ۔۔۔ انصاف کرو، لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھا؟ اور اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں؟ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے، نہ میں لکھوں گا۔"

- جنوری ۱۷۵۸ء، بہ نام حکیم نجف خاں: "جو دم ہے غنیمت ہے، اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں، بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہاتھ میں لیے پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون۔"
- فروری ۱۸۵۸ء، پھر بہ نام تفتہ: "بھائی بری آبنی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔۔۔"
- فروری ۱۸۵۸ء، بہ نام مجروح: "اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔"
- فروری ۱۸۵۸ء، بہ نام ثاقب: "اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائے گا، ورنہ قصہ مختصر قصہ تمام ہوا، لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں؟"

خاص بات یہ ہے کہ ان امور کی طرف، جنھوں نے غالب کو دستنبو لکھنے پر مجبور کیا، کتاب ہی میں اشارہ مل جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "میں تو بندۂ شکم ہوں، مجھ کو تو بس روٹی چاہیے۔" وہ سعدی کے ایک شعر کا حوالہ دیتے ہیں:

چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرماں را
چہ کند گوی کہ تن در نہ دہد چوگاں را
(غلام آقا کے حکم کے سامنے سر نہیں جھکائے گا تو کیا کرے گا۔
گیند چوگان کی اطاعت کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہے؟")

کتاب کی اصل عبارت میں وہ بڑی ہوش یاری سے اپنے پنشن کے معاملے کی تفصیلات کی آمیزش کرتے ہیں۔ آخر میں قصیدے کی مخصوص شکل میں وہ اس التجا پر آتے ہیں جس کا تمام اگلے صفحات محض ایک پیش خیمہ تھے: "باقی پنشن اگر مل گئی، تب بھی آئینۂ دل

سے زنگِ غم صاف نہیں ہوسکے گا۔ اگر نہیں ملی، اس صورت میں شیشۂ دل پتھر سے چور چور ہوجائے گا ۔۔۔ کاش میری ان تینوں خواہشوں یعنی خطاب، خلعت اور پنشن کے اجرا کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آجائے، جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی کچھ لکھا ہے ۔" جب کتاب اشاعت کے لیے تیار تھی ان کی متردد ہدایتوں سے اس کے لکھے جانے کے مقصد کے بارے میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی ۔

تفتہ سے، جو طباعت میں ان کی اعانت کر رہے تھے، وہ کہتے ہیں کہ یہ کام انھیں بہ عجلت اس لیے کروانا چاہیے کہ اس کی جلدیں فوراً نواب گورنر جنرل بہادر اور ان کے ذریعے جناب ملکۂ معظمہ انگلستان کی نذر کرنی ہیں ۔ وہ اپنے نام سے عرفیت "نوشہ" کو نکال دینے کی خواہش کرتے ہیں کیوں کہ "دلی کے حکام کو عرف معلوم ہے، مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزرا کے محکمے میں اور ملکۂ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا ۔" وہ چاہتے ہیں کہ مصنف کا نام بس "اسد اللہ خاں" لکھا جائے کیوں کہ گو کہ ان کا پورا نام "محمد اسد اللہ خاں" ہے انگریز حکام ان کو اس پورے نام سے مخاطب نہیں کرتے ۔ جب کتاب کے چھپنے میں کچھ دیر ہوئی تو وہ تفتہ کی خبر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرح سے تو کتاب سے انھیں جس فائدے کی توقع ہے اس پر پانی ہی پھر جائے گا ۔ وہ خواہش کرتے ہیں کہ پانچ پر تکلف جلدیں تیار کی جائیں اور پنجاب کے چیف کمشنر، گورنر جنرل، ملکہ وکٹوریہ اور برطانوی حکومت کے دو متعلقہ سکریٹریوں کی خدمت میں روانہ کی جائیں ۔ بالآخر اس سرمایہ کاری کا انھیں منافع بھی ملا ۔ مارچ ۱۸۵۹ء میں انگریزوں کی نظر میں ان کی بحالی کا پہلا اشارہ اس وقت ملا جب لفٹننٹ گورنر نے ان کے پاس پسندیدگی کا ایک خط بھیجا ۔ کتاب کی نکاسی بھی حوصلہ افزا تھی ۔ غالب کو اپنی نثر پر فخر تھا اور انھیں اس پیش رفت سے خوشی ہوئی ۔ لیکن کتاب کے مخاطب کون تھے، اس بارے میں انھیں کبھی کوئی شک و شبہہ نہیں تھا ۔ ایک دوست کے نام خط میں جنھوں نے "دستنبو" کی جلدیں بک جانے کی اطلاع دی تھی وہ لکھتے ہیں : "کتب "دستنبو" کے بک جانے سے میں خوش ہوا ۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ صاحب لوگوں نے خریدیں یا ہندستانیوں نے لیں ؟ ۔۔۔ بھائی، ہندستان کا قلم رو بے چراغ ہوگیا ۔ لاکھوں مرگئے ۔ جو زندہ ہیں، ان میں سیکڑوں گرفتارِ بند بلا ہیں ۔ جو زندہ ہے اس میں

مقدور نہیں ۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آئی ہوگی یا (انگریزوں کے شدت سے طرف دار) پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی ۔" جہاں تک کتاب کے مندرجات کا تعلق ہے تو نواب رام پور کے نام ایک خط میں انھوں نے اتنا کھلا اعتراف کر ہی لیا ہے جتنا ان حالات میں ممکن تھا : "۔۔۔ یہ رسالہ " دستنبو " جو اب بھیجا ہے ، اس کا دیکھنا ضرور درکار ہے ۔ فارسی قدیم اور پھر حسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ ، بہ ایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ ۔"

بیسویں صدی کی قوم پرستی کے نقطہء نظر سے غالب کی طرف سے انگریزوں کی خوش نودی کے حصول کی کوشش ایک ایسی مصالحت دکھائی دیتی ہے جسے کسی طرح بھی حالات کی نزاکت کی دہائی دے کر حق بہ جانب نہیں قرار دیا جاسکتا ۔ ایک سطح پر یہ نقطہء نظر معقول ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا غالب کے بارے میں رائے قائم کرنے میں یہ کسی حد تک بھی مناسب ہے ۔ غالب ایک ایسے جاگیردارانہ نظام کی پیداوار تھے جس میں حاکمِ بالفعل کے سامنے اظہارِ اطاعت معاشرتی حیثیت سے مسلمہ قاعدہ تھا ۔ وہ دستنبو میں لکھتے ہیں : "چوں کہ میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم ہندستان ، خصوصاً اس شہر دہلی میں آئیں ان کی مدح میں قصیدہ بھیجا جائے ، اس بناپر اس والا شکوہ (سر جان لارنس) کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ۔" ان کے زمانے میں قوم پرستی اپنے جدید مفہوم میں ابھی تک اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی ۔ مخالف برطانیہ جذبات کو ایک مربوط یا قابلِ شناخت قوم پرست نظریے کی شکل دینا ابھی مستقبل کی بات تھی ۔ انگریزوں کے دہلی پر دوبارہ قبضے کے بعد باشندگانِ شہر کے سبھی گروہوں کے لیے وجود کا برقرار رہنا ہی نہایت فوری اور سب سے مقدم وجہ تحریک تھا ۔ خود بادشاہ یعنی بہادر شاہ کی کوشش یہ ثابت کرنے کی تھی کہ ان کی انگریزی سرکار سے وفاداری کبھی مشکوک نہیں تھی ۔ حکیم احسن اللہ خاں نے بھی اتنی ہی شدت سے خود کو انگریزوں کی نظر میں بحال کرنے کی کوشش کی ۔ دلی کے باہر غالب کے سرپرستِ خاص نواب رام پور نے البتہ علانیہ انگریزوں کا ساتھ دیا تھا ۔ جب بغاوت ناکام ہوگئی اور اس صورت میں کہ غیر ملکی تسلط کے مقابلے کے لیے کوئی قابلِ اعتبار مخالف جماعت ابھی تک معرض وجود میں نہیں آئی تھی ، عملی نقطہء نظر کا تقاضہ یہ تھا کہ صورتِ حال کو قبول کیا جائے اور ماضی کی

مراعات کی ممکنہ حد تک بحالی کے لیے کوشش کی جائے ۔ غالب کے معاملے میں وجود کے برقرار رہنے کا سوال انتہائی نازک شکل اختیار کرچکا تھا ۔ ان پر سرگرمی سے شبہ کیا جارہا تھا اور انگریزوں کی طرف سے ادا کی جانے والی پنشن کے علاوہ ان کا اور کوئی ذریعہ ء آمدنی نہیں تھا ۔ جن کا اس سے کہیں کم داؤ پر لگا ہوا تھا انھوں نے بھی ناگزیر صورتِ حال سے مصالحت کرلی تھی ۔ چناں چہ ان کے بارے میں سیاق و سباق کو پیش نظر نہ رکھتے ہوئے جدید وطن دوستی کے بے لوچ معیار کی رو سے رائے قائم کرنا بے انصافی ہوگی ۔ واقعی اہم بات یہ ہے کہ ان کے زمانے کے جاگیر دارانہ مزاج کے باوجود ان کا فطری ، مخالف استعمار میلانِ خاطر کافی ترقی یافتہ تھا ۔ انگریزوں کی طرف سے اودھ کے الحاق پر تبصرہ کرتے ہوئے فروری ۱۸۵۷ء میں ایک دوست کے نام خط میں وہ لکھتے ہیں : " تباہی ریاستِ اودھ نے ، با آں کہ بے گانہ ء محض ہوں ، مجھ کو اور بھی افسردہ حال کردیا ، بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہلِ ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے ۔ " بغاوت کے دوران ، عوام کالانعام کی نودریافت اکڑ کے تعلق سے ان کے ذہنی تحفظات کے باوجود ، انھوں نے مغل دربار سے اپنا تعلق مستعدی کے ساتھ برقرار رکھا اور دستنبو میں انگریزوں کی تمام مصلحت آمیز تعریفوں کے باوجود کبھی کبھی ان کے حقیقی خیالات کی جھلک پسِ پردہ دکھائی ہی دے جاتی ہے ۔ ایک موقع پر وہ لکھتے ہیں : " شاہ زادوں کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ بعض کو گولی ماردی گئی ، اس طرح موت کے اژدہے نے ان کو نگل لیا کچھ کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا ، اس طرح رسنِ دار کی کشاکش سے ان کی روح گھٹ کر رہ گئی ۔ چند افسردہ دل قید خانے میں ہیں اور بعض عالمِ غربت میں آوارہ و پریشان پھر رہے ہیں ۔ کم زور و ضعیف بادشاہ پر مقدمہ چل رہا ہے ۔ جھجر ، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے جاگیرداروں کو علاحدہ علاحدہ مختلف دنوں میں پھانسی پر لٹکادیا گیا ۔ اس طرح ان لوگوں کو ہلاک کیا کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ خون بہایا گیا ۔"

آخری سطر کا طنز خطرناکی کے ساتھ نمایاں ہے ۔ اختصار اور لہجے کی لاپروائی مصنف کے ذہنی کرب اور احساسِ ناانصافی کو بہ مشکل مخفی رکھ پارہی ہے اور جب نومبر ۱۸۵۸ء میں یہ اطلاع ملی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ٹھیکہ ختم ہوا اور قلم روِ ہند خود برطانوی حکومت کی

عمل داری میں آگئی جو اس امر کی حتمی شہادت تھی (اگر اب بھی کسی شہادت کی ضرورت رہی ہو) کہ کش مکش ساری ختم ہوئی، تو غالب خط میں اپنے ردِ عمل کو ظاہر نہ ہونے دینے کی کوشش بالکل نہیں کرتے : " شاہ جہاں آباد میں بعد غروبِ آفتاب افقِ غربیِ شہر پر (یہ دم دار ستارہ) نظر آتا تھا ۔۔۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہرِ الٰہی کی ہیں اور دلیلیں ملک کی تباہی کی ہیں ۔ یہاں پہلی نومبر کو دوشنبے کے دن حسب الحکم محکّام کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور سب کو کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلم رو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنایا گیا ۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکۂ معظمہ نے فرزندِ ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندستان کا حاکم کیا ۔۔۔ اللہ اللہ اللہ (خط بہ نام انورالدولہ سعدالدین خاں بہادر شفق، مورخہ ۵ / نومبر ۱۸۵۸ء) ۔

بغاوت کے دوران اور اس کے فوری بعد غالب کو شخصی طور پر قابلِ لحاظ مصائب برداشت کرنے پڑے ۔ دستنبو میں وہ لوٹ کھسوٹ اور نظم و نسق کی ابتری پر افسوس کرتے ہیں ۔ بسیار نویس مراسلہ نگار ہونے کے ناطے وہ ڈاک کے نظام کی ابتری سے بالخصوص پریشان تھے ۔" ڈاک کا انتظام درہم برہم ہوگیا، جس کے سبب سے بہت سے کام رک گئے ۔ ہرکاروں نے آنا جانا اور ڈاک لے جانا بند کردیا ۔" اخباروں کی حسبِ معمول ترسیل بھی بند ہوگئی تھی ۔ زیادہ اہم بات یہ کہ فرانسیسی شراب اب دست یاب نہیں تھی ۔ وہ دستنبو میں لکھتے ہیں : " فی الحقیقت سچی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے ۔ میں نیم مسلمان، مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں اور بدنامی و رسوائی کے رنج سے بے نیاز، ہمیشہ سے رات میں صرف ولایتی شراب پینے کی عادت تھی ۔ ولایتی شراب نہیں ملتی تھی تو نیند نہیں آتی تھی ۔ آج کل انگریزی شراب شہر میں بہت مہنگی ہے اور میں بالکل مفلس ہوں ۔" وہ خوش قسمت تھے کہ کچھ مدت کے لیے ایک دوست نے ایسا لگتا ہے کہ کسی قسم کی رم کا تھوڑا سا ذخیرہ ان کے ہاں بھیج دیا ۔ یہ شرابِ قند یعنی گنّے کی شراب تھی ۔ تشنہ لب غالب کے لیے اس کی خوش بو ولایتی شراب سے بڑھ کر تھی اور وہ اسے وہی آبِ حیات قرار دیتے ہیں جس کی سکندر کو تلاش تھی !

روپے پیسے کی کمی نہایت دشوار مسئلہ تھی ۔ ان کی پنشن جس کی ادائگی انھیں

برطانوی کلکٹری کے ذریعے ہوتی تھی مئی ۱۸۵۷ء سے یعنی اس مہینے سے جب بغاوت کا آغاز ہوا ، بند ہوگئی تھی ۔ مغل دربار سے ان کی آمدنی بھی بند ہوچکی تھی ۔ بہ شمول بیوی ، دو پوتے اور متعدد خدمت گار ، سارے کنبے کی کفالت ان کے سر تھی ، جب کہ آمدنی مطلق نہیں تھی ۔ اس پریشانی کے زمانے میں رقم ادھار لینا آسان نہیں تھا ۔ تلخ ظرافت کے ساتھ وہ لکھتے ہیں : " بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر زندگی گزار رہا ہوں ۔ گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں' میں کپڑے کھاتا ہوں ۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے سب کھالوں گا عالمِ برہنگی میں بھوک سے مرجاؤں گا ۔" وہ قطعاً مایوس ہوچکے تھے ۔ دستنبو کے ایک نہایت رقت انگیز مقام پر اپنے دو پوتوں کے بارے میں لکھتے ہیں : " وہ دونوں ناز پروردہ بچے پھل ، دودھ ، مٹھائی مانگتے ہیں ، لیکن ان کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں ۔"

بارش شروع ہونے تک ۱۸۵۷ء کا غیر معمولی شدید موسمِ گرما غالب کے لیے مزید اذیت کا باعث رہا ۔ مئی اور جون سال کے سب سے زیادہ گرم مہینے ہیں اور سبھی اطلاعات کے مطابق ۱۸۵۷ء جہاں تک لوگوں کی یادداشت کام کرتی ہے ایک انتہائی گرم سال تھا ۔ غالب کی نظر میں گرمی کی اذیت اس لیے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ ان کی جان پہچان کے بہت سے لوگ جو گرمی کے مہینے اپنے محفوظ ، ہوادار گھروں میں گزارنے کے عادی تھے ، اب بے گھر تھے ۔ جنگ و جدال کے ہنگامے اور شور و غوغا کو گرمی کے مستقل پس منظر کی حیثیت حاصل تھی ۔ بارود کی بو ہوا میں سرایت کیے ہوئے تھی اور آتش باری اور توپ داغنے کی گھن گرج ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی ۔ ضروری اجناس اور ضروری خدمات بجالانے والوں کی شدید قلت تھی ۔ " شہر کے اندر ضروریات زندگی کی بڑھی ہوئی طلب ، اعتبار اور ادھار پر کاروبار کی موقوفی ، پہاڑی پر (جہاں انگریز متمکن تھے) وافر مالی وسائل سے تازہ دم حریف منڈی کی موجودگی اور دیہاتیوں کے شہر میں تازہ رسد لانے میں روز افزوں تامل کا وسیع اثر عمومی قلت کی شکل میں ظاہر ہوا تھا ۔ اگر شہر پر آخر ستمبر تک ایک دم سے دھاوا کرکے قبضہ نہ کر لیا جاتا تو چند ہی مہینوں کے اندر وہ قحط سے مجبور ہوکر ہتھیار ڈال دیتا ۔" غالب شکایت کرتے ہیں کہ دکانیں اب کھلی نہیں ہیں ، اناج کی شدید قلت ہے اور ضروری خدمات بجالانے والے ، مثلاً بھنگی ، دھوبی اور نائی دفعتاً غائب ہوگئے ہیں ۔ شہر پر دوبارہ

قبضے کے بعد انگریز فوجیوں کی طرف سے قتلِ عام اور لوٹ مار کے زمانے میں پانی تک ایک جنسِ کم یاب بن گیا تھا۔ دوسروں کی طرح غالب نے بھی پانی کو ناپ تول کر استعمال کرنا شروع کیا اور اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اتنے جتن سے مہیا کیا ہوا پانی ایسا تھا کہ گویا کنویں کو ناخنوں سے کھودنا پڑا ہو۔ ایک دفعہ سارا جمع کیا ہوا پانی ختم ہوگیا اور دو رات اور دن وہ خود اور ان کے گھر والے پیاسے رہے۔

غالب کی خوش قسمتی کہ ان کا گھر ایسی گلی میں تھا جو جلد ہی مہاراجہ پٹیالہ کی حفاظت میں آگئی۔ مہاراجہ شروع ہی سے انگریزوں کی صف میں شامل ہوگئے تھے، مشہور اطبا حکیم محمود خاں، مرتضیٰ خاں اور غلام اللہ خاں جن کے گھر غالب کی گلی میں تھے' پٹیالہ دربار سے متعلق تھے اور انھیں اس دربار کی سرپرستی حاصل تھی۔ جب انگریزوں کی فتح قطعی دکھائی دینے لگی تو پٹیالہ کے حکم ران نے ان پر دباؤ ڈال کر یہ وعدہ لیا کہ حکیم صاحبان کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ شہر پر دوبارہ قبضے کے کچھ ہی دنوں کے اندر مہاراجہ نے گلی کے داخلے پر اس محلے کے باشندوں کی حفاظت کے لیے خود اپنے آدمی تعینات کردیے۔

انگریزوں کی فتح کے بعد تیسرے دن مہاراجہ کے سپاہی گلی میں اپنی جگہ پر آگئے۔ تب محلے کے باشندے اتنی ہمت جٹا پائے کہ اشیائے خوردنی اور پانی کے لیے باہر جائیں۔ لیکن انھیں خبردار کردیا گیا تھا کہ چاندنی چوک کی دوسری طرف جانے کی جراءت کرنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینے کے برابر ہوگا۔ ڈرتے ڈرتے انھوں نے گلی کا پھاٹک کھولا اور ہر گھر سے ایک آدمی اور غالب کے دو خدمت گار، جو بھی ہوسکا گھڑے وغیرہ ساتھ لے کر قریب ترین کنویں تک پہنچے۔ بدقسمتی سے اس کا پانی کھاری تھا، لیکن چوں کہ میٹھے پانی کے کنویں بہت زیادہ دور تھے انھیں جو کچھ میسّر تھا اسی سے اپنی پیاس بجھانی پڑی۔

غالب کا گھر لوٹا نہیں گیا۔ لیکن بدقسمتی سے انھیں اپنے نہایت بیش بہا مال و متاع سے ہاتھ دھونا پڑا۔ جب بغاوت شروع ہوئی تو ان کی بیوی نے، جو ایک دوراندیش خاتون تھیں، اپنے جڑاؤ زیورات اور قیمتی اشیا اکٹھا کیں اور انھیں خفیہ طور پر ان کالے میاں صاحب کے گھر حفاظت کے خیال سے بھیج دیا۔ جو ظفر کے پیرِ طریقت اور محترمِ عام و خاص درویش تھے، وہی جن کے ہاں ۱۸۴۷ء میں قید سے رہائی کے بعد غالب ٹھہرے تھے۔

امراؤ بیگم کی نظر میں اس کی توجیہہ یہ تھی کہ شورش کے دنوں میں یہ اشیا ایک دین دار شخص کے گھر میں، جسے بادشاہ کی سرپرستی بھی یسّر تھی، زیادہ محفوظ رہیں گی۔ یہ قیمتی اشیا مناسب طریقے سے ایک تہہ خانے میں امانت رکھ دی گئی تھیں اور دروازے پر مٹی تھوپ کر ایسے بند کردیا گیا تھا کہ کسی کو اندازہ بھی نہ ہو کہ وہاں کچھ ہے۔ تاہم جب انگریزوں کا شہر پر دوبارہ قبضہ ہو گیا تو کالے میاں صاحب کا گھر بھی عام لوٹ مار کی زد میں آگیا۔ بہ ظاہر اس کے بعد ہی غالب کو پتہ چلا کہ ان کی بیوی نے کیا کیا تھا۔ اب کیا کیا جاسکتا تھا۔ غالب نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھالیا کہ یہ چیزیں جانے والی ہی تھیں اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئیں۔

اس سے کہیں زیادہ بڑا نقصان ان کے سارے کلیات نظم فارسی و اردو کا اس وقت تلف ہونا تھا جب قلعہ ء معلیٰ اور ان کے شاگرد و رشتہ دار نواب ضیاء الدین خاں کے کتب خانے تاراج کیے گئے۔ غالب جو کچھ نظم و نثر میں لکھتے اس کا ایک نسخہ ضیاء الدین اپنے پاس رکھتے۔ انھوں نے ایک قابلِ لحاظ رقم صرف کرکے اس سارے مجموعے کی جو نثر کے نو سو صفحات اور نظم کے ڈیڑھ تا دو ہزار صفحات پر مشتمل تھا سونے اور چاندی کے نقش و نگار والی خوش نما چرمی جلد بندی کروائی تھی۔ مغل شاہ زادوں میں سے ایک نے (غالباً مرزا فخرو نے جو غالب کے شاگرد تھے) قلعہ ء معلیٰ کے کتب خانے کے لیے ضیاء الدین احمد خاں کے اس مجموعے کی نقل تیار کروائی تھی۔ غالب کی خاطر جمع تھی کہ ان کی ساری ادبی تخلیقات مناسب انداز سے آئندہ نسلوں کے لیے یک جا فراہم ہیں، کیوں کہ خود انھوں نے اپنی تحریروں کو باقاعدہ محفوظ رکھنے کی زحمت کبھی نہیں گوارا کی تھی۔ لیکن جب لوٹ مار شروع ہوئی تو دونوں کتب خانوں کو لوٹا کھسوٹا اور تاراج کیا گیا (جلدوں پر سونے چاندی کا کام لوٹ کا محرک رہا ہوگا)۔ غالب بہت بے چین ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں: "کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ مجھے دکھایا، یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔" (خط بہ نام حاتم علی مہر، اوائل نومبر ۱۸۵۸ء)

ان کے فاتر العقل چھوٹے اور اکلوتے بھائی کی افسوس ناک حالت غالب کے لیے

انتہائی تشویش اور ذہنی کرب کی ایک اور وجہ تھی ۔ مرزا یوسف اپنے گھر والوں کے ساتھ غالب کے گھر سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر رہتے تھے ۔ وہ خاموش اور اپنے خیالات میں مگن رہنے والے آدمی تھے ، تیس سال کی عمر میں دیوانے ہوگئے اور علاجِ معالجے سے انھیں کبھی کوئی فائدہ نہ ہوا ۔ انگریزوں کے حملے کے نتیجے میں دہلی کے سقوط کے بعد مرزا یوسف کی بیوی ، بچے اور خادمائیں شہر چھوڑ کر بھاگ گئے اور بس دو معمر ملازمین ان کی دیکھ بھال کے لیے رہ گئے ۔ غالب تک یہ اطلاع پہنچی لیکن اس وقت حالات ایسے تھے کہ غالب کا گھر سے نکلنا ممکن نہیں تھا ۔ بھائی کی حالت کا علم ہوتے ہوئے بھی اس سلسلے میں کچھ کرسکنے سے ان کی کلیتہً معذوری ان کے لیے سوہانِ روح تھی ۔

۱۹ / اکتوبر ۱۸۵۷ء کو غالب کو یہ خبر ملی کہ ان کے بھائی کا انتقال ہوگیا ۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا ادعا ہے کہ یوسف مرزا کو انگریز سپاہیوں نے گولی مار کر ہلاک کیا تھا اور اس امر واقعہ کو غالب نے دستنبو میں عمداً قلم انداز کیا ہے ۔ ایک اور بیان کے مطابق وہ بے ارادہ اس وقت مارے گئے جب باہر شور و غل کی طرف متوجہ ہوکر وہ گلی میں نکل آئے ۔ معین الدین حسن خاں نے ، جو بغاوت کے دوران مختصر سی مدت کے لیے دہلی کے کوتوال تھے ، اپنے بیانیے میں لکھا ہے : " مرزا اسداللہ خاں کے بھائی مرزا یوسف خاں جو ایک مدت سے فاتر العقل تھے ، بندوق چلنے کی آواز سن کر ، یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہورہا ہے بھٹکتے ہوئے باہر گلی میں آگئے اور مارے گئے ۔ " دستنبو میں غالب کا بیان یہ ہے کہ ان کے بھائی کا بیماری سے انتقال ہوا ۔ وہ پانچ دن شدید بخار میں مبتلا رہے اور ۱۹ / اکتوبر ۱۸۵۷ء کو آدھی رات کے کچھ دیر بعد انھوں نے دم توڑ دیا ۔ اب ان کی تدفین کے انتظام کے تقریباً ناقابلِ حل مسائل سامنے آئے ۔ کوئی ایسی دکان کھلی نہیں تھی جہاں سے کفن کے لیے کپڑا خریدا جاسکے ۔ گورکنوں کا کہیں پتہ نہیں تھا ۔ میّت کو قبرستان تک لے جانے لیے چار آدمی فراہم کرنا تک ممکن نہ تھا ۔ بالآخر بعض پڑوسیوں کو ترس آیا اور غالب کی مدد کو آئے ۔ پٹیالے کے ایک سپاہی کی حفاظت میں ان لوگوں نے یوسف مرزا کے گھر تک کی مسافت طے کی ، میّت کو چند پرانی چادروں میں لپیٹا اور اسے مسجد میں جو مکان کے برابر تھی دفن کردیا ۔

سقوطِ دہلی کے وقت غالب کا نام انگریزوں کی تیار کی ہوئی مشتبہ اشخاص کی فہرست میں کافی اوپر تھا۔ ہر طرف لوگوں کو نہات کم زور شہادت کی بنا پر بہ عجلت بغیر مزید تحقیقات کے سزائے موت دی جارہی تھی۔ شہر پر دوبارہ قبضے کے فوراً بعد انھیں بہ غرض تفتیش کسی کرنل برن کے ہاں طلب کیا گیا۔ غالب دستنبو میں اس کا ذکر کرتے ہیں مگر صریحاً اسے ایک غیر اہم بات باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں: "۵ / اکتوبر کو پیر کا مصیبت آفریں دن تھا۔ دوپہر کے وقت اچانک چند گورے اس دیوار پر چڑھ گئے جو بند کردہ دروازے سے ملی ہوئی ہے۔ وہاں سے ایک چھت پر اور چھت سے کود کر گلی میں آگئے۔ راجہ نریندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا کچھ مفید نہیں ہوا۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کر کے راقم الحروف کے گھر میں گھس آئے۔ ان گوروں نے بھل منسی سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھ کو، ان دونوں بچوں، دو تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر حقیقت پسند، دانش ور کرنل براؤن (دراصل برن۔ مصنّف) کے پاس لے گئے، جو چوک سے اسی طرف قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے۔ کرنل براؤن نے مجھ سے بہت نرمی و انسانیت سے بات کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا۔ خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کردیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا، اس خوش اخلاق کرنل براؤن کی تعریف کی اور چلا آیا۔" اس صورتِ حال میں جب انگریز گولی پہلے مارتے اور پوچھ تاچھ بعد میں کرتے تھے، غالب، ان کے گھر والوں اور سارے ملازمین کی پوچھ گچھ کے لیے گرفتاری اس میں شک نہیں کہ ایک جگر خراش تجربہ رہا ہوگا۔ لیکن بہ ظاہر غالب نے اپنے حواس مجتمع رکھے تھے۔ بہ قول حالی کرنل موصوف نے غالب سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا: "ول، تم مسلمان؟" غالب نے کہا: "آدھا۔" کرنل متعجب ہوا اور کہا: "اس کا کیا مطلب؟" تب غالب نے اپنا وہ مشہور جواب دیا: "شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔" کرنل یہ سن کر بہت محظوظ ہوا۔ اس امر کے پیش نظر کہ انگریزوں کے لیے تمام مسلمان مشتبہ تھے، غالب کا اپنے مذہبی تعلق کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ، ان کے حقیقی خیالات کی عکاسی کرنے کے علاوہ قرینِ مصلحت بھی تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر وہ اپنے ساتھ ان چند رسیدوں میں سے ایک، یا شاید وہ واحد رسید، لے گئے

تھے، جو ان متعدد قصیدوں کے جواب میں لندن سے آئی تھیں جو انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی شان میں لکھ کر بھیجے تھے۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ کرنل اس طرح کی اسنادِ خوش نودی سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے غالب سے پوچھا کہ جب سرکار برطانیہ کا شہر پر دوبارہ قبضہ ہوا تو وہ حاضر کیوں نہ ہوئے؟ غالب نے جواب دیا کہ "میں چار کہاروں کا افسر تھا، وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے، میں کیوں کر حاضر ہوتا؟" آخر کار کرنل برن نے غالب اور ان کے گھر والوں کو رخصت ہونے کی اجازت دی، گو کہ اس میں شک ہے کہ جیسا کہ حالی کہتے ہیں اس نے یہ کام واقعی "نہایت مہربانی" سے کیا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں غالب کے معاملے میں انگریزوں کے شبہات بالآخر انھیں مجرم قرار دینے کے لیے شہادت کے فقدان اور ان کے دستنبو شائع کرنے کی بہ دولت دور ہوئے۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کی فرماں روائی نے دہلی کا سیاسی، سماجی، مادی اور نفسیاتی نقشہ ناقابلِ تنسیخ طور پر بدل ڈالا۔ غالب نے اس انقلابی کایا پلٹ کے ہر پہلو کو اپنے باطن میں سمولیا۔ ۱۸۵۷ء کے پہلے شہر کا مقررہ اور جانے بوجھے نقاطِ حوالہ کے درمیان اہتزاز کرنے والا ایک داخلی آہنگ تھا۔ فرنگیوں کی موجودگی سے ایک بے میل سُر کا اضافہ تو ہوا لیکن اس سے بنیادی نظام میں تغیر نہیں آیا تھا۔ مغل بادشاہ کی روز افزوں نمایاں سیاسی بے بسی پریشان کن ضرور تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اسے پچا لیا گیا تھا۔ اس کی تلافی کرنے والے دوسرے عوامل تھے مثلاً عام و خاص کی رگ و پے میں سرایت کیا ہوا شاعری کی دیوی کا عشق اور اس کی جستجو۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے نتیجے میں ایک نئی رفتار اور ایک نیا آہنگ رائج ہوا۔ غالب اور ان کی پیڑھی کے افراد اور ان کے جیسا سماجی و اخلاقی پس منظر رکھنے والے دیگر بے شمار لوگوں کا مقدر اس سے شدت کے ساتھ بے آہنگ رہنا تھا۔

سقوطِ دہلی کی رات کو انگریزی افواج کے سپہ سالار جنرل ولسن نے تین صدیوں سے زائد عرصے کے دوران مغل اقتدار کے مقامِ مقدس دیوانِ خاص میں پُر تکلف دعوت کا انتظام کرکے اپنی فتح کا جشن منایا۔ اس کے بعد کے دنوں میں شاہی محل کو باقاعدہ لوٹا اور تاخت و تاراج کیا گیا۔ ان چند کم قیمت جواہرات کو جو کندہ تصاویر اور پچی کاری میں بچ رہے تھے سنگینوں سے اکھاڑا گیا۔ مدہوش فوجیوں نے نفیس جھاڑ فانوسوں کو قہقہے لگاتے

ہوئے پاش پاش کیا۔ چھت گیریوں میں طلائی مرصّع کاری کے ایک ایک ٹکڑے کو تاراج کیا گیا۔ موتی مسجد کے گنبد پر چڑھے ہوئے سونے کے پتر کو نکالا اور فوج کی نگہہ داشت کے مصارف کی پابہ جائی کے لیے بیچا گیا۔ جب لوٹ کھسوٹ ہو چکی تو چند پرانی پوشاکوں، دواؤں اور معدودے چند کتابوں کے علاوہ کچھ نہیں بچا تھا۔ دیوانِ عام کو اسپتال میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ " شاہ جہاں کے پرستان جیسے خوش نما شہ نشین، شاہی ایوان اور چمن زار" فوجیوں کی بارکوں، طعام خانوں اور رسد و شراب کی دکانوں میں تبدیل کردیے گئے تھے۔

شاہی خاندان کے اکیس شاہ زادوں کو ایک ہی دن میں " موت کا حکم سنایا گیا، پھانسی دی گئی اور ان کی لاشوں کو چھکڑوں پر لاد کر لے جایا گیا۔ " دوسرے کئی شہ زادوں کو ان کے ہار مان لینے کے بعد بے دردی سے گولی ماردی گئی اور ان کی لاشوں کو نمائش کے لیے چاندنی چوک میں اس حالت میں رکھا گیا کہ بدن پر ستر پوشی کے لیے محض ایک لنگوٹ تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے خود کو انگریزوں کے حوالے کیا اور انھیں لال قلعے میں نیچی چھت اور چونے کی قلعی کی ہوئی بے آرائش دیواروں والی تنگ و تار کوٹھری میں مقید رکھا گیا۔ وہ ایک عجوبہ بن کے رہ گئے" جس کے تماشے سے کمشنر کی بیوی سے لے کر رتبے میں اس سے کم تر کوئی بھی وہ یورپین محظوظ ہوسکتا تھا جس کا دل کھڑے رہنے اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا کرے۔" ان کو دیکھنے والوں میں سے ایک نے جہاں پناہ کی حالت کی روداد یوں لکھی ہے:

> "۔۔۔ وہاں ایک نیچی چارپائی پر میلے کچیلے سفید سوتی کپڑوں کے جوڑے میں ملبوس اور پھٹی پرانی شالیں اور رضائیاں لپیٹے ایک دبلا پتلا کوتاہ قامت آدمی جھکا ہوا بیٹھا تھا۔۔۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو اس حقّے کو جو وہ پی رہا تھا اس نے ایک طرف رکھ دیا اور وہی شخص، جو پہلے اگر کوئی اس کے حضور میں بیٹھ جائے تو اسے اپنی توہین سمجھتا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ اسے ہم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، ہمیں بڑی عاجزی سے سلام پر سلام کرنے لگا۔"

دوسروں نے لکھا ہے کہ " ان کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلتا تھا، وہ دن رات فرشِ زمین

پر نظریں گاڑے ہوئے چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے جیسے کہ ان حالات سے جن سے اب وہ دوچار ہیں وہ قطعی بے خبر ہیں۔" دوسروں کا کہنا ہے کہ انھوں نے بہادر شاہ کو "اپنے خوابوں کے بارے میں بے ربط باتیں کہتے اور اپنے بعض اشعار کا حوالہ دیتے سنا۔۔۔" کہا جاتا ہے کہ کاغذ اور قلم میسر نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اشعار اپنی کوٹھری کی دیوار پر ایک جلی ہوئی لکڑی سے لکھتے تھے۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں وہ تا حیات رنگون جلاوطن کردیے گئے۔

غالب بہادر شاہ کے استاد تھے۔ ان کی راہ و رسم کئی دہے پرانی تھی۔ ان کے دوستانہ تعلقات، کبھی کبھار کی کشیدگی کے باوجود، ایک دوسرے کے لیے خاصے احترام اور محبت کے جذبات سے مملو تھے۔ یہ امر معنی خیز ہے کہ دستنبو میں غالب بادشاہ کے خلاف کچھ بھی کہنے سے احتراز کرتے ہیں۔ یہ روابط پشت در پشت کے تھے۔ بہادر شاہ کے فرزند بھی غالب کے شاگرد تھے۔ گزشتہ کئی سالوں سے غالب قلعہء معلیٰ میں حاضری دے رہے تھے۔ بہ حیثیت شاعر ان کی نشوونما کی ابتداء شاہی مشاعرے کے ماحول میں ہوئی۔ نصف صدی سے زائد عرصے کے دوران وہ قلعہء معلیٰ کو اپنی زندگی کا محور اور غیر متبدل تناظر سمجھتے رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مغل اقتدار کی روز افزوں کم زوری سے واقف تھے۔ فی الحقیقت وہ اس کے شاہد عینی تھے۔ لیکن وہ اس کے رول کے ایسے اچانک اختتام یا اس کی عظمت کی ایسی پر تشدد بے حرمتی کے لیے تیار نہیں تھے۔ بادشاہ کی تذلیل، شاہی محل کی تاراجی اور اس کی بعض نفیس ترین عمارتوں کا بے دردی سے فوجی بارکوں میں تبدیل کیا جانا تاحیات ان کے لیے ایک مستقل صدمہء جاں کاہ رہا ہوگا۔

اس وقت جب جنرل ولسن دیوانِ خاص میں شیمپین کی چسکیاں لگا رہا تھا، دلی ایک شہر ویران بن چکا تھا اس کے باشندوں کی اکثریت، مسلمان اور ہندو، امیر و غریب سبھی، انگریز فوجیوں کے قہر سے بچنے کے لیے شہر چھوڑ کر بھاگ چکی تھی۔ بہتیروں نے جاڑے بھر شہر کے باہر عارضی پناہ گاہوں میں پڑاؤ ڈالا۔ ان کی اذیت نہایت شدید تھی لیکن انگریز ان کو دوبارہ داخلے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھے۔ قید خانے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور جو لوگ قید ہونے سے رہ گئے تھے قتلِ عام نے انھیں ٹھکانے لگادیا تھا۔ ایک انگریز فوجی افسر لکھتا ہے:

"ان خاموش گلیوں میں سنائی دینے والی ہر آواز میں کوئی عجیب اور پُر اسرار بات تھی ، جہاں ہمارے قدموں کی چاپ یوں گونجتی تھی جیسے یہ مردوں کا شہر ہو ۔ جا بہ جا کوئی کتّا کسی لاش پر دبکا ہوا دکھائی دیتا یا حلق تک بھرا ہوا اڑنے سے قاصر کوئی گدھ ہمیں آتا دیکھ کر پَر پھڑپھڑاتا ایک طرف کو ہٹ جاتا ۔ ۔ ۔"

غالب ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو شہر چھوڑ کر نہیں گئے تھے ۔ "دستنبو" میں وہ اپنے ذہنی کرب کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"سارے شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گے ، میں بھی ان میں سے ایک ہوں ۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں ، ان میں سے کچھ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں گویا وہ اس سرزمین دہلی کے باشندے تھے ہی نہیں ۔ بہت سے عالی مرتبہ لوگ شہر کے ارد گرد دو دو ، چار چار کوس پر ٹیلوں ، گڑھوں ، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے پڑے ہیں"۔ نومبر ۱۸۵۸ء کو انگریزوں نے عام معافی کا اعلان کیا لیکن شہر میں داخلے کے لیے اجازت نامے (ٹکٹ) کی قید لگائی گئی ۔

فروری ۱۸۵۹ء میں غالب ایک دوست کے نام خط میں لکھتے ہیں :

"یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاس بانی پر قناعت نہیں ہے ۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے ، جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے ، اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے ۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے ۔ آٹھ دن قید رہتا ہے ۔ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرد کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے ۔ ۔ ۔ یہاں کا جماعہ دار میرے پاس بھی آیا ۔ ۔ ۔ سارے شہر میں مشہور ہے کہ (آبادی کے) پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے

گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بہ قدر مقدور نذرانہ دے،
اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔۔۔"

اس پر بس نہ کرتے ہوئے انگریزوں نے حکم دیا کہ جو لوگ شہر کی فصیل کے باہر پڑاؤ ڈال کر ٹھیرے ہوئے ہیں جائے پناہ تعمیر کرنے کے حق دار نہیں ہیں۔ غالب برہمی کے ساتھ لکھتے ہیں :

"کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان
کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھادو اور آئندہ کی
ممانعت کا حکم سنادو۔" (بہ نام مجروح ۲۰ / فروری ۱۸۵۹ء)۔

بازآباد کاری کا سارا طریقِ عمل وقفے وقفے سے رک بھی جاتا تھا اور مایوس کن بھی تھا۔ غالب حالات کے پیچ درپیچ نشیب و فراز پر باریک بینی سے نظر رکھے ہوئے تھے۔ شروع ہی میں جب اجازت نامے (ٹکٹ) چھپ گئے اور باشندوں کی واپسی کا ڈھنڈورا پٹوادیا گیا، مجسٹریٹ دہلی اجرٹن صاحب بہادر بغیر کسی پیشگی اطلاع کے کلکتہ روانہ ہوگئے اور بہ قول غالب "دلی کے حمقا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، منہ کھول کر رہ گئے۔۔۔" کچھ عرصے کے لیے بازآباد کاری کا کام بالکل کھٹائی میں پڑگیا۔ کبھی کبھی دفعتاً اسے پھر سے شروع کیا جاتا لیکن اس طرح کہ ناقابلِ توجیہہ طور پر احکام کا ایک زمرہ دوسرے سے منسوخ کردیا جاتا۔ غالب طنزیہ لکھتے ہیں کہ انشاء اللہ دو چار برس میں ایک محلہ آباد ہوجائے گا، جلدی کیا ہے؟ آخر کار نومبر ۱۸۵۹ء ہی میں جا کر، یعنی شہر سے عام بھگدڑ کے تقریباً دو برس بعد، واپسی کی عام اجازت دی گئی۔ لیکن ۱۸۶۳ء تک بھی دہلی کی آبادی ۱۸۵۷ء سے قبل کی آبادی کی سطح سے کہیں نیچے ہی تھی۔

اس زمانے میں انگریز حکام کے تعلق سے غالب کی تنقید کی بڑھتی ہوئی صاف گوئی پر ایک نظر ڈالنا دل چسپی سے خالی نہیں۔ یہ تنقید دوستوں کے نام خطوط میں ملتی ہے اور دستنبو کے عام رنگ سے کلیتہً متناقض ہے۔ ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں بغیر کسی تبصرے کے یہ نظم بھی شامل ہے :

بس کہ فعالِ مایرید ہے آج ہر سلح شور انگلستان کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہوئے آب ، انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ ، خاک تشنہ ء خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا؟ وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے داغ دل سے ہجراں کا

مئی ۱۸۵۸ء میں وہ ایک دوست کو مطلع کرتے ہیں کہ دہلی میں " نہ قانون نہ آئین ۔ جس حاکم کی جو رائے میں آوے ، وہ ویسا ہی کرے ۔ " جولائی ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ انگریزوں کی بے ذوقی اور مطلق العنانی پر تباہ کن تنقید کرتے ہیں ۔ ان کے ایک شناسا حافظ ممّو تمام الزامات سے بری اور بے گناہ ثابت ہوچکے تھے اور اب ان کی املاک ، جن پر ان کا قبض و تصرف ثابت ہوچکا تھا ، ان کو واپس ہونی تھیں ۔ جب مثل پیش ہوئی تو کمشنر نے پوچھا : " حافظ محمد بخش کون ؟ " عرض کیا کہ " میں " ۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممّو کون ؟ " عرض کیا کہ " میں ، اصل نام میرا محمد بخش ہے ، ممّو ، ممّو مشہور ہوں ۔ " اس چھوٹی سی بات کو سمجھنے کے لیے جس سعی کی ضرورت تھی شاید وہ کمشنر کی برداشت کے باہر تھی ۔ مثل داخلِ دفتر ہوئی اور میاں ممّو خالی ہاتھ اپنے گھر چلے آئے ۔ اسی مہینے کے ایک خط میں وہ پھر شکایت کرتے ہیں کہ معاوضے کے تعین اور املاک کی واپسی کے معاملے میں سراسر بے اصولی ہی مسلمہ قاعدہ ہے ۔ " ہر شخص کی سرنوشت کے مطابق حکم ہورہے ہیں ۔ نہ کوئی قانون ہے ، نہ قاعدہ ہے ۔ نہ نظیر کام آئے ، نہ تقریر پیش جائے ۔ " بعض اوقات ان کی تنقید خلافِ توقع گہرا سیاسی رنگ لیے ہوئے ہوتی ہے ۔ دسمبر ۱۸۵۹ء میں حسین مرزا کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں :

" ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ ، نقصانِ رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے

> اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے، البتہ اس کا معاوضہ بہ حساب دہ ایک سرکار سے ہوگا۔ یعنی ہزار روپے مانگنے والے کو سو روپے ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہدر اور بحل، مباح اور معاف ہے۔ اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔۔۔"

لیکن بنیادی طور پر ان کی تلخی کا باعث ذاتی صدمے کا شدید احساس تھا جس کا اظہار برہمی سے زیادہ حزن و ملال کے ایک مستقل احساس میں ہوتا تھا۔ موسموں کی تبدیلی، شہر کے بدلتے ہوئے رنگوں، مسرتوں اور تفریحوں اور اپنے وسیع حلقہ، احباب کی رفاقت سے لطف اندوزی کے تعلق سے غالب کی شدید قوتِ احساس کو ان کی گرتی ہوئی صحت کچل نہیں پاتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے نتیجے میں، جب غالب خستہ حال اور آتش باری سے داغ داغ شہر میں اپنے کمرے میں گوشہ نشین تھے، ہم کو ۱۸۵۸ء کے اوائل میں لکھے ہوئے اس خط سے ان کی مایوسی اور پریشانی کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے جس میں وہ اس امر واقعہ پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ اس سال اس شہرِ خموشاں میں ماہِ فروردیں اور عیدِ نوروز دونوں بغیر اطلاع اپنے جلو میں شادمانی لائے بغیر آئے بھی اور گزر بھی گئے اور اپنی قسمت پر روتے ہیں کہ وہ بہار کے استقبال، سبزہ و گل کے نظارے اور گلاب کی خوش بو سے لطف اندوز ہونے کے لیے بھی باہر نہیں جاسکتے۔ تنہائی اور دل گیری ان کے اہم مسائل تھے۔ ۲۵ / اپریل ۱۸۵۸ء ... تفتہ کو غم آلودا نہ لکھتے ہیں کہ تنہ... ہم نشینوں کے بغیر، دن بھر ان کے پاس کرنے کو کچھ ... ہوتا۔ یہی بات وہ دستنبو میں بھی دہراتے ہیں:

> " غالب جس کے شہر میں ہزاروں دوست تھے، ہر گھر میں شناسا اور واقف کار موجود تھے، اس تنہائی میں قلم کے سوا کوئی اس کا ہم زباں اور اپنے سایے کے علاوہ کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے۔"

علاحدگی پسند اور اس کے باوجود دراصل ملنسار غالب، خوش اسلوب و خوش گفتار غالب، وہ خوش طبع جو حاضر جوابی کے کسی بھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا، وہ ادیب جو کبھی اس شاعر اور کبھی اس ... کے کلام کے حُسن و قبح پر طویل مباحثوں کا رسیا تھا، وہ لطیفہ ... جس کی داد دینے والے کثیر التعداد حاضرین حوصلہ افزائی کرتے تھے، اس کے اشارے پر چلنے

والے ثناخواں شاگردوں کا پسندیدہ استاد، وقت کے وقت منعقد کی جانے والی محفلوں اور باضابطہ مشاعروں میں مکرر ارشاد کی بار بار سنائی دینے والی صداؤں کا عادی شہر کا سرکردہ شاعر غالب، ۱۸۵۷ء کے قبل کے نظام کے پر تشدد طور پر تہس نہس کردیے جانے سے خود کو محرومی کا شکار اور تن تنہا محسوس کرتا تھا۔

بالخصوص اپنے احباب سے جدائی ان کے لیے سوہانِ روح تھی، جن میں سے بہتیرے ان کے لڑکپن کے ساتھی تھے۔ فضلِ حق کو جو شاید ان کے سب سے زیادہ قریبی دوست تھے، حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا سنائی گئی تھی۔ ان سے دوبارہ ملاقات غالب کی قسمت میں نہیں لکھی تھی۔ ایک اور قریبی دوست شیفتہ کو سات سال قید کی سزا سنائی گئی۔ (بعد میں وہ ضمانت پر رہا کیے گئے)۔ دوسرے بے شمار کو یا تو پھانسی دی گئی یا پھر وہ انگریزوں کی انتقامی کارروائی سے بچنے کے لیے فرار ہوگئے۔ چوں کہ غالب کی روزمرّہ کی زندگی اور معمولات استواری کے ساتھ ان احباب کی موجودگی سے مربوط تھے ان کی غیر موجودگی غالب کی زندگی میں ایک خلا کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس دور کے ایک خط میں وہ اس وجہ سے اپنے رنج و غم کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ جون ۱۸۵۸ء میں وہ لکھتے ہیں:

> "کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دوچار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیورام جی برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ (دوسرے شہروں کے) دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔" (خط بہ نام تفتہ ۱۹۰/ جون ۱۸۵۸ء)۔

جب بھی بر سبیلِ تذکرہ کسی دوست کا نام خطوط میں آجاتا ہے یادِ ماضی کی افسردگی ان کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ ان دنوں کی یاد میں محو ہوجاتے ہیں جب ان کا حلقہء احباب صحیح سلامت تھا اور وہ سب اکٹھا ہوسکتے اور ہنسی دل لگی کی باتوں میں اپنا وقت گزار سکتے تھے۔ ان کے خطوط ہمیں ان احباب کی ایک لامتناہی فہرست فراہم کرتے ہیں جن کی غیر موجودگی پر وہ ماتم کناں ہیں: مظفر الدولہ میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ، احمد مرزا، حکیم رضی الدین خاں، مصطفیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، حسین مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین،

میرن صاحب ۔۔۔ جس طریقے سے انھیں کھڑے گھاٹ پھانسی دی گئی یا گھر اور املاک چھوڑ کر شہر سے بھاگنے پر مجبور کیا گیا اس کا خیال انھیں دن رات بار بار آتا ہے ۔ اس غم سے وہ تادمِ آخر چھٹکارا نہیں پاسکے ۔ ۱۸۵۷ء کے کافی عرصے کے بعد بھی وہ چشمِ تصور کے سامنے ان دنوں کی تشکیلِ نو کرتے ہیں جب احباب ان کے ہاں بے تکلف آجاتے، دل لگی اور تفریح کا سامان مہیا ہوجاتا ۔ ۱۸۵۸ء میں وہ ایک خط میں لکھتے ہیں :

" وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں ۔ سیڑھیوں پر نظر کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے ۔۔۔ اللہ اللہ ، ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا ؟ " (خط بہ نام میر سرفراز حسین، ۱۸۵۸ء) ۔

غالب کی آزردہ دلی کا سبب نہ صرف احباب اور مانوس چہروں کی عدم موجودگی بلکہ دراصل ہم زبانوں اور ہم سخنوں کی یعنی ان لوگوں کی عدم موجودگی تھی جو ذہنی اور جذباتی مفہوم میں ان کی زبان میں بول سکتے ہوں، ان مہذب و شائستہ لوگوں کی عدم موجودگی جن کے ساتھ دسیوں سال کے عملِ باہمی کے نتیجے میں یگانگت اور احترام کا رشتہ استوار ہوا تھا اور جن کے ساتھ وہ جانے بوجھے محاورے میں بے تکلف گفتگو کرسکتے تھے ۔ ۱۸۶۱ء میں اپنے ایسے ہی ایک دوست کے نام خط میں وہ لکھتے ہیں :

" اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں ، یا پنجابی ہیں، یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے ؟ ۔۔۔ نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں ؟ مومن کہاں ؟ ۔ ایک آزردہ سو خاموش ، دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش ، نہ سخن وری رہی ، نہ سخن دانی ۔۔۔ "

شہر دہلی مادّی طور پر بھی بدل رہا تھا ۔ اس پر دوبارہ قبضے کے فوراً بعد بہتیرے انگریزوں کا خیال تھا کہ سارے شہر کو زمین کے برابر کردینا ہی غدار ملحدوں سے نبٹنے کا واحد طریقہ ہے ۔ دوسروں کی سنجیدہ رائے یہ تھی کہ جامع مسجد کو گرا دینا اور لال قلعے کو منہدم کردینا اور ان کی جگہ ایک بڑا گرجا اور وکٹوریہ محل تعمیر کرنا چاہیے ۔ بالآخر ایک نسبتاً معتدل تجویز کو

ترجیح دی گئی ; لال قلعے کو ڈاینامیٹ سے نہیں اڑا یا گیا ، اس کے لاہوری اور دلی دروازوں کو (خاصے بے ڈھنگے پن سے) وکٹوریہ اور الیکزانڈرا دروازوں کا نیا نام دیا گیا اور محل کو فوجی بارکوں میں تبدیل کردیا گیا ۔ اسی طرح جامع مسجد اور تعلیم و تعلم کے مقامِ مقدس مدرسہ ، غازی الدین (دہلی کالج) کے بہ شمول بہتیری عمارتوں کو فوجی بارکوں میں متبدل کردیا گیا ۔ نفیس و خوش نما فتح پوری مسجد کو نجی جائداد کے طور پر ایک ہندو بیوپاری کے ہاتھ بیچ دیا گیا اور زینت المساجد کو حسب الحکم افسرانِ مجاز ایک تنور خانے یا بیکری میں تبدیل کردیا گیا ۔

غیر ملکی فاتحوں کا اولین مقصد دہلی کو حکم رانی کے لیے مزید دست رس پذیر بنانا تھا ۔ دہلی کے پُرپیچ گلی کوچوں ، اس کی تنگ خم دار سڑکوں اور غیر متوقع بند گلیوں ، اس کے علاحدہ علاحدہ اور اس کے باوجود باہم دگر مربوط محلّوں کی ساخت نے باغیوں کے لیے ایک مثالی جائے پناہ اور اوٹ کا کام دیا تھا اور انگریزوں کے لیے شہر پر دوبارہ قبضے کے کام کو بہت مشکل بنادیا تھا ۔ چناں چہ انگریزوں نے طے کیا کہ اس گھنی نامیاتی ساخت کو بدلنا ہی ہوگا ۔ عملِ جراحی کے دوران نشتر سے کی جانے والی چیر پھاڑ کی طرح ایسی نئی کشادہ سایہ دار سڑکیں بنانی ہوں گی جو شہر کی تاریخی نشوونما کے نتیجے میں معرض وجود میں آنے والی خصوصیات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس میں سے صاف سیدھی گزر جائیں ۔ کھلے قطعاتِ زمین کو وجود میں لانا ہوگا تاکہ حکم راں کی نگاہ متجسس شہر کے آرپار بہتر دیکھ سکے ۔ شہری منصوبہ بندی کا کام اس بنیاد پر کرنا ہوگا کہ نتیجتاً دہلی ایک محفوظ و مامون فوجی چھاونی والا شہر بن جائے جہاں بغاوت کے ابتدائی آثار کا فوراً پتہ چلایا جاسکے اور اسے موثر طریقے سے کچل دیا جاسکے ۔

شہری منصوبہ بندی کے نئے تقاضوں کے پیش نظر اب یہ لازم ہوگیا کہ کشمیری دروازہ نہیں بلکہ جائے لال قلعے کو شہر کے اہم ترین فوجی مرکز کی حیثیت دی جائے ۔ چناں چہ حکم صادر کیا گیا کہ قلعے کی فصیلوں سے ۴۴۸ گز کے فاصلے کے اندر واقع تمام عمارتیں منہدم کردی جائیں ۔ ابتداءً مشہور کاروباری مرکز دریبہ بھی حلقہ ء انہدام میں شامل تھا ۔ لیکن بعد میں سربرآوردہ شہریوں کی نمائندگی پر اسے بخش دیا گیا ۔ جامع مسجد کے اطراف بھی تمام رکاوٹیں دور کرکے ایک کھلے قطعہ ء زمین کو وجود میں لانے کا حکم دیا گیا ۔ طے ہوا کہ دو نئی

سڑکوں اور ریل کی پٹری کے راستے میں واقع تمام عمارتیں بھی ڈھادی جائیں۔ ذہنی کرب کے ساتھ غالب لکھتے ہیں: "جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا فنا ہوجائے گی، رہے نام اللہ کا۔۔۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔" (خط بہ نام مجروح ۸ / نومبر ۱۸۵۹ء)۔(دارالبقا: آزردہ کی قائم کی ہوئی وہ مشہور درس گاہ جہاں ادب، طب اور دینیات کی تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ مصنف) انہدامی کارروائی بے رحمی کے ساتھ متاثر لوگوں کے جذبات کی پروا نہ کرتے ہوئے، انجام دی جاتی تھی۔ انگریزوں کے لیے یہ کام محض رسمی یا تکمیلِ ضابطہ کے لیے نہیں بلکہ مناسب انتقامی کارروائی کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ لکھنو میں جہاں ایسی ہی ایک کارروائی روبہ عمل لائی جارہی تھی، چیف کمشنر اپنے ایک غیر رسمی خط میں ذکر کرتا ہے کہ "کیسے انہدام کے لیے مخصوص علاقوں میں انہدامی جتھے وارد ہوتے اور اتنی معمولی سی احتیاط برتے بغیر کہ چند ہی لمحوں میں زمین کے برابر کردیے جانے والے گھروں کے خالی ہونے کی پوری طرح تصدیق کرلیں اپنا کام شروع کردیتے۔" مجوزہ طور پر فصیل بند شہر کے کل رقبے کے ایک تہائی کو گھیرنے والی چھاؤنی کو معرضِ وجود میں لانے کے لیے زمین کے وسیع و عریض قطعات پر بھی "اصلی مالکوں کے حقوق کا ضرورت سے زیادہ پاس و لحاظ کیے بغیر، بیش تر اس حق کی رو سے جو فاتحین کو حاصل ہوتا ہے" قبضہ کرلیا گیا تھا۔ غالب ان ہزاروں انسانوں کی بپتا پر مغموم تھے جو راتوں رات اپنے گھر بار سے محروم کردیے گئے تھے۔ ان کا ذہنی کرب صرف مسلمانوں کے لیے نہیں تھا بلکہ شہر دلی کے سبھی باشندوں کی افسوس ناک حالت انسانوں پر ٹوٹنے والی مصیبت کی انتہائی شدت کی وجہ سے تھا۔ ایک اور سطح پر انھیں نئی شہری منصوبہ بندی کے نتیجے میں شہر کی قلبِ ماہیت کا بھی شدت سے احساس تھا۔ جب انگریز کوئی کوچہ، گلی یا محلہ مسمار کرتے اور ملبے پر ایک کشادہ اور سیدھی سایہ دار سڑک تعمیر کرتے تو دراصل وہ اس طرزِ زندگی کا قلع قمع کرتے تھے جس سے شہر کے مادی خط و خال میل کھاتے تھے۔ ہندستان کے پرانے شہروں میں سڑکیں شاذ و نادر ہی کشادہ یا سیدھی ہوتی تھیں۔ وہ "بیش تر ان علاقوں کی حیثیت سے کام آتی تھیں جہاں لوگ بے مقصد گھومتے پھرتے تھے، ملتے جلتے تھے اور ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے، جہاں سڑک کے

کنارے کنارے خوانچے والوں کی قطار لگی رہتی تھی، جہاں تجارتی سامان اور خدمات لائقِ خریدی اور فروخت کی جاتی تھیں اور جہاں ٹریفک، جو بیش تر پیدل راہ گیروں اور لدّو جانوروں پر مشتمل ہوتی، سست رفتار ہوتی اور ان لوگوں کا لحاظ کرنے پر مجبور ہوتی جو راستے میں کھڑے اور کاروبار میں مشغول ہوتے۔ سڑک ایک عام جگہ تھی جس کے معاشرتی اور تفریحی مقاصد تھے۔۔ عموماً سڑک پر لوگ کہیں جانے کے لیے نہیں نکلتے تھے، سڑک خود ایک منزل مقصود تھی اور بجائے خود ایک اہم واقعہ۔" اسی طرح بند گلیاں جن کے لیے شہری منصوبہ بندی کے انگریز ماہرین کے نقشوں میں کوئی جگہ نہیں تھی " ایک محلے کو گتھا ہوا اور اپنوں کے لیے مخصوص رکھنے کے لیے، راہ گیروں اور سواریوں کی آمد و رفت کو قابو میں رکھنے کے لیے اور شہر کے مختلف محلوں کے لیے مخصوص بھائی چارے کے خیالات اور ایکتا کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی ساخت کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل" تھیں۔

اس شہر پر حکم رانی کے خواہش مند ایک غیر ملکی کے لیے بالکل نمایاں اپنی ان تمام مادی لغویات کے باوجود شہر دہلی اپنے باشندوں کے لیے، ان کے کاروباری اور تفریحی دونوں اغراض پورا کرنے والا، ہر دل عزیز، کارکرد اور اطمینان بخش ماحول فراہم کرتا تھا۔ دہلی کے شاعر اس کی دل فریبیوں کے تعلق سے کھلم کھلا جذباتی تھے۔ اس کی باقاعدہ قطع دبرید کا لاچار شاہد عینی ہونا غالب کی قسمت میں لکھا تھا۔ جب انہدام کی کارروائی شروع ہوئی تو وہ بگڑ کر لکھتے ہیں: " کیوں میں دلی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں؟ جب اہلِ شہر نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں؟" (خط بہ نام یوسف مرزا ۲۶۰/ جولائی ۱۸۵۹ء)۔" لیکن برہمی کی جگہ جلد ہی شاید دل شکستگی نے لے لی اور اس دور کے ان کے خطوط میں ہمیں ان کے پسندیدہ شہر سے جس انداز میں بے رحمی کا برتاؤ کیا جا رہا تھا اس کے ہر پہلو کا تفصیلی بیان ملتا ہے یکے بعد دیگرے وہ دہلی کے بعض نہایت مشہور بازاروں، خاص بازار، اردو بازار، خانم کے بازار کو خاک میں ملتا اور سارے کے سارے محلوں اور کٹڑوں کو بے نام و نشان دفعتاً غائب ہوتا دیکھتے ہیں۔ جانی بوجھی مشہور عمارتیں اور احباب کے وہ محلات، حویلیاں اور کوچے جہاں وہ اکثر ملاقات کے لیے آیا جایا کرتے تھے ان کی آنکھوں کے سامنے زمین کے برابر کردیے گئے۔ ہر جگہ ملبے کے ڈھیر سے شہر دہلی ایک بنجر ویرانہ

ھائی دیتا تھا ۔ غالب لکھتے ہیں کہ شہر صحرا ہوگیا ہے ۔ خصوصاً اس لیے کہ جنگ اور ہدامی کارروائیوں کے جوش کے نتیجے ہیں کنوؤں کی نگہ داشت سے غفلت پانی کی شدید ت کا باعث ہوئی تھی ۔ وہ لکھتے ہیں :

> " مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں ، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہوجائے ۔ ۔ ۔ اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں ، واہ رے حسنِ اعتقاد ، ۔ ۔ ۔ دلی واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے چھاؤنی ہے ۔"

ایک انگریز نووارد جو ۱۸۵۷ء کے چند سال بعد دلی آیا غیر جانب دارانہ لیکن حقیقتِ اقعہ کو ظاہر کرنے والی راست بیانی سے کام لیتے ہوئے لکھتا ہے : " بغاوت کے بعد سے ۔ ۔ ۔ لیسی شہر بری حد تک منہدم کردیا گیا ہے اور جو بچا ہے اس سے شہر کی دس سال قبل کی وسعت ا آبادی کا نامکمل طور پر ہی اظہار ہوتا ہے ۔" انہدامی کارروائیوں سے شہر کے مادی خط و خال میشہ کے لیے بدل گئے ۔ ان سے باشندگانِ شہر کے طرزِ زندگی کے نہایت اہم پہلوؤں میں خلل پڑا ۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کارروائیاں " غیر منقولہ شہری جائدادوں کی ملکیت کے تعلق سے ایک غیر معمولی انقلاب "، کی آلہ ، کار بھی ثابت ہوئیں ۔ وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ان لوگوں کی املاک ، جنھوں نے یا تو بغاوت میں حصہ لیا تھا یا جن کے بارے میں ایسا شبہ تھا ، انگریز حکام نے ضبط رلی تھیں ۔ اب انھوں نے طے کیا کہ جن کے گھر منہدم کیے گئے تھے انھیں بہ طور معاوضہ ان ضبط شدہ املاک میں سے اتنی ہی قیمت کا حصہ دیا جاسکتا ہے ۔ اس تجویز کو روبہ عمل لانے کے لیے مالکین کو ٹکٹ جاری کیے گئے جن پر ان کی منہدمہ املاک کی قیمت کی نشان دہی کی گئی تھی اور جن کے بدلے میں وہ ضبط شدہ املاک میں اپنا حصہ حاصل کرسکتے تھے ۔ بادی النظر میں یہ ایک سیدھی سادی اور عمدہ تجویز تھی ۔ لیکن اس طرح کی تجاویز کسی جامد سماجی و معاشی ماحول میں تو روبہ عمل آتی نہیں ۔ املاک جن کے نام دراصل منتقل کی گئی تھیں ان سے یہ ٹکٹ معدودے چند بیوپاریوں اور مہاجنوں نے خرید لیے اور انھوں نے اپنی ایک غیر رسمی اجارہ دارانہ انجمن کے ذریعے اس وقت جب کہ زمین کی قیمت غیر معمولی طور پر گرچکی تھی ، وسیع و

عریض املاک ساری کی ساری حاصل کرلیں ۔ ضبط شدہ املاک کو نیلام کرنے کی انگریز حکام کی متبادل تجویز پر عمل آوری سے بھی انھی لوگوں کو فائدہ ہوا ، جنھوں نے ان املاک کے قابلِ لحاظ حصے پر اس ادعا کے ساتھ کہ پرانے مکین ان کے گروی دار تھے ، قبضہ کر رکھا تھا ۔ اس طرح اس سارے عمل درآمد نے ایک نئے تجارتی طبقے کے منظم ظہور اور قدیم جاگیر دار ...اروں کی مزید مفلسی کے لیے ایک عامل اور تیز کنندہ کا کام دیا ۔

ان دونوں طبقوں نے شہر پر انگریزوں کے دوبار... ہونے کے بعد لوٹ مار میں نقصان اٹھایا تھا ۔ اس وقت مالِ غنیمت کی نشان دہی کرنے والے جاسوسوں کا تقرر کیا گیا تھا اور دفینہ کھوجنے والوں کو سرکاری " کھدائی کے اجازت نامے " دیے گئے تھے ۔ انگریز فوجی افسر ، سپاہی ، ان کی بیویاں اور رشتے دار کدالیں اور کرچھے لیے ایسے ولولے اور بشاشت سے اس کام میں لگے تھے کہ اس کا اور باشندگانِ دہلی کی دل شکستگی کا تضاد مضحک طور پر نمایاں تھا ۔ روزانہ حاصل کیا جانے والا مالِ غنیمت ایک جوشیلے انگریز کے یہ قول " بہت ہی زیاد... تقریباً ناقابلِ یقین " تھا ۔ کھدائی میں پائے جانے والے دفینوں کا بیش تر حصہ " جو پاے وہی رکھے " کے اصول کے مطابق پانے والوں کے تصرف میں آیا ۔ ستم ظریفی یہ کہ اس مالِ غنیمت کا ایک حصہ دیوانِ خاص کے پاس ایک مکان کی چھت پر ... فروخت نمائش کے لیے رکھا گیا ۔

بیوپاری ساہوکار طبقہ اس منظم لوٹ مار سے بری طر... متاثر ہوا تھا ۔ بغاوت کے دوران بھی اس طبقے کو باغی سپاہیوں کے سرگروہوں کی طرف سے کیے جانے والے بے روک ٹوک اور حدود سے متجاوز استحصالِ زر سے اتنا ہی زیادہ نقصان پہنچا تھا ۔ قابلِ تعریف ہے اس کی اقتصادی لچک ، کاروباری کس بل اور نظریاتی تغیر پزیری جس کی بہ دولت یہ طبقہ باقی رہا ۔ جاگیردار طبقہ ء امرا نسبتاً کم پھرتیلا تھا ۔ دونوں سے طرزِ زندگی میں بنیادی فرق تھا ۔ اول الذکر طبقہ کفایت شعاری کی روایتی اہمیت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے پشت در پشت پونجی جٹانے کے کام میں لگا رہا تھا ۔ موخرالذکر طبقہ اس طرزِ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے جس کے اخراجات کی پابہ جائی کے لیے اس کے پاس وسائل کا فقدان تھا ، قرض لینے کو ترجیح دیتا تھا ۔ یہ طبقہ ، انگریزوں کی طرف سے کی جانے والی لوٹ مار ، املاک کی بڑے پیمانے پر ضبطی اور انہدامی کارروائیوں سے مربوط پیچ در پیچ تجارتی معاملات کے نتیجے میں لاعلاج طور پر

ہزیمت کا شکار ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس طبقے کا اقتصادی زوال کافی پہلے شروع ہوچکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے قبل بھی، بعض سربرآوردہ زمین داروں کو چھوڑ کر، روپے پیسے کی طاقت ساہوکاروں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء تک ان کی اقتصادی قوت اور سماجی برتری میں توافق نہیں تھا، ۱۸۵۷ء کے بعد لالہ شاہی کا ابھار خود اعتمادانہ علانیہ تھا۔ چنامل، صاحب سنگھ، رام جی داس، نارائن داس، مہیش داس، جانکی داس، مہر چند اور مرزا علی جیسے لوگ سماج کی پیشوائی کے دعوے دار ہوئے اور انگریزوں نے، جو جاگیردار رودداروں کی وفاداری کو شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے اور اپنی حکم رانی کے اگلے مرحلے میں نئے شرکاءِ کار کی تلاش کے خواہش مند تھے، یہ پیشوائی ان کو عطا کردی۔

اس سیاسی اور سماجی توازن میں تبدیلی کا اور توازنِ قوت کے خود ان کے اور قدیم طبقۂ امرا کے خلاف متغیر ہونے کا غالب نے جلد ہی اندازہ لگا لیا۔ نظریاتی مفہوم میں اس رجحان کے پیچھے کارفرما سماجی اور معاشی عوامل سے چاہے وہ واقف نہ رہے ہوں لیکن جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا اس کا ادراک ایک حد تک انھیں ضرور تھا اور اس تعلق سے اپنے رنج و غم کے اظہار میں انھوں نے ابہام سے بالکل کام نہیں لیا۔ ۱۸۵۸ء میں ایک دوست کے نام خط میں، جو ایک اخبار کے لیے دہلی میں خریداروں کی تلاش میں تھے، وہ لکھتے ہیں: "صاحب۔۔۔ یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو؟ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں، وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے۔ کاغذ (بہ طورِ اخبار) روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے۔" (خط بہ نام شیونرائن آرام، ۱۸۵۸ء)۔ اسی رنگ میں کچھ دنوں بعد وہ لکھتے ہیں: "ساہوکاروں کے اور جوہریوں کے گھر روپے اور جواہر سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں۔۔۔ وہ مال کیوں کر اٹھاؤں گا (خط بہ نام حاتم علی بیگ مہر ۲۰/ دسمبر ۱۸۵۸ء)، نومبر ۱۸۵۹ء میں سارے طبقے کی فریاد کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ نواب رام پور کو لکھتے ہیں کہ وہ حکام میں سے کسی سے بھی متعارف نہیں ہیں، سارا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ ۱۸۵۹ء میں گورنر جنرل کی دہلی میں آمد متوقع تھی۔ اس موقع پر روایتی پرتکلف دربار منعقد ہونے والا تھا۔ اس سے پہلے دہلی میں گورنر جنرل کا آخری دربار لارڈ ہارڈنگ نے منعقد کیا تھا۔ اس دربار میں غالب کے لیے ایک معزز

جگہ یعنی داہنی طرف دسویں نشست مقرر تھی اور ہمیشہ " سنہرے اساوری کے سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید تین رقم " اور خلعت فاخرہ پاتے تھے ۔ لیکن اب طبقہ، امرا میں سے بہتیروں کو، جن کی پہلے دربار میں معزز جگہیں مقرر تھیں، مدعو تک نہیں کیا گیا تھا۔ غالب بھی انھیں میں سے تھے اور ناگواری کے ساتھ لکھتے ہیں: " نواب گورنر جنرل بہادر، ۱۵ / دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے ۔۔۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے (دہلی کے آس پاس سے سات چھوٹی ریاستیں) کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا: جھجر، بہادر گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو ۔ چار معدوم محض ہیں ۔ جو باقی رہے، اس میں دوجانہ و لوہارو تحتِ حکومتِ ہانسی حصار ۔ پاٹودی حاضر ۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں (دوجانہ و لوہارو) کو یہاں لے آئے تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس ۔۔۔ اہلِ اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں: میرٹھ میں مصطفیٰ خان، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خان، بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد ۔ تینوں مردود و مطرود، محروم و مغموم ۔" (خط بہ نام مجروح ۲۰ / دسمبر ۱۸۵۹ء) ۔ کچھ ہی دنوں بعد وقوع پذیر سماجی تغیر کلّی کے ناقابلِ منسوخی ہونے کے حیرت انگیز ادراک کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ایک دوست کو مشورہ دیتے ہیں: " اب یوں سمجھو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے، نہ جاہ و حشم رکھتے تھے، نہ املاک تھے، نہ پنشن رکھتے تھے ۔" (خط بہ نام حسین مرزا ۳۱۰ / دسمبر ۱۸۵۹ء) ۔

غالب کے خطوط میں طبقہ " امرا کے مسلمان ارکان کے خصوصی ذکر سے ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ انھیں صرف مسلمانوں کی رنجش کا احساس تھا ۔ درحقیقت اسی زمانے میں وہ یقینِ کلّی کے ساتھ تفتہ کو لکھتے ہیں کہ میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں ۔ دہلی کے مغل امرا کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی جب کہ نئی نئی ابھر کر سامنے آنے والی لالہ شاہی میں بیش تر ہندو پیش پیش تھے ۔ اس کی وجہ سے نظامِ نو پر رائے زنی کے دوران بعض اوقات غالب ہندوؤں اور مسلمانوں میں امتیاز کرتے ہیں ۔ لیکن اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں کہ اس طرح وہ اپنے فرقے نہیں بلکہ اپنے طبقے کی شکایات کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ اپنے اس رول میں وہ ان افراد کی معاشی بربادی اور تذلیل کے تعلق سے، جو بیش تر متمول اور بارسوخ تھے اور جن میں سے بعض کا ان کے

ہی دوستوں میں شمار تھا ، برہمی اور تشویش کے اظہار کے اہل تھے ۔ وہ طنزیہ ذکر کرتے ہیں حکیم احسن اللہ خاں نے اپنے دیوان خانے کو زنانہ مکان بنالیا ہے اور خود جہاں اصطبل وہاں بیٹھتے ہیں ۔ باقی سارے مکان میں ایک انگریز اترا ہوا ہے ۔ وہ برہمی کے ساتھ لکھتے ں کہ انہدامی کارروائیوں کے بعد ملبہ تک مالکِ مکان کی ملکیت نہیں سمجھا جاتا ہے ، یوں عوکہ سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا ہے ۔

نومبر ۱۸۵۹ء میں وہ لکھتے ہیں : " یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے ریں اور میں دیکھوں ۔ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے ۔" (خط بہ نام یوسف مرزا، ۱ / نومبر ۱۸۵۹ء) ۔ دو سال بعد بھی یہ منظر مستقل سوہانِ روح تھا ۔ اپریل ۱۸۶۱ء میں وہ تفتہ ے نام خط میں لکھتے ہیں : " ۔ ۔ ۔ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے ۔ ورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے ، پائنچے لیر لیر ، جوتی ٹوٹی ۔ "

غیر واضح طور پر ، صورت حال کے تجزیے سے زیادہ شاعرانہ وجدان کے نتیجے میں ۱۸۵ ء ہی میں غالب کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ نظامِ کہن ہمیشہ کے لیے رخصت ہوچکا ہے ۔ تفتہ ے نام اس دور کے ابتداہی ، یعنی دسمبر ۱۸۵۷ء میں لکھے ہوئے ایک خط میں مغل بادشاہ ے زمانے کے نظمِ عالم اور اس طرزِ زندگی کو جس سے وہ (یعنی غالب اور تفتہ) مانوس تھے ض فریبِ نظر ، خواب و خیال کی بات اور کسی پچھلے جنم کی یادداشت قرار دیتے ہیں ۔ اس وسرے جنم میں بعض اشخاص شاید وہی ہوں لیکن اور کوئی بھی چیز اصلی حالت کو کبھی لوٹ ۔ پائے گی ۔ شہر کے بدلے ہوئے مادی اور سماجی خط و خال سے اس جذباتی احساس کی ریخی تصدیق ہوتی تھی ۔ دسمبر ۱۸۵۹ء میں غالب لکھتے ہیں : " دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں ِ تھی ۔ قلعہ ، چاندنی چوک ، ہر روز مجمع جامع مسجد کا ، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی ، ہر سال سیلہ پھول والوں کا ۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں ، پھر کہو دلی کہا ؟ ہاں ، کوئی شہر قلمرو ہند بں اس نام کا تھا ۔ (خط بہ نام مجروح ۲۰ / دسمبر ۱۸۵۹ء) ۔

یہ ایک تاریخی دور کے گزر جانے پر اس غالب کی لکھی ہوئی خبرِ موت ہے جو خود ۱۸۵۷ء کے قبل کی دلی کی ایک منتخب علامت تھے ۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ بہ جز اس کے جو وہ فی البدیہہ لکھ لیتے تھے ان کو اب شعر گوئی سے کوئی رغبت نہیں رہی تھی ۔

اپریل ۱۸۵۸ء میں تفتہ کے نام خط میں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ "شعر کہنا اب مجھ سے بالکل چھوٹ گیا ہے۔ اپنا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیوں کر کہا تھا۔" ان دنوں اکثر انھیں علائق دنیوی سے ماورائیت کا ایک شدید احساس، انسان کی مسلسل جد و جہد کی لاحاصلی اور وجودیاتی مفہوم میں اپنی تمام امنگوں اور خواہشوں کے کھوکھلے پن کا تصور اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ ۱۸۵۹ء میں تفتہ کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> "بو علی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری، سب خرافات ہے۔۔ ہندوؤں میں کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا! دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گم نام جیے تو کیا! کچھ وجہِ معاش ہو اور کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ جس سنائے میں میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے، اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے ن ت شاعر ہیں، مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے، ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہو گا؟"

انھیں یقینِ کلی تھا کہ اب وہ زیادہ نہیں جیئیں گے۔ بڑھاپا، گرتی ہوئی صحت اور روزانہ زندگی کے لامتناہی نشیب و فراز اس فلسفیانہ مایوسی کا سبب تھے۔ دسمبر ۱۸۵۹ء میں ایک دوست کے نام خط میں وہ لکھتے ہیں: "میری زندگی کب تک؟ ۔۔۔ اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر، نہ پانی کی پیاس، نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت۔ نہ حاکم کا خوف، نہ مخبر کا خطر، نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے اور نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت گھی منگاؤں، نہ روٹی پکواؤں۔ عالمِ نور اور سراسر سُرور۔" (خط بہ نام

ن مرزا، ۳۱ / دسمبر ۱۸۵۹ء) ۔ عاقبت کی اس مبالغہ آمیز حمد و ثنا کے پیچھے اس میں کوئی
، نہیں کہ ایک حقیقی روحانی ایقان تھا، علائقِ دُنیوی سے ذہنی لاتعلقی تھی اور بنی
انسان کے لیے مقدر صدمات اور پریشانیوں سے ماورا ہوجانے کی سچی لگن۔ جنوری ۱۸۶۱ء
تفتہ کے نام خط میں وہ ویدانتی لہجے میں لکھتے ہیں: "بہت گزر گئی ہے، تھوڑی رہی۔
، گزری ہے، اچھی گزر جائے گی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفی کے قصائد کی شہرت سے
، کے کیا ہاتھ آیا، جو میرے قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا؟ سعدی نے "بوستاں"
کیا پھل پایا، جو تم "بستان" سے پاؤ گے؟ اللہ کے سوا جو کچھ ہے موہوم و معدوم
۔ نہ سخن ہے، نہ سخن ور ہے، نہ قصیدہ ہے نہ قصد ہے۔ لاموجود الااللہ۔"

اور اس کے باوجود بہ حیثیت ایک فرد بشر غالب کا تناقض یہ تھا کہ ان کے
یت ارفع و اعلیٰ فلسفیانہ خیالات ان کے ذاتی مقاصد، مراعات اور غیر معمولی انا کے
، مطالبات کے تعلق سے پیہم انہماک کے ساتھ ہم وجود ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔
، وہ تفتہ سے کہتے ہیں کہ ان کے تمام قویٰ محض عدم کے حصول کے آرزومند ہیں تو ساتھ
ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انھیں مسلسل یہ فکر کھائے ڈالتی ہے کہ گورنر جنرل کے
ربیں انھیں مدعو کیا جائے گا یا نہیں۔ دو متضاد ذہنی کیفیتوں کی ہم وجودی ایک کو غلط یا
سری کو ریاکارانہ نہیں ثابت کرتی۔ اس کے برعکس اکٹھے وہ غالب کی شخصیت کی پیچیدگی
صلی سراغ فراہم کرتی ہیں، اس غالب کی شخصیت کا سراغ جو ایک سطح پر سب سے الگ
ب، روحانیت کا علم بردار، علائق دنیوی سے ماورا اور لاتعلق تھا تو دوسری سطح پر مال و
ع کے حصول کا آرزومند، مغرور، خود پسند اور خود غرض تھا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد غالب اور بارہ سال جیے لیکن وہ اس کے صدمہء جاں کاہ
، کبھی سنبھل نہیں پائے۔ ۱۸۵۷ء کی اس صبح کو جب باغی سپاہی اپنے گھوڑے پویہ
اتے ہوئے شہر دہلی میں داخل ہوئے تو یہ ان کے لیے ایسی حیرت انگیز بات تھی جس
۔لیے وہ بالکل تیار نہیں تھے۔ لیکن جب انگریز شہر سے نکال دیے گئے تو بہادر شاہ کے
ب درباری کی حیثیت سے آئندہ پیش آنے والے واقعات میں ان کا شمول اس سے کہیں
وہ تھا جتنا چار ماہ بعد وہ انگریزوں کو شہر پر ان کے دوبارہ قبضے کے بعد باور کرانا مناسب سمجھتے

رہے ہوں گے۔ دستنبو کی حیثیت انگریزوں کی طرف سے ممکنہ طور پر کی جانے والی انتقامی کارروائی کے خلاف بروقت پیش بندی کی تھی۔ اس کی ان کے حقیقی خیالات کے ترجمان کی حیثیت سے تعبیر نہیں کی جاسکتی۔ بغاوت کے دوران ذاتی طور پر انھیں بہت مصیبت جھیلنی اور نقصان اٹھانا پڑا۔ اس وقت تک وہ جوان نہیں رہے تھے اور ان کی صحت بھی گرتی جارہی تھی۔ لیکن یہ نتیجہ نکالنا کہ ان ہنگامہ خیز دنوں میں جب مغل بادشاہ دوبارہ لال قلعے سے حکم رانی کرنے لگے تھے تو غالب کی حیثیت محض ایک علاحدگی پسند، غیر جانب دار یا دل چسپی نہ رکھنے والے شاہدِ عینی کی تھی ان کی شخصیت اور اہم بات یہ کہ احباب کے نام ان کے خطوط کے بہ شمول دیگر شہادت، دونوں کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہوگا۔ وہ جدید مفہوم میں قوم پرست نہیں تھے لیکن چاہے وہ جتنا بھی چاہتے رہے ہوں کہ انگریز ان کے بارے میں ایسا سوچیں وہ انگریزوں کے شریکِ کار بھی نہیں تھے۔ دیسی سپاہیوں کی بعض زیادتیاں انھیں ناگوار ضرور گزریں لیکن اس داعیہ کے تعلق سے، جس کے یہ سپاہی علم بردار تھے، ان کا رویہ غیر ہم دردانہ ہرگز نہیں تھا۔ بغاوت کے بعد انگریزوں کی دہشت گردی نے انھیں جذباتی طور پر چور چور کردیا تھا۔ ایک سارا طرزِ زندگی ہمیشہ کے لیے درہم برہم ہوگیا تھا۔ ان کے متعدد عزیز ترین احباب کو یا تو سزائے موت دے دی گئی تھی یا انھیں جلاوطن کردیا گیا تھا۔ دہلی کے بہتیرے باشندوں کو روزانہ چاندنی چوک پر پھانسی دی جاتی تھی۔ ان کے بادشاہ کو دور دراز برما جلاوطن کردیا گیا تھا۔ پرانے جاگیردار طبقے کے زیادہ تر افراد سماج میں اپنے خود اعتماد اعلیٰ رتبے سے محروم اور ناداری میں کسی طرح گزارہ کرنے پر مجبور کردیے گئے تھے۔ ان کے پسندیدہ شہر کا بڑا حصہ منہدم کیا جاچکا تھا۔ خود اپنے انجام کے بارے میں مذبذب، اپنی پرانی پنشن کے بغیر وہ اس مسلسل اتھل پتھل کے افلاس زدہ، تنہا اور ساکت وصامت شاہدِ عینی تھے۔ شاید انھیں دنوں انھوں نے اپنا یہ مشہور شعر کہا ہو:

ہے موجِ زن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے، ابھی دیکھیے، کیا کیا، مرے آگے

باب : پانچ

زندگی کے آخری سال

۱۸۵۹ء میں جب دہلی بینک دوبارہ کھلا شہر اب بھی نہایت ٹوٹی پھوٹی حالت میں اور پست ہمت تھے۔ تین سال بعد فوجی جامع مسجد سے بے دخل کیے گئے اور اس میں نماز پھر سے ہانے لگی گو کہ ۱۸۵۰ء کے بعد املاک کے انقلابی تبادلے کے دوران لالہ چنّا مل کی خریدی تح پوری مسجد ۱۸۷۰ء تک اس کی ذاتی ملکیت میں رہی۔ پھول والوں کی سیر کی ۱۸۶۰ء کے دہے دید ہوئی ۱۸۶۴ء میں دہلی کالج میں پڑھائی پھر شروع ہوئی اور ۱۸۶۷ء میں دلی نہر میں پانی پھر ری ہوا۔ لیکن اس وقت جب کہ قدیم معمولات تذبذب کے ساتھ اپنا پرانا مقام دوبارہ کرنے کی کوشش میں تھے نئے طور طریقوں کی تحکمانہ ترویج سے انھیں دھکا بھی مسلسل لگتا تھا۔ پہلی ریل گاڑی ۱۸۶۷ء میں چھک چھک کرتی ہوئی شہر میں داخل ہوئی اور باشندگانِ شہر ہی کھلبلی اور ان کے بڑے اچنبھے کا باعث ہوئی۔ ریل کی پٹری بچھانے اور دو نئی سایہ دہ سڑکوں کوئنس روڈ اور ہیملٹن روڈ کی تعمیر کے کام کی وجہ سے ۱۸۶۰ء کے دہے کے اواخر

تک بھی انہدامی کارروائیاں وقفے وقفے سے جاری رہیں۔ جب کدالیں اور کلہاڑیاں تھوڑے سے وقفے کے لیے رکتیں تو شہر میں سناٹا چھاجاتا، بہ قول غالب ایسا لگتا کہ دہلی شہرِ خموشاں ہے۔ ماضی کے پاس پاس مستقبل اور نظامِ نو کی علامتیں ابھر کر سامنے آرہی تھیں۔ ریلوے اسٹیشن کے مقابل ٹاؤن ہال تعمیر ہوا اور اس میں ۱۸۶۳ء میں بلدی امور کی ذمہ دار شہر کی میونسپل کمیٹی کا افتتاح ہوا۔ فصیل بند شہر کے شمالی علاقے میں کشمیری دروازے کی طرف ایک ڈاک اور تار گھر اور ایک ڈاک بنگلہ تعمیر کیا گیا۔ چاندنی چوک میں انگریزوں کی مخصوص، پسندیدہ عمارت، گھنٹہ گھر کی تعمیر عمل آئی۔ ملکۂ وکٹوریہ کے عہد کے لیے مخصوص طرز میں بنائی ہوئی نئی عمارتیں بقیہ شہر سے بے میل اور الگ نظر آتی تھیں۔ کشمیری دروازے کے اس طرف ۱۸۵۷ء کے قبل کے عہد سے تعلق رکھنے والی ابتدائی سیول لائن کی، انگریزوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے گنجائش فراہم کرنے کی غرض سے تیز رفتاری کے ساتھ توسیع کی جارہی تھی اور فصیلِ شہر اور پہاڑی سلسلے کے درمیان کے بیش تر منظر میں نوآبادیاتی طرز کے بنگلے اور نئی سڑکیں جا بہ جا نظر آتی تھیں۔

ان تبدیلیوں کے دوران پہلے ہی سے مصیبتوں کے نرغے میں گھرے دہلی کے باشندوں پر تازہ مصیبتیں ٹوٹنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۲ء شدید قحط کے سال تھے۔ زیادہ مال دار بیوپاریوں کی طرف سے بڑے پیمانے پر ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے اناج کی قلت اور بھی شدید ہوگئی۔ عام انہدامی کارروائیوں اور بہتر فوجی حکم رانی کے لیے شہر کو زیادہ دست رس پذیر بنانے میں انگریزوں کے انہماک کے نتیجے میں بنیادی بلدی نظام اور بالخصوص کنوؤں پر توجہ نہیں دی گئی تھی جس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ پینے کا پانی آلودہ ہوگیا تھا اور شہر میں گندگی پھیل گئی تھی۔ نتیجتاً دہلی کے لیے مخصوص پھوڑے اور ناقابلِ تشخیص بخار کی عام وبا کا دور دورہ ہوگیا اور مزید خطرناک بات یہ کہ ہیضہ پھوٹ پڑا، یعنی وہ بیماری جس کا اس سے پہلے دہلی میں نام و نشان تک نہ تھا۔ غالب اس پھر سے نازل ہونے والی مصیبت کے عاجز آئے ہوئے شاہد عینی لیکن ہمیشہ کی طرح نہ تھکنے والے وقائع نگار بھی تھے۔ ۱۸۶۰ء میں وہ دہلی کو یکے بعد دیگرے غارت کرنے والے پانچ لشکروں کا ذکر کرتے ہیں۔ پہلے تو باغیوں کا لشکر تھا، پھر انگریزوں کا۔ اس کے بعد قحط، ہیضے کی وبا اور پھر آخر میں مگر موخر نہیں کسی غیر معمولی شدید بخار کی لہر جس کا زور کسی طرح ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ اشیائے مایحتاج کی شدید قلت تھی۔ باجرہ روپیہ کا سولہ سیر اور ماش کی دال روپیہ کی آٹھ

یز بک رہی تھی۔ غالب لکھتے ہیں کہ غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے۔ ۱۸۶۲ء میں حد سے زیادہ رش کی وجہ سے بڑی تباہی آئی۔ شہر کے حالات قابلِ افسوس تھے۔ ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے ھے، دوسرے عام ہنگامے کی وجہ سے اور انہدامی کارروائیوں کے اندیشے میں اپنے مکانات کی وقت مرمت پر توجہ دینے سے قاصر رہے تھے اور ایسے بھی بہتیرے تھے جو حال میں پیسے پیسے کو تاج ہو کر یہ کام کروانے کی استطاعت ہی نہیں رکھتے تھے۔ اس وقت جب کہ نئی، کشادہ اور سایہ ر سڑکیں زیرِ تعمیر تھیں اور ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے لیے مخصوص طرز کی عالی شان عمارتیں بن ہی تھیں شہر میں روزانہ سینکڑوں گھر بیٹھے جا رہے تھے۔ جولائی ۱۸۶۲ء میں وہ اپنے شاگرد اور لوہارو لے رشتے دار علاء الدین خاں علائی کے نام خط میں لکھتے ہیں: "میاں! بڑی مصیبت میں ہوں۔ ل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈہ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپھی کہتی ہیں ہائے بی، ہائے مری۔ دیوان خانے کا حال محل سرا سے بھی بدتر ہے۔۔۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے سے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔"

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

قول غالب لگاتار شدید بارش کے باعث واقع ہونے والی طغیانی کی وجہ سے ہزاروں گھر ڈہ گئے ر ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ پہلے قحط کی وجہ بارش کا فقدان تھا اور دوسرے قحط کی وجہ اس کا د سے تجاوز۔ اشیائے خوردنی کی قلت اور بیش تر لوگوں کا نادار ہو جانا نظم و ضبط کی نمایاں ابتری ا ایک سبب تھا۔ انگریزوں نے کوچہ بندی کے قدیم طریقے کو، جس کے لحاظ سے رات میں ایک لے سے دوسرے محلے تک پہنچنے کا راستہ مقفل کر دیا جاتا تھا، غیر ضروری قرار دے کر ترک کر دیا ھا۔ شہر کے دروازے بھی قدیم عمل درآمد کے برخلاف اب رات میں ہمیشہ مقفل نہیں رکھے جاتے تھے اور بہ ہر حال ریل کی پٹری کی تعمیر کی وجہ سے شہر میں رسائی اب بہت آسان ہو گئی ھی۔ قدیم چوکی داری کا طریقہ موقوف کر دیا گیا تھا اور نئی پولیس کی جمعیت تعداد کے لحاظ سے کم زور ھی تھی اور ابھی ٹھیک سے قائم بھی نہیں ہو پائی تھی۔ غالب لکھتے ہیں کہ ایک دن بھی ایسا نہیں زرتا تھا جب نقب زنی کی متعدد وارداتوں کی اطلاع نہ ملے۔ انھوں نے خود اپنے خرچے سے ایک وکی دار مقرر کیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد "از سرِ نو تعمیر" کے برطانوی تصور کے مطابق بلدی امور کے انصرام میں صحیح سماجی پس منظر کے حامل ہندستانیوں کی ذیلی شرکائے کار کی حیثیت سے شرکت کی اجازت تھی۔ بلدیہ اور جامع مسجد کمیٹی میں ہندستانیوں کو نمائندگی دی گئی تھی۔ دہلی کے روایتی طبقہء امرا کے ارکان کو بالعموم اور بالخصوص ان کو جن کا تعلق مغلیہ دربار سے رہا تھا، باہر رکھا گیا تھا۔ قدیم طبقہء امرا کے وہ افراد جنھوں نے کسی نہ کسی طرح برائے نام کچھ اپنا اثر و رسوخ بنائے رکھا تھا، غالب کے لوہارو والے رشتہ دار نواب ضیاء الدین جیسے لوگ تھے۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے دوران اپنی وفاداری کی تشفی بخش شہادت فراہم کردی تھی اس لیے ان کی شرکت وقتی مصلحت کے لحاظ سے مفید مطلب تھی۔ جامع مسجد کی انتظامی کمیٹی دس ارکان پر مشتمل تھی۔ غالب اس کی کارکردگی کا جائزہ ایک جملے میں لیتے ہیں: "مسجد جامع واگزاشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا ہے۔" (خط بہ نام مجروح، ۱۶۰/ دسمبر ۱۸۶۲ء)۔ بلدیہ میں نئے نئے بارسوخ، وفادار حکومت بیوپاری طبقے کے متمول نمائندوں کی قطعی اکثریت تھی۔ بیوپاریوں کے چار گھرانے، جنھوں نے غیر معمولی رسوخ پیدا کیا، حسبِ ذیل تھے: "سالگ رام اور گردھرلال گھرانے، دونوں جین اور چنالال، گڑوالا اور نہر والا گھرانے، جو سب کھتری تھے۔" میونسپل کمیشن نئے نئے تعمیر شدہ ٹاؤن ہال میں شائستگی کے ساتھ اپنا اجلاس منعقد کرتا۔ اس ٹاؤن ہال کے عہدِ وکٹوریہ کے طرز میں تعمیر شدہ اگلے رخ کے پرے اور راہ میں حائل گھنٹہ گھر کے پرے، اس عہد کی یاد دہانی کی حیثیت سے جو کبھی تھا اور جو اب ہمیشہ کے لیے ختم ہوچکا، خاموش اور فوجیوں کی بارکوں سے ٹھسا ٹھس بھرا لال قلعہ دکھائی دیتا تھا۔ جب رنگون میں جلاوطنی کی حالت میں بہادر شاہ ظفر کی وفات کی خبر آئی غالب ایک دوست کو طنزیہ انداز میں مطلع کرتے ہیں: "۷/ نومبر مطابق ۱۴/ جمادی الاول سالِ حال (۱۲۷۹ء ہجری/ ۱۸۶۲ء عیسوی) جمعہ کے دن ابو المظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ اور قیدِ جسم سے آزاد ہوگئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔" (خط بہ نام مجروح ۱۶۰/ دسمبر ۱۸۶۲ء)۔ لیکن اس زمانے میں لکھے ہوئے خطوط کے متفرق ٹکڑوں سے ہمیں حق تلفی کے مسلسل احساس اور دبے ہوئے جذبات کی سطح کے نیچے کی چوٹ کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔ اگر کوئی ایسا خیال ظاہر کرے کہ دہلی کے حالات پھر سے معمول پر آگئے ہوں گے تو وہ بے حد خفا ہوتے ہیں۔ ۱۸۵۸ء ہی میں ایسا سوچنے پر وہ تفتہ کو آڑے ہاتھوں لیتے

ں : " مرزا تم بڑے درد ہو ۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا ، بلکہ تم ں کو آباد جانتے ہو ۔ یہاں
بند تو یسر نہیں صحاف اور نقاش کہاں ؟ " ۱۸۶۳ء میں وہ ایک اور دوست کی خبر لیتے ہیں ۔ "
اوند ، کیا تم دلی کو آباد اور قلعے کو معمور اور سلطنت کو بہ دستور سمجھے ہوتے ہو ؟ ۔ ۔ ۔ "ایں دفتر را
خورد ، گاورا قصاب برد و قصاب در راہ مرد ۔" بادشاہ (ظفر) کے دم تک یہ باتیں تھیں ۔ "
تط بہ نام احمد حسن مودودی ، یکم ستمبر ۱۸۶۳ء) ۔

بادشاہ کی فرماں روائی اب نہیں رہی تھی ۔ دربار ہمیشہ کے لیے برخواست ہوچکا تھا ۔
م کہن کا خاتمہ ہوچکا تھا ۔ غالب کے لیے عملی سطح پر اگر کچھ برقرار تھا تو وہ تھی پہلے کی طرح اب
ں مالی امداد کی ان کی ضرورت ۔ انگریزوں کے ہاں سے ملنے والی پنشن مئی ،۱۸۵۷ء سے بند تھی ۔
ں کے فقدان میں وہ مالی سہارے کے ایک ہی چوکھٹے ،صاحبانِ تمول و اقتدار کی سرپرستی ، سے
ف تھے ، ان کے زمانے میں جس کا مطلب بیش تر شاہی سرپرستی تھی ۔ ۱۸۵۷ء کے پہلے ہی
وں نے مہاراجہ جے پور اور نواب اودھ کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کی کوشش کی تھی ۔
ب تعلق جو اب بارآور ہوا وہ تھی رام پور کے حکم راں نواب یوسف علی خاں سے ان کی راہ و
م ۔ ۱۸۵۵ء میں غالب نے ان کی خدمت میں ایک فارسی قطعہ پیش کیا تھا جس کے جواب سے وہ
وم رہے تھے ۔ تاہم ،۱۸۵۷ء میں غالب کے دوست فضلِ حق نے ، جو نواب سے قربت رکھتے تھے ،
ں کے حق میں سفارش کی ۔ فضلِ حق کے صلاح دینے پر غالب نے فوراً نواب موصوف کی شان
ں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا ۔ اس بار تخم ریزی زرخیز زمین میں ہوئی : نواب رام پور نے غالب
شاعری میں اپنا استاد مان لیا اور اصلاح کے لیے اپنے کلام کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً روپے پیسے
ں تحفے میں بھیجنے لگے ۔ جولائی ۱۸۵۹ء میں غالب کی درخواست پر انھوں نے شاعر کا باضابطہ
زانیہ سو روپے ماہانہ مقرر کردیا ۔ تعلق کی نشوونما کے لیے اسی مالی انتظام نے صحیح چوکھٹے کا کام
۔ جنوری ۱۸۶۰ء میں نواب رام پور کی بار بار کی فرمائش کی تعمیل میں تین دہوں کے تقریباً
لسل قیام کے بعد دہلی چھوڑ کر عارف کے دو بیٹوں کی معیت میں غالب نے رام پور کا سفر کیا ۔
ں کی رام پور میں اچھی پذیرائی ہوئی ، نواب صاحب نے ان کا پُرتپاک خیرمقدم کیا ، ایک
سا مکان ان کے تصرف میں دے دیا گیا اور روزانہ جائے قیام پر ان کے لیے کھانا بھجوانے کا
ظام کیا گیا ۔

غالب دو مہینے اور کچھ دن بعد دہلی کو واپس لوٹے ۔ واپسی کے فوری بعد (اپریل ۱۸۶۰ء میں) ان کی پنشن بحال ہوگئی ۔ یہ امر تقریباً یقینی ہے کہ انگریزوں کے ہاں نواب رام پور کے رسوخ سے اس فیصلے کے حصول میں مدد ملی ہوگی ۔ رام پور سے لکھے ہوئے متعدد خطوط میں غالب اس مسئلے کے تعلق سے نواب صاحب کی شمال مغربی صوبے کے لفٹننٹ گورنر سے گفتگو کے امکان کا کنایتہً ذکر کرتے ہیں ۔ غالب نے اپنی کوشش اسی تن دہی سے جاری رکھی تھی اور ایسے کچھ اشارے ملے تھے کہ انگریز نرم پڑ رہے ہیں ۔ لفٹننٹ گورنر نے "دستنبو" کے موصول ہونے کی ایک حوصلہ افزا رسید بھیجی تھی ۔ اسی لفٹننٹ گورنر کی شان میں لکھے ہوئے ایک قصیدے کی رسید ایک مراسلے کے ذریعے بھیجی گئی تھی جس میں غالب کو خان صاحب کے لقب سے مخاطب کیا گیا تھا ۔ پنجاب کے لفٹننٹ گورنر رابرٹ منٹگو مری نے بھی جس کے ہاں بہت موقع کا ایک مدحیہ قصیدہ غالب نے بھیجا تھا ، جواب میں خط لکھ کر اپنی خوش نودی کا اظہار کیا تھا ۔ جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا یہ ساری باتیں بے ارادہ نہیں تھیں ۔ پنشن مئی ، ۱۸۵۷ء سے بقائے کی ادائگی کے ساتھ بحال کردی گئی ۔ اس وقت کے معیار کے لحاظ سے یہ ایک اچھی خاصی بڑی رقم تھی ۔ لیکن ساہوکاروں کو ادائگی کے بعد اس میں سے کچھ بھی نہیں بچا ۔ غالب کی سالانہ پنشن سات سو پچاس روپے تھی ۔ تین سال کی بقایا رقم کل ملا کر دو ہزار دو سو پچاس روپے ہوئی ۔ اس میں سے ایک سو روپے اس زرِ پیشگی کی مد میں منہا کیے گئے جو چند ماہ قبل غالب کو ادا کیا گیا تھا ۔ مزید ڈیڑھ سو روپے متفرق واجبات (غالباً واجب الادا محاصل) کی مد میں منہا کیے گئے ۔ اس طرح سے دو ہزار روپے بچے ، جب کہ اس وقت غالب کے ذمے واجب الادا قرضوں کی کل رقم اس سے چھے سو روپے زیادہ ہی تھی ۔

۱۸۶۳ء میں گورنر جنرل کے دربار میں غالب کی خلعتِ فاخرہ اور اعزازی نشست بھی بہ حال ہوگئی ۔ غالباً یہاں بھی نواب رام پور ہی کا وسیلہ کام آیا تھا اور بادی النظر میں ہدایات خود گورنر جنرل لارڈ ایلِ جن کے ہاں سے موصول ہوئی تھیں ۔ یہ پیش رفت غالب کے لیے نہایت باعثِ طمانیت تھی ۔ پنشن کی بحالی انگریزوں کے لطف و کرم کی تجدید پر دال تھی اور اس سے غالب کو اپنی سدا کی ڈانواڈول مالی حالت کو سدھارنے میں مدد ملی ۔ لیکن دربار میں ان کے رتبے کی بحالی نے ایک فیصلہ کن نفسیاتی خلا کو پُر کرنے کا اہم کام انجام دیا ۔ یہ بحالی سماجی نظامِ مراتب میں ان کے مقام کو پھر سے تسلیم کیے جانے پر دلالت کرتی تھی ۔ ان کے اس مقام کو مغل دربار نے

بم کیا تھا اور اسی کی بنا پر انگریزوں کے حضور میں بھی، خصوصاً اپنی پنشن کے تعلق سے طول بل مقدمے کے دوران، انھوں نے پُر زور طریقے سے اپنے حقوق جتاتے تھے۔ اب مغلیہ دربار وجود ختم ہوچکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت چند روزہ تھی اور اس سے وابستہ امیدوں پر پانی پھر چکا ۔ نئے نظام حلِ وعقد میں قدیم طبقۂ امرا کی اکثریت کے ساتھ غالب کو نظر انداز کیا گیا تھا اور ان خود داری کو صدمہ پہنچایا گیا تھا۔ ہندستان میں مسلّمہ اقتدارِ اعلیٰ کے حامل اب انگریز تھے۔ ب انگریزوں نے وہ رسمی اعزاز، جسے بلاشک و شبہ غالب اپنا حق مانتے تھے، انھیں دوبارہ عطا نے کا فیصلہ کیا تو غالب کی طرف سے اس کی قبولیت کو نظریاتی مصالحت پر محمول نہیں کرنا ہیے، یہ تو ان کے اپنے دعوے کی صحت کا ثبوت تھا۔ اس سے نہ صرف ان کی عزتِ نفس کی الی (گوکہ بلاشک و شبہ وہ اسے محض ایک علامتی کارروائی سمجھتے تھے) بلکہ ان کے ہم سروں کی ریں بھی استحقاق کے مطابق ان کے رتبے کی بحالی میں مدد ملی۔ بعض نقاد جدید قوم پرستانہ سیاق و باق کو غالب کے زمانے پر منطبق کرنے کی غلطی کرتے ہیں تو دوسرے اپنے رتبے کو تسلیم کروانے ، ان کی مساعی کو بلالحاظ سیاق و سباق جانچنے پڑتالنے کی غلطی کرتے ہیں۔ موخر الذکر رویّے کی ثال حسبِ ذیل رائے زنی میں ملتی ہے: "غالب کی خود پسندی بعض اوقات مضحکہ خیز حد تک پہنچ اتی تھی۔ ان کے برابر شہرت اور خوبیوں کا حامل شاید ہی کوئی اور شاعر ہو ۔۔۔ جسے خطابوں، عزازات، خلعتِ فاخرہ اور درباروں میں دعوت سے ایسی بچوں کی سی خوشی حاصل ہوتی رہی ہو یا و خارجی دنیا سے اپنے روابط پر اتنا اتراتا رہا ہو۔" اس سے انکار نہیں کہ غالب خطابوں اور خلعتِ فاخرہ سے مسرور ہوتے تھے۔ لیکن وہ خطاب و خلعت کی مرحمت پر اپنی مسرت کو حق بہ جانب سمجھتے تھے اور آنے والی پیڑھیوں سے یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ وہ ان کے بارے میں آدابِ معاشرت کے کسی فوق انسانی ضابطے کی رو سے رائے قائم کریں گی۔ ان معاملات کے تعلق سے ان لی مساعی محض اس بچے کی سی نہیں تھیں جو بے حقیقت کھلونوں کی نظر فریب خوش نمائی سے دھوکا کھاجاتا ہے، بلکہ اُن کی حیثیت اِس آدمی کی محکم گیری کی سی ہے جو ایک فردِ بشر ہے اور جو اپنے زمانے کے سیاق و سباق میں بالکل بجاطور پر اپنے رتبے کو اس لائق سمجھتا ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے اور اس کی نفی کی صورت میں اس کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں بچتا جس سے وہ چپکا رہے، نہ ہی انگریزوں کی طرف سے اس کے رتبے کو تسلیم کرلیے جانے پر وہ راتوں رات انگریزوں کی للّو پتّو

کرنے والے کاسہ لیس میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ دہلی میں جو کچھ وقوع پذیر ہورہا تھا اس کے بارے میں ان کے ذاتی خیالات میں اور ان کی اس زمانے کی حسرت آمیز یاد میں جب بادشاہ کی حکم رانی تھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اعزاز کی بحالی انگریزوں سے ان کی غیر متزلزل وفاداری کے ثبوت سے زیادہ ان کی گذشتہ بےوفائی کی انگریزوں کی طرف سے بادلِ ناخواستہ اور تاخیر سے دی جانے والی معافی کی حیثیت رکھتی تھی۔ غالب ایک دفعہ گزرے ہوئے واقعے کا ذکر کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے کچھ ہی دنوں کے بعد لارڈ کیننگ کی خدمت میں انھوں نے جو قصیدہ بھیجا تھا وہ اس جواب کے ساتھ واپس کردیا گیا تھا تم غدر کے دنوں میں بادشاہ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔ لیکن مستقل مزاجی کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا: کچھ عرصے کے بعد بھیجے ہوئے ایک اور قصیدے کی رسید حسبِ معمول قدیم گورنمنٹ کے چیف سکریٹری نے اپنے خط کے ذریعے ان کے پاس بھیجی۔ اپنے رتبے کو انگریزوں سے تسلیم کروانے کا مطمحِ نظر غالب کے خیال میں مقصود بالذات تھا۔ اس کے ذرائعِ حصول کے تعلق سے انھیں کبھی کوئی خوش فہمی نہیں رہی۔ جولائی ۱۸۶۰ء میں مخصوص صاف دلی کے ساتھ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: "گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔" (خط بہ نام علائی)۔

رام پور کے نواب یوسف علی خاں نے ۱۸۶۵ء میں راج پھوڑے کے عارضے میں انتقال کیا۔ ۱۸۵۹ء سے لے کر ۱۸۶۵ء کے عرصے میں رام پور میں مقیم نہ ہوتے ہوئے بھی فی الواقع وہ نواب موصوف کے درباری شاعر کے فرائض انجام دیتے تھے۔ نواب اپنا کلام پابندی سے ان کے ہاں بہ غرض اصلاح بھیجتے اور غالب اس پر مستعدی سے اپنی توجہ مبذول کرتے۔ ایک اعتبار سے شاہی سرپرست اور درباری شاعر کے جانے بوجھے چوکھٹے کو برقرار رکھتے ہوئے دربارِ رام پور نے دربارِ دہلی کی جگہ لے لی تھی۔ سو روپے جو نواب ماہ بہ ماہ بھیجتے غالب کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ انگریزوں کی طرف سے ملنے والی باسٹھ روپے آٹھ آنے ماہانہ کی پنشن ان کے طرزِ زندگی کے لیے کبھی بھی کافی نہیں رہی۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی انھوں نے دوسرے ذرائعِ آمدنی سے اس میں اضافے کی کوشش کی تھی۔ قیمتوں میں ہر طرف اضافے کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی پنشن بری طرح سے ناکافی ہوگئی تھی۔ باقر علی اور حسین علی، دونوں لڑکے، سنِ بلوغ کو پہنچ چکے تھے۔ باقر علی کی فی الحقیقت شادی بھی ہوچکی تھی اور گو کہ بعد میں انھیں الور میں منفعت بخش نوکری مل

ابتداء ان کی اور ان کے گھر والوں کی کفالت غالب کو کرنی پڑتی تھی ۔ رام پور سے ملنے والا
بھی درحقیقت ان کے اخراجات کی پابہ جائی کے لیے کافی نہیں تھا ۔ (جیسا کہ غالب شکایت
، ہیں طرح طرح کے اخراجات تھے جن کو پورا کرنا ضروری تھا : انکم ٹیکس ، چوکی دار کی تنخواہ ،
ن کا مشاہرہ ، اصل کی ادائگی اور پھر سود کی ادائگی) ۔

ان حالات میں انھیں رام پور پر اپنے کلّی مالی انحصار کا بہ خوبی احساس تھا ۔ اس زمانے
یک خط میں وہ عالمِ ناداری میں آزادانہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے کی خواہش کا اظہار
، ہیں ، لیکن یہ محض ان کی خوش فہمی تھی ۔ عملاً وہ اپنے اخراجات کم کرنے سے قاصر تھے اور
ندگی کے اس آخری مرحلے میں اپنے طرزِ زندگی کو بدلنے کے لیے تیار نہیں تھے ۔ وہ لکھتے ہیں :
مرنے سے نہیں ڈرتا ۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں ۔" (خط بہ نام علائی ۰) انصاف کی
یہ ہے کہ ایک دفعہ ۱۸۶۲ء میں جب حالات بہت ہی زیادہ تکلیف دہ ہوگئے انھوں نے اپنی
ں بدلنے کی کوشش ضرور کی ۔ انھوں نے اپنی صبح کی شراب نوشی ترک کردی ، گوشت کی
ب آدھی کردی اور اپنی قوتِ ارادی کا حیرت انگیز مظاہرہ کرتے ہوئے عمر بھر کا اپنا بلا ناغہ
ت کا شراب و گلاب کا راتب بھی موقوف کردیا ۔ ان کے اس مظاہرے سے ان سے
ان کے دوست احباب کو حیرت ہوئی ۔ تاہم ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ
قرری کے اور روپیہ آگیا ۔ قرض کی نہایت ضروری قسطیں کسی نہ کسی طرح ادا کردی گئیں ،
ت کے احساس کے ساتھ پرانا معمول پھر شروع کردیا گیا اور زندگی پھر ہمیشہ کی طرح بسر
ے لگی ۔

اس امر کی شہادت ہے کہ غالب کی اپنے مقررہ وظیفے کے علاوہ مالی امداد کی بار بار کی
استوں پر نواب یوسف علی خاں کا ردِّ عمل کافی ہم دردانہ ہوا کرتا تھا ۔ ایسا لگتا ہے کہ دونوں
، دوسرے کے لیے حقیقی احترام کا جذبہ رکھتے تھے ۔ لیکن ، بہادر شاہ ظفر سے تعلق کی طرح نواب
وف سے غالب کا تعلق بھی کبھی کبھی غیر اطمینان بخش ہو ہی جاتا تھا ۔ محسن و احسان مند
اس رابطے میں غالب خود کو شریکِ کم زور ماننے کے لیے تیار تھے لیکن ان کی زودرنج انا اور
یت کا ادعا اس کم زوری کو قابلِ نفرت یا بے زبان کاسہ لیسی سے تعبیر کیے جانے پر جزبز ہوتا
موقع پر وہ ناپ تول کر ٹھیک اس درجے کے لاابالی پن اور بے باکی کا مظاہرہ کرسکتے تھے جو ان

کے رول کی ملتجی سے تقریباً ہم سر میں تقلیب کرسکے۔ ۱۸۶۱ء میں نواب موصوف اپنے منجھلے بیٹے کی شادی کا جشن بڑے تزک و احتشام سے منارہے تھے۔ غالب شریک نہ ہوسکے۔ لیکن معمول کے مطابق ایسے موقعوں پر تقسیم کی جانے والی خلعتِ فاخرہ، اشیائے خوردنی کے خوان اور تحائف کی بہ جائے انھیں ایک سو پچیس روپے ملے۔ غالب نے جواب میں نواب صاحب کو شکریے کا خط لکھا۔ انھوں نے لکھا کہ یہ رقم ضیافت اور خلعت کے عوض میں انھیں دی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مذاق میں پوچھا کہ چوں کہ میں بھوکوں مر رہا ہوں، اگر یہ سارے روپے اپنی خوراک پر خرچ کردوں تو کیا اس پر بھی خلعت کی رقم نواب صاحب پر واجب الادا رہے گی؟ غالب جانتے تھے کہ ان کا مالی انحصار ایسا ہے کہ وہ اپنے محسن کو ناراض و برگشتہ کرنے کے موقف میں بالکل نہیں تھے، لیکن سبکی کے ہر شائبے کے تعلق سے ان کی زود حسی ان کے لیے اس ادراک سے پوری طرح مطابقت میں عمل پیرا ہونا ہمیشہ مشکل بنادیتی تھی۔ ۱۸۶۱ء میں ان کے تعلقات میں تناؤ اس وقت نمایاں ہوا جب ملازمت کی ان دو سفارشوں کو نواب صاحب نے نظر انداز کردیا جو غالب نے ان کے دربار میں بھیجی تھیں۔ غالب نے ایک وضاحتی مکتوب کے ذریعے غلط فہمی کو کسی طرح دور کیا تاہم اپنی یہ رائے وثوق کے ساتھ دہرائی کہ دونوں ہی اشخاص جن کی انھوں نے سفارش کی تھی لائق اور ہوش مند ہیں۔ اسی زمانے میں ایک دوست کے نام لکھے ہوئے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب کے طریقِ عمل سے ان کو واقعی صدمہ پہنچا تھا۔ ان واقعات سے قطعِ نظر کریں تو ماننا پڑتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں غالب کے سنِ وسال اور بہ حیثیت شاعر ان کی شہرت کا کما حقہٗ احترام مدِ نظر رکھتے تھے اور خود غالب اس کے لیے ان کی عزت کرتے تھے۔

ان کے انتقال کے بعد کلب علی خاں یوسف علی خاں کے جانشین ہوئے۔ ان کی مسند نشینی کے موقع پر غالب نے رام پور کا پھر ایک بار سفر کیا۔ نواب کی طرف سے دعوت کے علاوہ اس تقریب میں ان کی شرکت کی دو اور وجوہ تحریک بھی تھیں۔ اولاً وہ اس بات کو پکا کرلینے کے سخت آرزو مند تھے کہ نئے نواب ماہانہ سو روپے بھیجنے کا اپنے باپ کا معمول جاری رکھیں۔ ثانیاً وہ پُر امید تھے کہ مسند نشینی کے موقع پر نواب دستور کے مطابق انھیں مناسب تحفے سے نوازیں گے۔ کلبِ علی خاں نے غالب کے ساتھ اگر خصوصی گرم جوشی کا نہیں تو عزت و احترام کا سلوک ضرور کیا۔ ماہانہ وظیفے کا معمول بھی انھوں نے جاری رکھا۔ وقتِ رخصت انھوں نے غالب

ملی الحساب ایک ہزار دو سو روپے کی رقم مرحمت فرمائی ۔ رقم اچھی خاصی تھی لیکن غالب کو کسی مایوسی ہوئی ۔ بہ ظاہر نواب صاحب نے ان لوگوں کو انعام و اکرام میں زیادہ بڑی رقم عطا کی تھی غالب کے خیال میں ان کے جود و کرم کے نسبتاً کم حق دار تھے ۔ نواب صاحب نے بڑی حد ے مقررہ وظیفے کے علاوہ رقوم کے عطیے کی غالب کی درخواست کو ماننے کا دستور بھی موقوف کردیا ۔ سف علی خاں مرحوم اور غالب کے مابین ہم عصری اور ادبی مطابقت زیادہ تھی جب کہ کلب علی ں شاعری کم ہی کرتے تھے اور بیش تر غالب سے اپنی فارسی نثر کے بارے میں صلاح مشورہ تے تھے ۔ رام پور پر غالب کا مالی انحصار اب کچھ بڑھ ہی گیا تھا ۔ وہ اس امر سے بھی پوری طرح قف تھے کہ وہ نئے نواب سے ان کے باپ کی سی داد و دہش کی توقع نہیں رکھ سکتے ۔ لیکن عادت لے مطابق ، اپنی مالی مجبوری کے باوجود ، وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کے رجحانِ ج کو دبا نہیں پاتے تھے ۔ تعلقات میں خاصی کشیدگی اس وقت پیدا ہوئی جب غالب نے ایسی رسی بندشوں کے بارے میں نواب کے خیالات کو ، جو فارسی میں لکھنے والے ہندوستانی ادیبوں کے ہاں تو مستعمل ہیں لیکن جنھیں ایران کے مستند ادیبوں نے نامقبول قرار دیا ہے ، کسی قدر کھڑپن سے مسترد کردیا ۔ نواب موصوف روایات پرست تھے اور غالب اس حقیقت سے ضرور اقف رہے ہوں گے ۔ نواب بہت ناراض ہوئے اور وظیفے کی موقوفی کے خدشے سے غالب معافی کے خواست گار ہوئے ۔ مناقشہ ختم ہوا ، لیکن یہ امر واقعہ کہ دربارِ رام پور کی سرپرستی کی موجودہ نتہائی غیر یقینی صورتِ حال سے بہ خوبی واقف ہوتے ہوئے بھی غالب نواب سے اختلاف کی جسارت کرنے کے لیے تیار تھے ان میں عملیت کے فقدان کا بھی ثبوت ہے اور ان کی ذہنی جراءت کا بھی ۔ گو کہ ان کی دست نگری کی وہ حالت جس سے مخلصی ناممکن تھی اس طرح کی صورتِ حال میں انھیں بالآخر سر جھکانے پر مجبور کردیتی تھی وہ ایسا خیال کرنا پسند کرتے تھے کہ جب کبھی ممکن ہوا انھوں نے اپنی ذہنی آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ۔ ادبی امور میں وہ ذہنی مصالحت کو بالخصوص ناقابلِ قبول سمجھتے تھے ۔ ۱۸۶۶ء میں اپنے ایک دوست کے نام خط میں تھوڑی سی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ خوشامد کبھی میری عادت نہیں رہی ، لیکن آگے جب وہ لکھتے ہیں کہ جہاں تک امور شاعری کا تعلق ہے انھوں نے نہایت دیانت داری کے ساتھ اس سے احتراز کیا ہے تو یہاں وہ بالکل حق بہ جانب ہیں ۔

غالب رام پور میں تین ماہ سے کم عرصے مقیم رہے اور دسمبر ۱۸۶۵ء میں دہلی واپس لوٹے۔ ۱۸۶۰ء میں بھی جب وہ پہلی بار وہاں گئے تھے وہ وہاں زیادہ دن نہیں ٹھیرے تھے۔ اس وقت ان کے وہاں قیام کا ایک واضح محرک بھی تھا کیوں کہ سابق نواب نے ان کے رام پور میں مستقل قیام کی صورت میں وظیفے کو دگنا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ جب غالب اس بار واپس لوٹے تو قیاس آرائیاں تھیں کہ یا تو نواب نے انھیں برخاست کردیا ہے یا پھر انگریزوں نے مداخلت کرکے نواب کو اس تعلق کو ختم کرنے پر مجبور کیا ہے۔ لیکن غالب اس کی وجہ باقر اور حسین، دونوں لڑکوں کی یادِ وطن میں افسردگی بتاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود دہلی کی جدائی میں بے چین تھے۔ دہلی بھلے ہی ایک "کیمپ" میں تبدیل ہوگیا رہا ہو لیکن پھر بھی وہ ایک جانا بوجھا شہر تھا جس سے وہ مانوس تھے۔ انھوں نے ساری عمر اس کے گلی کوچوں میں گزاری تھی۔ شہر دہلی ایک طرزِ زندگی کی علامت تھا، اس واحد طرزِ زندگی کی جس سے وہ واقف تھے۔ ایک دوست سے جن کا خیال تھا کہ انھوں نے دلی چھوڑدی ہے وہ حیرت زدہ ہوکر پوچھتے ہیں: "یہ کسی نے خلاف واقع آپ سے کہا ہے۔ میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزمِ خوں کا شناور رہا ہوں۔" (خط بہ نام عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)۔ اب اس عمر میں دلی چھوڑ کر کہیں اور گھر بسانا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ شاید ان میں اتنی قوت بھی نہیں رہی تھی کہ ایک فعال اور حاضر باش درباری شاعر کی ذمہ داریاں پوری کرتے رہیں۔ قیامِ دہلی کا یہ فائدہ تھا کہ اپنے وظیفے یا دربار رام پور میں رسائی کے حق سے دست بردار ہوئے بغیر وہ جانے بوجھے ماحول میں بہ دستور اپنی وضع کی زندگی گزارنے کے لیے آزاد تھے۔ روپے پیسوں کے لحاظ سے یہ گھاٹے کا سودا تھا لیکن ان کے نقطۂ نظر سے دوسرا کوئی فیصلہ ممکن نہ تھا۔ سوال ان کی بیوی کا بھی تھا۔ وہ رام پور کے سفر میں ان کے ساتھ نہیں گئی تھیں اور غالباً ان کا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ رام پور سے غالب کے خطوط اپنی بیوی سے ان کے تعلقِ خاطر پر بڑی پسندیدہ روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ دونوں لڑکے پابندی کے ساتھ اپنی دادی بی بی کو خط لکھا کریں اور چوں کہ وہ پڑھ نہیں سکتی تھیں غالب نے یہ انتظام کیا کہ اعزا ان کو خطوط پڑھ کر سنا دیا کریں۔ انھوں نے بڑے جتن سے یہ انتظام بھی کیا کہ ان کے غیاب میں خانہ داری کے لیے بیوی کے پاس روپیہ پیسوں کی کمی نہ ہو اور ملازمین کو تنخواہ بروقت ملتی رہے۔

اس میں شک نہیں کہ ادبی مشاغل کے میدان کی حیثیت سے، جس میں اپنی کبرسنی کے

ر وہ بہ دستور کافی سرگرم تھے ۔رام پور غالب کے لیے دہلی کا مرجّح بدل ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔
میں ان کے اردو کلام کا ایک نیا نسخہ چھپا ۔ ۱۸۶۲ ء میں ان کے فارسی کلیاتِ نظم کا ایک
ن شائع ہوا ۔ اسی سال فارسی لغت "برہانِ قاطع" پر ان کی تنقید پر مشتمل ان کی نثری کاوش
برہان" منظرِ عام پر آئی ۔ ۱۸۶۳ ء میں ان کے احباب نے بالآخر انھیں ان کے مجموعہء خطوط
شاعت پر آمادہ کرلیا : ایک مجموعہ " عودِ ہندی " کے نام سے ۱۹۶۸ ء میں شائع ہوا اور
" اردوئے معلیٰ " کے نام سے ان کی وفات کے بعد ۔ بلاشبہہ ان کے ہاں بہ غرضِ اصلاح نہ
ے دہلی بلکہ باہر سے بھی نظم و نثر کی بہ دستور بھرمار رہتی تھی ۔ یہ رشحاتِ قلم بریلی، لکھنو، کلکتہ
ں اور سورت جیسے دور دراز مقامات سے موصول ہوتے تھے اور حتیٰ الامکان اپنے معمول کے
ں وہ ان میں سے ہر ایک پر شخصی توجہ دیتے تھے ۔

اس کے باوجود گرتی ہوئی صحت نے غالب کو سنجیدہ نظم نگاری کی مشقت کو کم و بیش
کردینے پر مجبور کردیا تھا ۔ غالباً انھوں نے اپنی آخری فارسی غزل ۱۸۶۵ ء میں اور آخری اردو
۱۸۶۶ ء میں لکھی :

سخن میں خامہء غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

ا ء میں وہ دہلی کے لیے مخصوص پھوڑے سے بری طرح متاثر ہوئے ۔ ان کے دونوں ہاتھوں اور
ں ٹانگ پر دنبل نمودار ہوئے اور جلد ہی زخم بن گئے ۔ جب روایتی علاج معالجے سے فائدہ نہیں
لبِ مغرب کے تربیت یافتہ ایک ہندستانی سرجن کو پھوڑوں کے اطراف فاسد گوشت گرم
ے سے جلانے اور کاٹ کر نکالنے کے لیے طلب کیا گیا ۔ کچھ افاقہ ہوا لیکن پھر ان کے پاؤں پر
ورم آگیا ۔ وہ جوتا نہیں پہن سکتے تھے اور انھیں چلنے میں بے حد دقت ہوتی تھی ۔ مضر اشیا کی
ئی ہوئی اس بیماری میں وہ کم و بیش ایک سال تک مبتلا رہے ۔ ۱۸۶۴ ء میں زیادہ تر انھیں
نل درد رہا ، جس کی وجہ سے رات کو وہ سو نہیں پاتے تھے ، جب کہ ان کے سارے بدن پر مرہم
تا اور پٹیاں بندھی رہتیں ۔ ختم سال تک افاقے کے آثار دکھائی دیے لیکن کمزوری اتنی تھی
جیسا کہ وہ لکھتے ہیں ، اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں کہ جتنی دیر میں ایک قدِّ آدم دیوار اٹھے ۔
غالب نے جو مثال دی ہے اس میں حقیقت کی رمق بھی ضرور ہے ۔ اب وہ صرف لاٹھی

کے سہارے ہی چل پاتے تھے ۔ ان کی قوت سامعہ جو ادھر کئی برسوں سے ناقص تھی ، تیزی سے جواب دے رہی تھی ۔ ان کی بینائی رفتہ رفتہ کم زور ہوتی جارہی تھی اور حافظہ بھی ان کے لیے ایک مسئلہ بن گیا تھا ۔ وہ اکثر بہ غرضِ اصلاح ان کے ہاں بھیجے گئے نظم یا نثر کے اوراق بے جگہ رکھ دیتے یا انھیں غلط پتے پر سپردِ ڈاک کردیتے ۔ اس سے ہمیشہ ان کا دل دکھتا لیکن وہ لوگوں کو اپنے روبہ تنزلِ قویٰ دماغی کے بارے میں مطلع کرنے کی حتیٰ المقدور کوشش کرتے ۔ ۱۸۶۴ء میں یک گونہ جھلاہٹ کے ساتھ وہ ایک دوست کے نام خط میں لکھتے ہیں : " جنابِ عالی ! وہ غزل جو کہار لایا تھا وہاں پہنچی ، جہاں اب میں جانے والا ہوں ۔ یعنی عدم ، مدعا یہ کہ گُم ہوگئی ۔ " (خط بہ نام قاضی عبدالجلیل جنون بریلوی ، جون ۱۸۶۴ء) ۔ جب لوگ اپنے رشحاتِ قلم کے بارے میں بار بار دریافت کرتے تو وہ برہم ہوجاتے لیکن ظاہر ہے کہ یہ برہمی ان کی یاد دہانیوں سے زیادہ اپنی معذوری و بے بسی پر ہوتی ۔ وہ اپنے شاگرد لوہارو والے علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں : " مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا ۔ مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کہ کون سی رباعیاں مانگتے ہو ۔ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج ، قصیدہ بھیج معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے ۔ اب کے تو مقرر بھیجے گا ۔ بھائی قرآن کی قسم ، انجیل کی قسم ، توریت کی قسم ، زبور کی قسم ، ہنود کے چار بید کی قسم ، دساتیر کی قسم ، ژند کی قسم ، پاژند کی قسم ، اوستا کی قسم ، گرو کے گرنتھ کی قسم ، نہ میرے پاس وہ قصیدہ ، نہ مجھے وہ رباعیاں یاد ۔ ۔ ۔ " اب وہ دن کا بیش تر وقت گھر کے مردانے میں اپنے کمرے میں گوشہ نشینی کی حالت میں گزارتے ۔ وہ لیٹے رہنے ہی کو ترجیح دیتے ۔ اسی وقت اٹھتے جب ملاقاتیوں کے آنے پر اٹھنا ناگزیر ہوجاتا ۔ وہ مرنے سے نہیں ڈرتے تھے :

موت کا ایک دن معین ہے

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

علم نجوم کی رو سے حساب لگا کر انھوں نے یہ ادعا کیا تھا کہ ان کی موت ۱۸۶۱ء میں واقع ہونے والی ہے ۔ یہ ہیضے کی وبائے عام کا سال تھا ۔ جب ۱۸۶۱ء کا سال آیا اور گزر گیا تو اسے انھوں نے یہ کہہ کر ہنسی میں ٹالا کہ اس وقت مرنے میں جب کہ وبائے عام میں سبھی مر رہے تھے ، میری کسرِ شان تھی ! ۔

بیماری سے وہ اتنا نہیں ڈرتے تھے جتنا اس فقدانِ آسائش سے جو وہ اپنے ساتھ لاتی تھی

وہ اپنے سارے جسم پر نکلے ہوئے پھوڑوں اور ورم کی وجہ سے فریش تھے تو ایک شدید کے دور سے گزرے ۔ ساتھ ہی ساتھ ان گزرے ہوئے دنوں کا غم اور حسرت آمیز یاد بھی ، وہ جوان تھے اور ان دل بہلاووں سے لطف اندوز ہونے کے زیادہ اہل تھے جو زندگی انھیں ن تھی ۔ ان کے متعدد اشعار موثر طور پر اسی ذہنی کیفیت کا احاطہ کرتے ہیں :

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
وہ بادہء شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
مارا زمانہ نے اسداللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں ، وہ جوانی کدھر گئی

ے باوجود جب درد سے افاقہ ہوتا یا جب معذور نہ ہوتے تو ان کی دبائے نہ دبنے والی شگفتہ کے وقفے اور شاعر کا ایک ایک لمحے کو غنیمت جان کر اسے جینے ، اسے صیقل کرنے ، اسے نے اور مکمل تجربے کی شفاف وضاحت کے ساتھ ان کی الفاظ میں تصویر کھینچنے کا ذوق پھر سے آتا ۔ اگست ۱۸۶۲ء میں وہ لکھتے ہیں : "مینہ کھل گیا ہے ۔۔۔ کھلا ہوا کوٹھا ۔ چاندنی رات ، رد ، تمام رات فلک پر مریخ پیشِ نظر ۔ دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر ۔ ادھر چاند مغرب وبا ، ادھر مشرق سے زہرہ نکلی ۔ صبوحی کا وہ لطف ، روشنی کا وہ عالم ۔" (خط بہ نام علاء الدین علائی ۱۶ / اگست ۱۸۶۲ء)

وہ اب خود کو اپنے حجرے میں معتکف فقیر یا درویش سمجھنا پسند کرتے ہیں جو واقعات کا تو ضرور تھا لیکن ان میں شریک کم ہی ہوتا تھا ۔ چنوتیاں کم تھیں لیکن ایک اعتبار سے ساحل پہ ے طوفاں کا نظارہ کرنے کے اپنے فائدے بھی تھے :

نے تیر کماں میں ہے ، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

وہ جانتے تھے کہ ان کے قوائے جسمانی اب ایسے نہیں تھے کہ وہ میدانِ عمل میں فعال کردار ادا کرسکیں اور اس لیے اب پیچ و تاب کھانا اور جدوجہد کرنا بھی کم ہوگیا تھا ، حبِّ جاہ اور عناد بھی کم تھا اور صلح صفائی کی طرف رجحان زیادہ ہوگیا تھا :

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے ؟

اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے وہ نہ صرف روزمرہ کے واقعات ، اپنے مسائل اور اپنی صحت کے ذکر بلکہ زندگی اور موت ، بنی نوعِ انسان کی فتح مندیوں اور اخلاقی کمزوریوں کے بارے میں مفصل گفتگو پر مشتمل بے شمار خطوط لکھتے ۔ اپنے سے چھوٹے رشتہ داروں اور دوستوں کے نام خطوط میں وہ انھیں مشورے دیتے اور اپنی پیڑھی کے بہ قیدِ حیات معاصرین اور احباب سے مراسلت میں ان کا رویّہ پر استغراق اور مشاہدہء نفس کا ہوتا :

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

اب ان کے لیے باعثِ تقویت ان کی پہلے کی طرح مذہبی ظاہر پرستی کی آلودگی سے پاک گہری روحانیت تھی ۔ ۱۸۶۲ء میں وہ بڑے یقین کے ساتھ تصریح کرتے ہیں : "یہاں لاموجود الا اللہ کے بادہء ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں ۔ (خط بہ نام علائی ، ۷ / مارچ ۱۸۶۲ء) ۔ ان کی سرشت کے کئی امتیازی اوصاف جن کا ان کی معرکہ آرائیوں سے پر زندگی کی سرگرمیوں اور مشاغل کی وجہ سے اظہار نہیں ہوپایا تھا اب یقینِ کلی کے ساتھ جامہء الفاظ میں ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ ۱۸۶۵ء میں وہ رقتِ قلب کے ساتھ لکھتے ہیں کہ میری دلی خواہش ہے کہ " اگر تمام عالم میں نہ ہوسکے نہ سہی ، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے ۔" (خط بہ نام علائی ۳۰ / فروری ۱۸۶۵ء) ۔ گذشتہ زندگی میں بھی انھوں نے اپنے دوستوں اور شناساؤں کی حتیٰ الامکان مدد کی کوشش کی تھی ، لیکن اب جب کہ وہ اس سلسلے میں زیادہ کچھ کرنے کے موقف میں نہیں تھے ، ان کی سفارشوں میں شدید جذبہ اور زورِ احساس ہوتا تھا اور یہ انسان دوستی پر مبنی سچے تعلقِ خاطر سے مملو ہوتی تھیں ۔ پنڈت جے نرائن ایک نوجوان تھے جن کے باپ دادا لوہارو خانوادے کے ملازم رہ چکے تھے ۔ ۱۸۶۵ء میں وہ پٹیالہ میں حصولِ ملازمت کے لیے غالب

، طالب ہوئے ۔ غالب نے فوراً پٹیالہ میں حکیم غلام مرتضیٰ خاں کو لکھا : "خوب یاد کیجیے
کبھی کسی امر میں آپ کو تکلیف نہیں دی ۔ اب ایک طرح کی عنایت کا سائل ہوں ۔
توب پنڈت جے نرائن میرا یہ خط لے کر حاضر ہوتے ہیں ۔۔۔ آپ کو میرے سر کی قسم
ہوسکے سعی کر کے ان کو موافق ان کی عزت کے کوئی عہدہ دلوادو گے تو میں یہ جانوں گا کہ
نوکر رکھوادیا ہے ۔۔ بڑا احسان مند رہوں گا ۔۔۔۔ " (خط بہ نام حکیم غلام مرتضیٰ خاں ،
۱۸۶۰ء) ۔

جب وہ کبر سنی کو نہیں پہنچے تھے تب بھی اپنے آپ پر ترس کھانے سے انھیں کبھی کوئی
از نہیں تھا ۔ اب ان کے پاس ایسا کرنے کے لیے وقت بھی زیادہ تھا اور وجوہ بھی ۔ وہ
اکثر خود کو مردودِ خلائق اور بستلائے عذابِ الٰہی بتاتے ہیں اور اپنے عوارض اور اپنی
اری کا ذکر کرتے ہیں ۔ یہ ان کی حسِّ مزاح تھی اور چونچال رواقیت یعنی ضبطِ جذبات اور
لم کے احساس سے ماورائیت ، جس نے ہمیشہ انھیں خود رحمی کا شکار بننے سے بچائے رکھا
سردگی کے ان دوروں سے ہمیشہ نجات حاصل کرلیتے ۔ اس بات پر پھر سے زور دینے کے
گی اپنے سارے دکھ درد اور رنج و غم کے باوجود اس لائق ہے کہ اسے بسر کیا جائے اور اس
اندوز ہوا جائے ۔ لیکن ایک امر ایسا تھا جس پر ان کی آزردگی نہ کم ہوئی اور نہ دور ہوئی :
ثق کہ ان کے جیتے جی ان کی شاعری کی مادی لحاظ سے بھی اور ذہنی سطح پر بھی وہ قدرشناسی
ں جس کی وہ مستحق ہے ۔ جیسا کہ وہ اپنے فارسی شعر میں لکھتے ہیں :

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

(میرے ستارے کو اوجِ قبولیت عدم میں حاصل ہوگا ۔
اس دنیا میں میرے اشعار کو شہرت میرے بعد نصیب ہوگی) ۔

مدگی کے آخری سالوں میں ان کی اس جاں کاہ آزردگی میں اضافہ ہی ہوا اور وہ اپنے متعدد
ں اسں کا ذکر کرتے ہیں ۔ ۱۸۶۴ء میں بہ ظاہر نہایت افسردگی کی حالت میں لکھے ہوئے
ا میں وہ اپنی زندگی کی ادبی تخلیقات کا خلاصہ بیان کرتے ہیں : ایک اردو دیوان ، ایک
ارسی ، تین کتابچے ، سب کے سب انعام و اکرام سے محروم اور ناقدری کا شکار ۔ ۱۸۶۵ء میں وہ

پھر لکھتے ہیں : " میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازہ ء بایست نہیں پائی ۔ آپ ہی کہا ، آپ ہی سمجھا ۔" (خط بہ نام علائی ۱۳ / فروری ۱۸۶۵ء) ۔ ایسا نہیں ہے کہ غالب اس قبولیتِ عامہ اور شہرت سے جو انھیں مل ناواقف رہے ہوں ۔ یہ ان کی شخصیت کی امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی کام یابی کو ان تخلیقات کے مقابلے میں ہیچ گردانتے تھے جو اپنے خیال میں وہ قاری کے سامنے پیش کرنے کے اہل تھے ۔ ان کا معاملہ اس اوسط درجے کی جھنجلاتی ہوئی انا کا نہیں تھا جو دائماً غیر مطمئن رہتی ہے ۔ بلکہ یہ معاملہ تھا ایک اصل سے بڑی ، اعلیٰ و ارفع انا کا جو اپنی کام یابی کا اندازہ خود اپنے معیار کی رو سے کرتی ہے ۔ ان کی آزردگی مسابقت کو نہ برداشت کرنے والے یا اپنی شامِ زندگی میں دوسروں کی کام یابی پر رشک کرنے والے شخص کی آزردگی نہیں تھی ۔ ان کی آزردگی اس شخص کی تھی جس کو اپنے کمال و افضلیت کے بارے میں کبھی کوئی شبہہ نہیں تھا اور جو واقعی ایسا سمجھتا تھا کہ اس کے زمانے میں اس کی شعری تخلیقات کی قدرشناسی کے لیے درکار ادبی بصیرت رکھنے والے یا ان کا کما حقہ صلہ دینے کے لیے مادی وسائل رکھنے والے افراد شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں ۔ جیسا کہ وہ اپنے فارسی دیوان میں لکھتے ہیں :

غالب سخن از ہند بروں بر کہ کس ایں جا
سنگ از گہر و شعبدہ ز اعجاز نہ دانست

(غالب اپنے کلام کو ہندستان کے باہر لے جاؤ چوں کہ یہاں کوئی بھی
سنگ و گہر میں اور شعبدہ و اعجاز میں تمیز نہیں کرتا ، ان کا فرق نہیں پہچانتا)

ان کی شعری سرگرمیوں کے آغاز میں ان کے کلام کو حد سے زیادہ مبہم ہونے کی بنا پر متعدد اربابِ علم کی طرف سے تمسخر آمیز عدم قبولیت کا سامنا کرنا پڑا تھا ۔ تب انھوں نے اپنے اسلوبِ بیان کو اس کی تبدیلی کی ضرورت کے واقعی قائل ہونے کی وجہ سے اتنا نہیں جتنا اپنے نکتہ چینوں کی فہم و ادراک کا لحاظ کرتے ہوئے ، تبدیل کردیا تھا ۔ بعد میں انھیں مغل دربار تک رسائی میں دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا ، جہاں کے ، بہادر شاہ ظفر کی صدارت میں منعقد ہونے والے مشاعرے ہر آرزو مند شاعر کے لیے انتہائی اعلیٰ و ارفع میدانِ عمل کی حیثیت رکھتے تھے ۔ جب آخر کار وہاں تک ان کی رسائی ہو گئی تو انھیں ذوق کو ، جنھیں وہ محض ایک اوسط درجے کا شاعر سمجھتے تھے ، درباری شاعر کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑا ۔ ذوق کے انتقال کے بعد انھیں درباری شاعر مقرر

یا ۔ لیکن ان کے خیال میں انھیں یہ اعزاز حد سے زیادہ تاخیر سے ملا تھا اور اس سے انھیں ہی کچھ فائدہ ہونے کی توقع تھی ۔ ساری عمر انھوں نے اپنی فارسی نظم و نثر کو باعثِ فخر سمجھا تھا اس وقت جب اردو نے فیصلہ کن طور پر ادبی اغراض میں استعمال ہونے والی زبان کی ت سے فارسی کی جگہ لے لی تھی انھیں پتہ چلا کہ بیش تر افراد کے لیے موخر الذکر زبان کے تعلق ان کی عقیدت قدر شناسی سے زیادہ استعجاب کا مقام تھا ۔ فارسی دانی اور اس زبان کا علم و ں ایسی چیز تھی جس کے لیے وہ اپنی شہرت کو خطرے میں ڈالنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے ۔ لیکن میدان میں بھی وہ بار بار دشنام آمیز مناقشوں میں گھسیٹے جانے سے بچ نہ سکے ۔ ان کے دیوانِ اور کلیاتِ فارسی کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے تھے لیکن اس کے دوران شاید ہی انھوں نے وپیہ پیدا کیا ۔ ان کے نہایت ہوش یاری سے لکھے ہوئے تمام مدحیہ قصاید کے صلے میں انگریزوں نھیں ان کی اصل موروثی پنشن سے ایک پیسہ بڑھ کر نہیں دیا ۔ جب کہ مغل بادشاہ کے پاس انی کے علاوہ اور رکھا ہی کیا تھا جو انھیں مرحمت فرماتے ۔ بہ حیثیت شاعر اپنی شہرت کے د غالب نے اپنی زندگی عسرت اور قرض داری میں بسر کی ۔ یہ امر ان کے لیے اور بھی زیادہ ری کا باعث تھا کیوں کہ نہ بھولنا چاہیے کہ ان کے لیے کسی کام یابی کا اندازہ لگانے کے لیے ں حیثیت ماضی کو حاصل تھی جب ان سے کہیں کم درجے کے شعرا کو بھی معمولاً بہ درجہا بیش ت انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا ۔ چناں چہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ اپنی زندگی کے ی سالوں میں جب وہ تنگ دست، مقروض اور بیمار تھے اپنی کام یابیوں کے لیکھے جوکھے پر غور ے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بہ حیثیت شاعر اپنی شہرت کے ثبوت میں سلک کے طور سے نے کے لیے تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا ۔ تاہم مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے سکتے ہیں کہ ان کی آزردگی کا سبب ایک وسیع تر ملال تھا ۔ اس شخص کا ملال جو ماضی میں جینے کو دیتا تھا لیکن اس دور میں جینے پر مجبور تھا جب انقلابِ زمانہ کے جھکڑ نے ماضی کا تو مذکور ہی ال تک کے نظریات و ایقانات کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا ۔

۱۸۶۷ء تک پہنچ کر غالب کی خرابیِ صحت بالکل واضح تھی ۔ جنوری ۱۸۶۶ء میں رام پور سے ں کے سفر کے دوران وہ ایک حادثے سے دوچار ہوئے اور خوش قسمت تھے کہ ان کی جان بچ ۔ پالکی جس میں وہ بیٹھے ہوئے تھے جیسے ہی پار ہوئی پل دفعتاً ڈھ گیا ۔ سامان اور ملازمین جس

گاڑی میں تھے وہ دوسری طرف رہ گئی ۔ ان کا بستر سامان کے ساتھ تھا اور رات کڑکڑاتے جاڑوں کی تھی ۔ غالب ۔نر بہ مشکل ایک سرائے کا پتہ لگایا اور رات خاصی بے کلی میں گزاری ۔ سفر کی مصیبتوں کا ان کے پہلے ہی سے کم زور قوائے جسمانی پر بہت ہی خراب اثر پڑا ۔ اس سال جاڑے میں غیر معمولی سردی پڑی تھی جس پر بارش اور تیز ہوا نے سونے پر سہاگے کا کام دیا تھا ۔ سرائے اور پڑاؤ پر دست یاب کھانا ان کی پسند کا نہیں تھا اور وہ اکثر کھانے کے بغیر ہی گزر کرلیتے ۔ گھر واپس لوٹنے پر ان کی صحت میں کچھ بہتری آئی لیکن افاقہ چند روزہ تھا ۔ پرانے عارضے جو اس سے قبل قابو میں تھے یا کبھی کبھی ہوجاتے تھے دفعتاً شدت کے ساتھ عود کر آئے ۔ قولنج، جس کی انھیں ہمیشہ شکایت رہی، اب مستقل ہوگیا ۔ ان کے جگر کا فعل درست نہیں تھا اور وہ شکایت کیا کرتے کہ انھیں بہت سارا پانی پینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ انھیں بار بار پیشاب کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی : یہ غالباً غیر تشخص مرضِ ذیابطس کی علامات تھیں ۔ ان کی متررہ غذا ، جیسی کہ انھوں نے ایک ماہرِ غذائیات کے نپے تلے انداز سے بے کم و کاست قلم بند کی ہے، دن بہ دن گھٹتی جارہی تھی : " (میری) غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی ۔ قریب شام، کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب ، چھے گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر شراب خانہ ساز (خط بہ نام حبیب اللہ ذکا ۴۰ / دسمبر ۱۸۶۶ء) ۔ اگرچہ یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ اپنے عوارض کے باوجود وہ اب بھی تھوڑی سی شراب پی لیتے تھے ان کا جسمانی انحطاط اب روکے نہ رکتا تھا ۔ ۱۸۶۷ء کے آغاز تک ان کے حافظے نے تقریباً جواب دے دیا تھا اور قوتِ سامعہ بالکل زائل ہوچکی تھی ۔ دل چسپ بات یہ کہ ذہنی طور پر وہ پہلے کی طرح اب بھی چاق و چوبند تھے اور اپنے جسمانی انحطاط کے ہر مرحلے کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے رہتے تھے ۔ ادھر کچھ دنوں سے انھیں رعشے کی شکایت ہوگئی تھی اور ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں ذکر کرتے ہیں کہ رعشہ اتنا شدید ہے کہ وہ کوئی بھی چیز ٹھیک سے پکڑ نہیں پاتے ۔ ۱۸۶۷ء میں وہ شکایت کرتے ہیں وہ اپنے قلم بھی تراش نہیں پاتے ۔ وہ اتنے کم زور ہوگئے تھے کہ بالآخر انھوں نے مان لیا تھا کہ زیادہ تر وقت انھیں بستر پر پڑا رہنا چاہیے لیکن جلد ہی وہ چلنے کے قابل بھی نہیں رہے ۔ ۱۸۶۷ء میں وہ لکھتے ہیں : " ۔ ۔ ۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں ۔ صبح کو دو آدمی ہاتھوں پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں ۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری ، اس میں ڈال دیتے ہیں ۔ تمام دن اس گوشہ ء

… میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی … ستور لے جاکر … پ… سن میں ڈال دیتے ہیں۔"
… نام میاں داد خاں سیاح ۱۱۰ / جون ۱۸۶۷ء) ۔ اس حالت میں بھی، جب تک ممکن تھا، وہ حتیٰ
… بہ غرضِ اصلاح موصولہ اشعار پر توجہ دینے کی کوشش کرتے ۔ لیکن جون ۱۸۶۷ء تک وہ لکھنے
… ابل بھی نہیں رہ گئے تھے اور اس سے وہ خطوط نویسی کے اپنے پرانے ذریعہ تفریح کی مسرت
… جی محروم ہوگئے ۔ اب انھوں نے خطوط لکھانے شروع کیے، جب بھی کوئی دوست فرصت سے
… ہ اس سے یہ کام لیتے ۔ ان کی جواب دیتی ہوئی بینائی اور لرزاں ہاتھوں نے انھیں اس قابل
… رکھا تھا کہ قلم پکڑ سکیں ۔ اشعار اب بھی ان کے پاس بہ غرضِ اصلاح بڑی تعداد میں آتے ۔ وہ
… ان پر کما حقہ توجہ دینے کے معاملے میں پابندِ اصول رہے تھے اور اب ایسا کرنے سے ان کی
… ری ان کے لیے نہایت تکلیف دہ تھی ۔ اگست ۱۸۶۷ء میں تنگ آکر انھوں نے اخباروں میں
… اعتذار چھپوایا تھا لیکن بہ ظاہر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا : "اب تک ہر طرف سے خطوں کے
… ب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاحوں کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں ۔ بوڑھا،
… ، پورا بہرا، آدھا اندھا، دن رات پڑا رہتا ہوں ۔" (خط بہ نام میاں داد خاں سیاح ۲۵۰ /
… ت ۱۸۶۷ء) ۔

افسوس کی بات ہے کہ زندگی کے ان آخری سالوں میں، جب ان کی وفات اتنی قریب … انھیں اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تلخ مناقشے کا صدمہ برداشت کرنا پڑا ۔ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ … ہیں ۱۸۵۹ء میں غالب نے دکنی عالم مولوی محمد حسین تبریزی کی کلکتے سے شائع شدہ مشہور فارسی … ت "برہانِ قاطع" پر معترضانہ تنقید لکھی تھی ۔ ان کی تنقیدی کاوش "قاطعِ برہان" (اور "درفشِ … یانی" کے نام سے شائع شدہ اس کا دوسرا مفصل ایڈیشن) ایران کے مستند ادیبوں کے مقابلے … ہندستانی دبستان کے فارسی میں لکھنے والے ادیبوں کی سند کو معتبر تسلیم کرنے والوں کے تعلق … غالب کے متواتر اور سدا کے اعتراض سے توافق رکھتی تھی ۔ لیکن مولوی محمد حسین ایسے عالم … جن کے ہندستان میں کثیر التعداد پیرو تھے ۔ غالب کی تنقید شدید ناراضگی کا باعث ہوئی ۔ ایک … تک اس کو غالب کی تنقید کے بعض اوقات تمسخر آمیز اور پُر حقارت لہجے سے بڑھاوا ملا ۔ ان کی … قید میں امرِ واقعہ کے تعلق سے بعض صریحی تسامحات بھی تھے ۔ ان کے پُر جوش مداح حالی تک … سلیم کرتے ہیں کہ غالب بعض "لغزشوں" کے قصوروار تھے اور اضافہ کرتے ہیں کہ اس کی وجہ غالباً

یہ تھی کہ وہ بیش تر حافظے کی مدد سے لکھتے تھے اور ان کے پاس " فرہنگ لغات تھی اور نہ کوئی ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیقِ لغات کی بنیاد رکھی جاتی ۔" (یادگارِ غالب، ص: ۴۴) ۔ بہ ظاہر جب غالب نے ان تحشیوں کو وقتاً فوقتاً بہ عجلت لکھا تو غالب کا انھیں شائع کرنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ یہ تنقید بعد میں اپنے دوستوں کی درخواست پر انھوں نے شائع کروائی۔ ممکن ہے کہ اگر غالب نے یہ تنقید اشاعت کے خیال سے لکھی ہوتی تو رائے زنی کے دوران وہ درشتی سے کام کم لیتے اور ان کا رویہ زیادہ محتاط ہوتا۔ دوسری طرف ادبی امور کے تعلق سے اپنے خیالات کے اظہار میں انھوں نے کبھی بھی موقع شناسی سے کام نہیں لیا اور ہوسکتا ہے وہ بہ خوشی منتظر رہے ہوں کہ ان کی پُر زور تنقید معمول سے زیادہ قارئین تک پہنچے گی۔ تاہم اس میں شاید ہی کوئی شک ہو کہ نتیجتاً وقوع پذیر ہونے والے ہنگامے کا انھوں نے صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا۔ ان کی کتاب کے رد میں کئی رسالے منظرِ عام پر آئے اور ایسا لگتا تھا کہ سارا شہر غالب سے محاربت کے لیے تیار ہے۔

حالی کا خیال ہے کہ یہ سارا ہنگامہ اس لیے کھڑا ہوا کہ غالب نے مسلمہ ادبی نظریے پر اعتراض کیا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ دوسرے عوامل بھی تھے۔ غالب کی زندگی میں ادبی قدامت پسند عناصر کے لیے ان کے باعثِ اشتعالِ طبع ہونے کا یا ادبی مناقشے کا مرکزِ توجہ بن جانے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ ۱۸۲۸ء میں کلکتے میں انھوں نے شاید اور بھی زیادہ ڈرامائی انداز میں بھڑ کے چھتّے کو چھیڑا تھا۔ لیکن تب اور اب کے ان دو واقعات کی نوعیت جداگانہ تھی۔ تب ارود فارسی ادب کی باریکیوں پر بحث بیش تر جاگیردار روداروں پر مشتمل چھوٹے سے حلقے تک کم و بیش محدود تھی۔ متوسط طبقات کے نمائندے اور سماجی نظامِ مدارج میں ان سے کم رتبہ ادب میں دخل رکھنے والے افراد اس مباحثے کا دل چسپی کے ساتھ لیکن دور ہی سے مشاہدہ کرنے والوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ شاعری سے لطف اندوز ہوتے تھے، بہتیروں کا مطالعہ کافی وسیع بھی تھا، لیکن بالعموم ان میں سے کسی سے بھی ان امور پر اپنے خیالات کے اظہار کی نہ ہی توقع رکھی جاتی تھی اور نہ ہی انھیں اس کا کوئی خاص موقع دیا جاتا تھا۔ تب ادبی قیل و قال، اختلاف آرا اور نقاطِ نظر کے جواز پر بحث اور معرکہ آرائی زیادہ متانت اور شائستگی کے ساتھ کی جاتی تھی۔ ۱۸۶۵ء تک صنعتِ نشر و اشاعت کے پھیلاؤ اور ذرائع ابلاغ کی ترقی کی بہ دولت ادبی سروکار کا سیلاب شائستہ مشاعروں کی حدود پار کرچکا تھا۔ پرانے سیاسی و سماجی نظام کی شکست و ریخت اور اس کے ساتھ ساتھ وقوع

ونے والے معاشی غلبے کے نقلِ مکان اور آدابِ معاشرت ... سماجی شعور میں آنے والی
یوں نے متوسط اور نچلے طبقوں کو یہ جواز اور موقع فراہم کردیا تھا کہ ان کی بات بھی سنی جائے۔
مباحثے کا چوکھٹا اب قطعی طور پر فراخ ہوچکا تھا اور اسے حسبِ مرضی قابو میں رکھنا یا محدود کرنا
نہ تھا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ مناقشے کے عروج پر پہنچنے پر بعض بدگویوں کی دریدہ دہنی کے
اپنے سماجی رتبے کی دہائی دیتے ہوئے غالب نے ٹھیک یہی کام کرنے کی کوشش کی تھی۔
ایک نکتہ چیں کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "اس نے میرے بارے میں طرح طرح کی
طرازیاں کی ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر غالب عالم و شاعر نہیں تو وجاہتِ خاندانی کی وجہ سے
رتبہ تو رکھتا ہے... ایک ممتاز خاندان کا فرد ہے، ایسا شخص ہے جس سے ہندوستان کے
روسا اور مہاراجہ واقف ہیں اور جس کا انگریزوں کے ہاں رئیس زادوں میں شمار ہے۔" لیکن
طرح کی کوششیں لاحاصل تھیں۔ ۱۸۶۶ء میں پٹیالہ کے امین الدین خاں نے ایک نہایت ہی
تہذیب اور مغلظات سے پُر رسالہ لکھا۔ غالب کا ابتدائی ردِّ عمل اسے نظرانداز کرنے کا تھا
جاتا ہے کہ غالب سے جب کسی نے پوچھا کہ آپ نے اس رسالے کا جواب کیوں نہیں دیا تو
ں نے فرمایا کہ اگر کوئی گدھا آپ کے لات مار دے تو کیا آپ بھی اسے لات ماریں گے؟ ان
معرکہ آرائی کے لیے زیادہ دم خم اب نہیں رہا تھا اور وہ شاید اپنے حسبِ ذیل اشعار کے
ے پر عمل کرنے کی طرف مائل تھے:

نہ سنو، گر برا کہے کوئی
نہ کہو، گر برا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی
بخش دو، گر خطا کرے کوئی

ں رسالے کے مندرجات اس ناقابلِ برداشت حد تک اہانت آمیز تھے کہ دسمبر ۱۸۶۷ء میں
ب نے برطانوی اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں ہتک عزت کا مقدمہ دائر کردیا۔

طرفین کی جانب سے بہ طور گواہ معتبر اشخاص پیش ہوئے۔ غالب کے طرف داروں کی
ت میں لالہ پیارے لال آشوب، حکیم لطیف حسین، مولوی نصیرالدین اور لالہ حکم چند تھے۔ مدعا

علیہ کی طرف سے دہلی کالج میں عربی کے استاد مولوی ضیاء الدین، مولوی سعید الدین اور دیگر چند اہلِ علم پیش ہوئے۔ متنازع فیہ قانونی مسئلہ یہ تھا کہ آیا امین الدین کی کنایتہً لگائی ہوئی چوٹوں کو غیر مبہم طور پر خلاف تہذیب اور فحش گردانا جاسکتا ہے۔ عذرداری کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ رسالوں کے جملوں کی تشریح غالب کے بتائے ہوئے ان کے مفہوم سے مختلف بھی کی جاسکتی ہے۔ ایسا کرنا مشکل نہیں تھا کیوں کہ امین الدین معتبر اہلِ علم کو اپنے حق میں گواہی دینے کے لیے رضا مند کرنے میں کام یاب ہوئے تھے اور دلائل ایک انگریز جج کے سامنے پیش کیے جارہے تھے جس کی موضوعِ بحث سے واقفیت نہیں کے برابر تھی۔ غالب جلد ہی سمجھ گئے کہ موجودہ قانون کی خصوصیات ان کو انصاف دلانے سے قاصر ہیں بلکہ اس کے برعکس حلفی بیانات کا ہر دن معاملات کو بد سے بدتر ہی بنارہا تھا۔ بہ قول حالی غالب کے لیے مولوی ضیاء الدین جیسے لوگوں کے بیانات سننا انتہائی تکلیف دہ امر تھا، جو نہ صرف امین الدین کی لکھی ہوئی بیّن طور پر لائقِ مواخذہ عبارتوں پر لیپ بوت کرکے اپنے علم و فضل کو ایک ذلیل کام میں صرف کررہے تھے بلکہ غالب پر شرابی ہونے اور خوفِ خدا نہ رکھنے کا الزام عاید کرتے ہوئے نہایت اہانت آمیز رائے زنی بھی کررہے تھے۔ چناں چہ ۲۳ / مارچ ۱۸۶۸ء کو غالب نے اس مسلسل اہانت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور مقدمہ واپس لے لیا۔

حالی کے بیان سے اس واقعے کا ایک اہم عنصر سامنے آتا ہے: مناقشہ تو ادبی تھا لیکن غالب پر تنقید بہ تدریج ذاتیات پر حملے کا رنگ اختیار کرتی گئی۔ اس کی تاویل محض اس طرح کے مناقشوں کو روبہ عمل لانے کے مسلّمہ قاعدوں اور معیارات کے فقدان یا اختلاف رائے کے مروج اسلوب کے حوالے سے نہیں کی جاسکتی۔ ایسا واضح تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قدامت پسندی کے حق میں مہم چلانے والے مسلمانوں کے گروہ نے غالب کی منظم مذہب اور تقلید پسندوں کے بااثر گروہ سے عمر بھر کی علی الاعلان بے زاری کی پاداش میں ان پر حملے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اس نوعیت کی مخالفت کا وجود پہلے بھی تھا۔ لیکن انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں صوفی طریقت کا ایسا اثر تھا اور اسے ایسی مقبولیت عامّہ حاصل تھی جس کی بہ دولت غالب اسلامی تقلید پسندی کے علم برداروں کی چلنے نہیں دیتے تھے اور اس کے بعض پُرجوش حامیوں سے مفاہمت اور ان کی طرف سے مروت کی امید بھی رکھ سکتے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد

ـ مسلم فرقے کو ظلم و تعدّی کا بہ طورِ خاص نشانہ بنایا گیا اور اس کے سربرآوردہ افراد کو
یزوں کے قہر و غضب کی کاری ضرب برداشت کرنی پڑی تو فرقے کے بعض ارکان میں مسلّمہ
ب اور اس کے رسوم کی چھتر چھایا کی طرف "بازگشت" یا لوٹنے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس سے مراد
ا کوئی ادعا نہیں ہے کہ کوئی منظم بنیاد پرست تحریک معرض وجود میں آئی تھی بلکہ محض یہ تسلیم
ا ہے کہ جاں کاہ صدمے کے لمحات میں مذہبی فرقے بعض اوقات مذہبی عقائد کی بے چون و چرا
یت میں جائے پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے مراد اس امر پر بھی توجہ دلانا
، کہ اسلامی تقلید پسندوں کا بااثر گروہ گذشتہ دہوں کے دوران مذہبی وسیع المشربی کی قبولیتِ عامہ
وجہ سے فی الواقع کبھی از کار رفتہ نہیں ہوا تھا۔ یہ امر بہ ظاہر معقول معلوم پڑتا ہے کہ ۱۸۸۰ء کے
ہے میں ملاؤں کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ اثر پذیر سامعین مل رہے تھے اور اگر صورتِ حال واقعی
ی تھی تو یہ امر واضح ہے کہ غالب یعنی انیسویں صدی کے ہندستان میں مذہبی تقلید پسندوں کے
ثر گروہ کے نہایت شوخ اور ارادتاً برانگیختہ کرنے والے نقاد کے معاملے میں ایک ادبی مناقشہ
نیات پر حملے کی ایسی زہر آلود تقریب کیوں بن گیا۔ اس مفروضے کو حالی کے اس بیان سے اعتبار
ا ہے کہ اس زمانے میں غالب کو بڑی تعداد میں ایسے گم نام خطوط موصول ہو رہے تھے جن میں ان
ے طرزِ زندگی پر نہایت رکیک اور بے ہودہ الفاظ میں حملے کیے جاتے تھے۔ مزید براں ۱۸۶۶ء تک
ب کے اثر و رسوخ کی ذاتی بنیاد تقریباً نیست و نابود ہو چکی تھی: بادشاہ، جو راسخ العقیدہ مسلمان
نے کے باوجود ان سے مروت کا سلوک کرتے تھے، جلاوطنی میں وفات پا چکے تھے، مسلمانوں کا
یم جاگیردار طبقۂ امرا، جس کے بااثر ارکان ان کی عزت کرتے تھے اور غالب جن کا اپنے ذاتی
باب میں شمار کر سکتے تھے، تباہ و برباد ہو چکا تھا، انگریزوں نے شہر میں حکم رانی کے لیے نئے
ر کائے کار چن لیے تھے، غالب خود بوڑھے، بیمار اور مقروض تھے، جن کی شاہی سرپرستی کے لیے
سائی صرف رام پور تک تھی اور وہاں بھی نئے نواب صاحب ان پر اتنے مہربان نہیں تھے جتنے کہ
ن کے والد مرحوم۔ چناں چہ مختلف وجوہ کی بنا پر "قاطع برہان" والا مناقشہ محض ادب سے متعلق
یک معاملہ نہیں تھا، بڑی حد تک اس نے قدامت پسند مسلم رائے عامّہ کو غالب پر حملے کے لیے
تھیار ٹھیک اس وقت فراہم کیا تھا جب وہ صریحی طور پر بے یار و مددگار اور غیر محفوظ تھے اور جب
دبی مباحث میں شرکت کے دائرے میں توسیع کی وجہ سے معرکہ آرائی میں لوگوں کی زیادہ بڑی

تعداد کو شامل کیا جاسکتا تھا۔ ساری عمر غالب نے واعظ پر طعنہ زنی کی تھی ، اپنے شراب کے شوق کا ڈھنڈورا پیٹا تھا اور رسمی مذہب کے تقاضوں کے تعلق سے اپنی بے پروائی کا برملا اظہار کیا تھا۔ اب ملّا اپنا حق وصول کر رہے تھے۔ ایک لحاظ سے یہ امر حیرت انگیز نہیں ہے کہ ایک ادبی مناقشہ ایسی صورت حال میں متبدل ہوگیا۔ غالب جس بات پر عقیدہ رکھتے تھے اسی کو اپنی تحریروں میں اجاگر کرتے تھے۔ جہاں ان کا تعلق تھا ادبی سطح پر تنقید بہ آسانی بہ حیثیت مجموعی ان کے خیالات پر تنقید کی شکل اختیار کر سکتی تھی۔ عجیب الٹی بات ہے کہ "قاطع برہان" والا مناقشہ اس غالب کا ثبوت فراہم کرتا ہے جو ایک مکمل ادبی شخصیت تھا ، اپنے خیالات سے کلیتہً توافق رکھنے والا شاعر تھا اور ایک ایسا انسان تھا جس کے لکھے میں اور خود اس میں فرق نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ بات ان کے نکتہ چینوں کے لیے خاص طور پر سخت ناگوار رہی ہوگی کہ ان کے حملے کی شدت کے باوجود اظہار ندامت سے انھوں نے انکار کیا۔ شاید اس جوش کے ساتھ جیسا کہ وہ چاہتے رہے ہوں گے ، مقابلہ کرنے کے لیے وہ بہت تھک چکے تھے اور جسمانی طور پر بہت کم زور ہو چکے تھے ، لیکن ان میں اب بھی اتنی طاقت تھی کہ اپنی روحانی بصیرت سے وفاداری پر اڑے رہ کر اپنے بدگویوں کو شکست دے سکیں۔ اس زمانے میں ان کے بعض قریبی دوستوں نے نادانستہ ان کے جذبات کو ٹھیس بھی لگائی۔ حالی بڑے افسوس اور پشیمانی کے ساتھ ذکر کرتے ہیں کہ کم و بیش اسی زمانے میں کیسے اپنی مذہبی ظاہر پرستی کی رو میں بہہ کر انھوں نے غالب کو نماز پنج گانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر دیا۔ غالب نے ناگواری لیکن ثابت قدمی کے ساتھ یہ جواب دیا کہ ہاں میں نے نہ کبھی نماز پڑھی ، نہ روزہ رکھا اور چناں چہ میں ایسا "فاسق و فاجر" ہوں کہ "جب مروں تو میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے ہاتھ پاؤں میں رسّی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جاکر کتّوں اور چیلوں اور کووں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں۔۔۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں : "لا الہ الا اللہ لاموجود الا اللہ لاموثر فی الوجود الا اللہ "

زندگی کے آخری سال میں غالب کو اپنے قرضوں کی ادائگی کی فکر کھائے جاتی تھی جن کی مجموعی رقم ایک ہزار روپے سے کچھ زیادہ تھی۔ چوں کہ ان کا وقتِ آخر صریحی طور پر قریب آچکا

ض خواہ جارحانہ طور پر مصر تھے ۔ قرض ادا کیے بغیر مرجانا بھی ایک اچھے مسلمان کا طریقہ نہیں
الب کے لیے یہ وہ مخصوص صورت تھی جہاں مذہب کی طرف سے دی گئی ہدایت اور شریفانہ
ز آمد میں توافق پایا جاتا تھا ۔ ستم ظریفی ہے کہ وہ شخص جو ساری عمر روپے پیسے کے معاملے میں
ابالی رہا ہو، جان بوجھ کر اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا اور بے دھڑک قرض لیتا رہا ہو، اپنے
دنوں میں حساب چکتا کرنے کے لیے اتنا فکرمند تھا ۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی موت کے بعد
ی ادائگی کی کوئی سبیل نہیں تھی ۔ فی الحقیقت ان کو ایک بہت بڑی فکر یہ تھی کہ کسی ذریعہء
کے بغیر ان کی بیوی کی ان کے بعد گزربسر کیسے ہوگی ۔ بڑے پوتے باقر حسین کو الور میں اچھی
آمدنی کی نوکری مل گئی تھی لیکن ان کے سر ان کے اپنے بال بچوں کی ذمہ داری تھی ۔ چھوٹا
سین علی ابھی تک انھیں کے ساتھ اور بے روزگار تھا ۔ مزید پیچیدگی یہ کہ حسین علی کی شادی
ہو چکی تھی ۔ شادی کو روپے پیسے کی کمی کی وجہ سے باربار ملتوی کرنا پڑا تھا اور یہ صورتِ حال
کے لیے بڑی سبکی کا باعث تھی ۔ ظاہر ہے کہ قرض ادھار سے کام چلانے کا کوئی سوال ہی
تھا ۔ قرض تو اس شخص کو دیا جاتا ہے جس کے پاس ادائگی قرض کے لیے وقت ہو ۔ دوسرا
وسیلہ رام پور کا تھا ۔ جولائی ۱۸۶۸ء میں غالب نے نواب کے پاس تین درخواستیں لکھ کر بھیجیں
یہ کہ ان پر واجب الادا تمام قرضے نواب صاحب ادا کردیں، دوسری یہ کہ حسین علی کی شادی
نتظام کے لیے ایک خصوصی عطیہ مرحمت کیا جائے، اور تیسری درخواست یہ کہ ان کا ماہانہ
پے کا وظیفہ ان کے بعد حسین علی کے نام کردیا جائے ۔ غالب کو اپنے شاہی یا بااثر سرپرستوں
الی امداد کی درخواست کرنے میں کبھی کوئی تامل نہیں ہوتا تھا ۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسا کر کے وہ نہ
مروجہ قاعدوں کے مطابق ایک معزز درباری کا اپنا کارِ منصبی انجام دیتے تھے بلکہ اس طرح
نے سرپرستوں کو اپنے جیسے قابل قدر اور لائق شاعر کو دادودہش سے خوش کرنے کا ایک عمدہ
بھی فراہم کرتے تھے ۔ لیکن اب ان کی درخواست میں ان کے مزاج سے کلیتہً غیر ہم آہنگ
گی اور بے باکی تھی ۔ وہ جانتے تھے کہ اب ان کے آخری دن ہیں اور اپنے روز افزوں بے
خطوط میں وہ وہی ایک راگ الاپتے ہیں کہ نواب صاحب فوری حکم صادر فرمائیں ۔ کچھ عرصے
لیے کچھ امید بندھی جب مرزا خاں داغ نے رام پور میں ان کے حق میں سفارش کی ۔ لیکن نواب
رائے نہ دینے کے موقف پر قائم رہے ۔ جب غالب کا انتقال ہوا تو اس وقت تک رام پور سے

نہ ہی روپیہ پیسہ آیا تھا اور نہ ہی کوئی قطعی وعدہ۔

موت سے کچھ دن پہلے غالب پر وقفے وقفے سے غشی طاری ہوجاتی تھی۔ لیکن تقریباً دمِ آخر تک ان کا ذہن فعّال رہا۔ خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی ان کی موت سے کچھ ہی قبل ان سے ملاقات کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ "وہ (یعنی غالب) ایک مجلّد کتاب (بہ گمانِ غالب دیوانِ قاآنی) سینے پر رکھے ہوئے آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے۔۔۔" خواجہ عزیزالدین کی موجودگی میں غالب کا کھانا لایا گیا۔ خواجہ عزیزالدین رخصت ہونے کے لیے اٹھے لیکن غالب نے انھیں ٹھیرنے کا اشارہ کیا۔ غالب نے ان سے کم زور آواز میں کہا: آپ کی غایت اس تکلیف فرمائی سے یہ تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں، ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے، بصارت کی حالت دیکھی، کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں، سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھ کو خبر نہیں ہوتی، غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا، کلام سنا، اب ایک بات رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں، اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے۔" ان کی جودتِ طبع اور بے مثال حسِّ مزاح آخر تک برقرار رہی۔

ان کے انتقال سے ایک دن قبل حالی ان کی مزاج پرسی کو گئے۔ غالب کئی گھنٹوں تک بے ہوش رہنے کے بعد ہوش میں آئے تھے اور لوہارو والے نواب علاء الدین خاں کو، جنھوں نے ان کی خیریت دریافت کی تھی، جواب لکھوا رہے تھے۔ غالب کا جواب تھا: "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں میرے ہم سایوں سے پوچھنا۔" آخری لمحات میں وہ اکثر اس شعر کا ورد کیا کرتے تھے:

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

۱۵/ فروری ۱۸۶۹ء کو ان کا انتقال ہوا۔ دوپہر کے وقت حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مقبرے کے پاس، لوہارو گھرانے کے خاندانی قبرستان سلطان جی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ اس موقع پر موجود سربرآوردہ لوگوں میں لوہارو کے نواب ضیاء الدین خاں، حکیم احسن اللہ خاں اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ شامل تھے۔ مراسمِ تجہیز و تکفین کے تمام اخراجات نواب ضیاء الدین خاں نے ادا کیے۔ رسمی مذہب سے اس شخص کی ماورائیت کو آخری خراجِ تحسین کے طور پر کچھ

ریپش ہوئی کہ آخری مراسم شیعہ یا سنّی مذہب کے مطابق ادا کیے جائیں۔ نواب ضیاء الدین کے اصرار پر غالب کو اہلِ سنّت کے طریقے کے مطابق دفنایا گیا۔

ان کی بیوی کا ٹھیک ایک سال بعد انتقال ہوا۔

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

○●○

ضمیمہ

[اسداللہ کے مقدمے پر حکومت کے چیف سکریٹری (جارج سوئٹن) کا نوٹ]

۱۹/ اگست ۱۸۳۰ء

اسداللہ خود کو ان متوفی نواب نصراللہ خاں کا بھتیجہ بتاتے ہیں جو جنرل پیروں کے تحت ضلع آگرہ کے حاکم تھے اور جو جنگِ مرہٹہ میں لارڈ لیک سے آملے تھے، جب ان کی پسندیدہ خدمات کے صلے میں ان کو ضلع آگرہ میں استمراری ملکیت میں پندرہ ہزار روپے سالانہ لگان جمع کروانے کی شرط پر بعض علاقے عطا کیے گئے تھے۔ یہ سونک اور سرسہ کے پرگنے تھے جن کی کل آمدنی، جیسا کہ اسداللہ اپنی درخواست میں بیان کرتے ہیں ایک لاکھ روپے سے زائد تھی۔

نصراللہ خاں، متوفی نواب احمد بخش خاں، رئیس فیروزپور وغیرہ کے داماد تھے۔

نصراللہ خاں کے انتقال پر ان کے پس ماندگان ان کی ماں، ان کی بیوہ، تین بہنیں اور دو بیٹے یعنی درخواست گزار اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف علی خاں (یا مرزا یوسف) تھے۔

درخواست گزار مزید بیان کرتا ہے کہ ایک اور شخص خواجہ حاجی نامی تھا جو نصراللہ خاں

ندان سے نہیں بلکہ نصراللہ خاں کی پھپھی کا رشتے کا بھانجہ اور اس طرح ان کا سببی رشتہ دار اہم بادی النظر میں اس شخص نے نصراللہ خاں کے تمام معاملات ناجائز طور پر اپنے ہاتھ میں لے ے اور ان کی وفات کے بعد مبینہ طور پر اس نے متوفی کے اہلِ خاندان کا حق مارنے کی غرض مد بخش خاں کے ساتھ سازش کی۔ نصراللہ خاں کے خسر اور فطری طور پر ان کے اہلِ خاندان سرپرست کی حیثیت سے احمد بخش خاں نے لارڈلیک سے فیروزپور کے تعلق سے اپنے ذمے زر استثنٰی میں نصراللہ خاں کے اہلِ خاندان کی کفالت کا ذمہ لینے کی شرط پر تخفیف حاصل کی رخواست گزار کا ادعا ہے کہ نواب نے غیر منصفانہ طور پر خواجہ حاجی کو نصراللہ خاں کے ن کا اصل شخص مقرر کیا اور اہلِ خاندان کی عمومی کفالت کے لیے پانچ ہزار روپے کی رقم ں کرتے ہوئے اس کو مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم کیا:

خواجہ حاجی کو	دو ہزار روپے
نصراللہ خاں کی والدہ کو	ڈیڑھ ہزار روپے
درخواست گزار کو	ڈیڑھ ہزار روپے

خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد احمد بخش خاں نے دو ہزار روپے کا حصہ متوفی کی اولاد نام جاری رکھا۔ جب (نصراللہ خاں کی) والدہ کا انتقال ہوا تو ان کا حصہ ان کی سب سے بڑی ں (یعنی نصراللہ خاں کی بہن) کے نام منتقل ہوا جو اس میں سے اپنی دو چھوٹی بہنوں کی کفالت ں رہیں۔

درخواست گزار کا بیان ہے کہ اپنے حصے کی رقم سے وہ اپنے چھوٹے بھائی کی کفالت کرتے ہے ہیں، جن کے لیے درخواست گزار کی شکایت ہے کہ احمد بخش خاں نے کفالت کا کوئی انتظام بں کیا تھا۔ تاہم غالباً امر واقعہ یہ ہے کہ اسداللہ خاں کے نام مقررہ ڈیڑھ ہزار روپے کی رقم دونوں ائیوں کی مشترکہ کفالت کے لیے مخصوص کی گئی تھی جس طرح سے کہ بادی النظر میں ڈیڑھ ہزار پے کی دوسری رقم عورتوں یعنی درخواست گزار کی تین پھپھیوں کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔

اب یہ تحقیق کرنا بے فائدہ ہوگا کہ آیا خواجہ حاجی، نصراللہ خاں کے ورثا کے حصہ دار ونے کے مستحق تھے یا نہیں کیوں کہ ۴ / مئی ۱۸۰۶ء کے پروانہ میں جو احمد بخش خاں نے رنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے دست خط اور مہر سے حاصل کیا انھیں ایک فرد خاندان کی

حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن اس امر کی تحقیق فائدہ مند ہوگی کہ آیا جب احمد بخش خاں نے نصراللہ خاں کے اہلِ خاندان بہ شمول خواجہ حاجی کی کفالت کے لیے صرف پانچ ہزار روپے سالانہ کی رقم مختص کی تو کیا یہ عمل ان کی سند کے بہ موجب تھا اور آیا ان کے وارث اور جانشین شمس الدین خاں پر واجب ہے کہ وہاں کی کفالت کے لیے زیادہ رقم کا انتظام کریں۔

اس امر کی تحقیق بھی فائدہ مند ہوگی کہ آیا درخواست گزار کے ادعا کے بہ موجب لارڈ لیک کی سند مورخہ ۶ / جون ۱۸۰۶ء جعلی ہے اور آیا اس معاملے کی پوری طرح چھان بین کی گئی ہے۔

چناں چہ درخواست گزار کی اپنی متعدد عرض داشتوں میں بیان کردہ تمام جزویات میں گئے بغیر، جنھیں تاہم برائے مہربانی نظر امعان سے دیکھ لیا جائے کیوں کہ ان میں بہتیری ایسی معلومات دست یاب ہیں جو میرے خیالِ واثق میں حکومت کے علم میں ہیں، میں یہاں محض ان امور کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو حال میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔

اسداللہ ۱۸۲۸ء میں کلکتہ آئے اور پرشین سکریٹری کے حضور میں ایک عرض داشت پیش کی، ملاحظہ ہو عرض داشت موصولہ ۲۸ / اپریل ۱۸۲۸ء، اندراج مورخہ ۲ / مئی، نمبر ۴۶۔

اس عرض داشت پر یہ حکم صادر ہوا تھا کہ "حکم دیا جاتا ہے کہ مذکورہء بالا درخواست رزیڈنٹ دہلی کے حضور میں پیش کی جانی چاہیے۔"

۲۴ / فروری ۱۸۲۹ء کو رزیڈنٹ دہلی سر ایڈورڈ کول بروک نے حکومت کو اطلاع دی کہ اسداللہ نے میرے ہاں اس مضمون کی ایک درخواست پیش کی کہ "نصراللہ خاں کے انتقال کے بعد، جو تازیست مقرری پندرہ ہزار روپے زرِ استثنیٰ کے عوض پرگنہ سونک اور سرسہ کے مالک تھے، علاقہ جات فیروزپور وغیرہ کے رئیس متوفی احمد بخش خاں سے وصول شدنی زرِ استثنیٰ بیس تا تیس ہزار روپے اس شرط پر معاف کیا گیا تھا کہ احمد بخش خاں، نصراللہ بیگ خاں کے اہلِ خاندان کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے اور یہ کہ اس کفالت کے لیے احمد بخش خاں نے کبھی بھی سالانہ پانچ ہزار روپے سے زاید ادا نہیں کیے، جس میں سے دو ہزار روپے درخواست گزار کی ایک بہن کو ادا کرتے تھے اور درخواست گزار کے بھائی اور پھپھیوں کی کفالت کے لیے کوئی بھی رقم نہیں ادا کرتے تھے۔"

سر ایڈورڈ کول بروک آگے لکھتے ہیں: "احمد بخش خاں کے نام حکومت کی سند مورخہ

مئی ۱۸۰۶ء میں صرف حسبِ ذیل دفعہ کو موضوعِ بحث سے متعلقہ قرار دیا جاسکتا ہے: "خواجہ
ں اور متوفی مرزا نصر اللہ بیگ کے دیگر متعلقین کی پرورش اور کفالت تمھاری ذمہ داری ہے اور تم
ت ضرورت حکم صادر ہونے کے صورت میں سرکار کو مہیّا کرنے کی غرض سے پچاس گھڑسوار
رکھو گے۔"

اپنی رپورٹ کے اختتام پر سر ایڈورڈ کول بروک نے استدعا کی کہ اگر حکومت کے محافظ
نے میں اس معاملے سے متعلق کوئی دستاویزات ہوں تو انھیں ان کی نقول فراہم کی جائیں۔

جواب میں لفٹننٹ کرنل میلکم کے نواب احمد بخش خاں سے طے شدہ معاملے سے متعلق
سلے مورخہ ۴ / مئی ۱۸۰۶ء کا ایک اقتباس ۱۳ / مارچ ۱۸۲۹ء کو رزیڈنٹ دہلی کے ہاں بھیجا گیا اور
سے درخواست گزار کی پیش کی ہوئی شکایت کی جانچ پڑتال کرنے اور اس کے بارے میں اپنی
ئے لکھ کر بھیجنے کو کہا گیا۔

۵ / دسمبر ۱۸۲۹ء کو قائم مقام رزیڈنٹ دہلی مسٹر ہاکنس نے حکومت کی توجہ سر ایڈورڈ کول
ک کے مراسلے مورخہ ۲۴ / فروری کی طرف مبذول کروائی اور مطلع کیا کہ اس کا جواب ابھی
ے موصول نہیں ہوا ہے۔ جواب میں انھیں مطلع کیا گیا کہ جواب ۱۳ / مارچ کو بھیج دیا گیا تھا
ں کے بعد سے معاملے کے بارے میں کوئی رائے موصول نہیں ہوئی اور اس خیال سے کہ اصل
سلہ کہیں بے جگہ نہ رکھ دیا گیا ہو انھیں اس کی ایک نقل فراہم کی گئی۔

گذشتہ ۵ / مئی کو مسٹر ہاکنس نے اسد اللہ کے معاملے میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ معلوم پڑتا
ہے کہ انھوں نے اسد اللہ کی درخواست کو متوفی احمد بخش خاں کے بیٹے اور جانشین نواب
س الدین خاں کے پاس شکایت کے تعلق سے اپنا جواب دینے کی غرض سے بھیجا تھا۔
س الدین کے جواب کا ترجمہ اور لارڈ لیک کا مبینہ شقہ مورخہ ۷ / جون ۱۸۰۶ء جس میں ان اشخاص
صراحت کی گئی ہے جنھیں پانچ ہزار روپے سالانہ کی رقم ادا کی جانی چاہیے، مسٹر ہاکنس کی
رٹ کے ساتھ منسلک تھا، جس میں وہ اپنی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ مدّعی کو اس کے اور
ں کے بھائی مرزا یوسف کے لیے جو کچھ صراحت کے ساتھ لارڈ لیک نے مقرر کیا ہے اور جو، جیسا
وہ کہتے ہیں، نواب شمس الدین ہمہ وقت ادا کرنے کے لیے رضا مند رہے ہیں، یعنی ڈیڑھ ہزار
پے سالانہ کی رقم سے زائد کا کوئی حق نہیں ہے۔

جواب میں گذشتہ ۲۸ / مئی کو حکومت نے واضح کردیا کہ وہ مسٹر ہاکنس کے فیصلے سے متفق ہے۔

۷ / جولائی کو اسداللہ نے ایک عرض داشت بہ زبان انگریزی اس سند کی بنا پر دیے گئے مسٹر ہاکنس کے فیصلے کے خلاف پیش کی جس کے بارے میں درخواست گزار کا ادعا ہے کہ یہ جعلی ہے، جس کے ثبوت میں اس کی استدعا ہے کہ حکومت کے محافظ خانے میں دستاویزات تلاش کی جائیں۔

۲۸ / جولائی کو درخواست گزار نے پھر مسٹر ہاکنس کی کارروائی کے خلاف اس ادعا کے ساتھ شکایت کی کہ اس سے نواب شمس الدین کے حق میں جانب داری کا اظہار ہوتا ہے اور یہ استدعا کی کہ اسے حکومت کے احکام کی ایک نقل عنایت کی جائے۔ اس کے ساتھ اس نے میرے نام ایک مکتوب بھی ارسال کیا، جس کا ترجمہ منسلک ہے اور براہ راست میرے نام اس مکرر التماس کے پیشِ نظر میں نے تمام کاغذات کی جانچ پڑتال کی ہے اور حکومت کو مذکورہء صدر بیان کے ملاحظے کی زحمت دی ہے، بالخصوص اس لیے کہ میرے خیال میں ایسا سمجھنے کی وجوہ ہیں کہ اسداللہ کی شکایت بالکل بے بنیاد نہیں ہے۔

حکومت کے کاغذات میں لارڈلیک کا کوئی شقہ مورخہ ۷ / جون ۱۸۰۶ء دست یاب نہیں ہے۔

ایسا نہیں دکھائی دیتا کہ اصل شقہ مسٹر ہاکنس کے ملاحظے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

مناسب ہوگا کہ ۷ / جون کا شقہ معائنے کے لیے پیش کیا جائے اور اگر اس کے اصلی ہونے کے بارے میں دہلی میں کوئی شک ہو تو اسے صدر کو بھیجا جائے۔

اگر شمس الدین خاں اس مطالبے کو یہ کہہ کر ٹال جانے کی کوشش کریں کہ اصل شقہ تلف ہوگیا ہے تو یہ امر ان کے خلاف قویِ بنائے قیاس ہوگا۔

ہاکنس کے گذشتہ ۵ / مئی کے مراسلے میں پیش کردہ شمس الدین خاں کا جواب نہایت غیر سنجیدہ طرز میں لکھا گیا ہے اور اس میں اسداللہ کے ادعا کی یہ کہہ کر تردید کی گئی ہے کہ وہ تو ایک شاعر ہیں اور ایک شاعر کے لیے مخصوص خیال آرائی کے حق کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

لیکن مناسب ہوگا کہ ہم معاملے پر سنجیدگی سے غور کریں۔

مناسب ہوگا کہ ہم احمد بخش خاں کے نام سند مورخہ ۴ / مئی ۱۸۰۶ء کی جانچ پڑتال

یں، جو اصلی ہے اور جس کی گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے توثیق کی ہے۔ اس کی ایک نقل سرجان میلکم کے اسی تاریخ کے مراسلے کے ساتھ بطور ضمیمہ منسلک ہے۔ اس عطیے کے ذریعے فی الواقع نصراللہ بیگ کے اہلِ خاندان کے لیے سالانہ دس ہزار روپے کی رقم مقرر کی گئی ہے گو کہ بد قسمتی سے سند کے غیر واضح طرزِ بیان کی وجہ سے رقم کا صاف طور پر ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس سند کے ذریعے ایک خاص مقصد یعنی نصراللہ بیگ کے اہلِ خاندان کی پرورش اور کفالت کے عوض میں زرِ استثنا کو پچیس ہزار روپے سے گھٹا کر پندرہ ہزار مقرر کرنے کی منظوری دی گئی ہے۔ اس میں "مذکورہ صدر منہائیوں اور شرائط" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اوپر ان منہائیوں اور شرائط کا ذکر محض عمومی پیرایۂ بیان میں کیا گیا ہے۔ لیکن جب لارڈ لیک نے ۴/ مئی کو یہ پروانہ عطا کیا اور جب اسی مہینے کی ۱۶/ تاریخ کو اس عمل کی توثیق میں حکومت کی طرف سے جواب آگیا تو کیا یہ قرینِ قیاس ہے کہ لارڈ موصوف نے جو اس وقت کان پور میں فروکش تھے ۷/ جون کو احمد بخش کو ایک اور شقے کے ذریعے ماہِ گزشتہ کی ۱۶/ تاریخ کے احکام کی رو سے جو کچھ طے ہوا اس کے بارے میں مطلع کیا ہو؟

تاہم اگر نواب احمد بخش خاں کی درخواست پر (جو اس وقت کان پور میں لارڈ لیک کی خدمت میں حاضر تھے) لارڈ موصوف نے ۷/ جون کا شقہ لکھا بھی ہو تو کیا چند دنوں بعد (یعنی ۱۰/ جون کو) حکومت کے احکام مورخہ ۱۶/ مئی کی وصول یابی کی اطلاع دیتے ہوئے کرنل میلکم یہ رپورٹ نہ بھیجتے کہ نصراللہ کے اہلِ خاندان کی کفالت کے لیے پانچ ہزار روپے کی مختص رقم مقرر کرتے ہوئے احمد بخش خاں کے نام ایک شقہ جاری کیا گیا ہے اور کیا وہ اس کی توضیح نہ کرتے کہ کس بنا پر معاف شدہ زرِ استثنا کی بقیہ پانچ ہزار کی رقم نواب کی جاگیر سے واجب الادا رقم میں دوبارہ نہیں جوڑی گئی؟ لیکن ایسی کوئی رپورٹ دستیاب نہیں ہے۔ اگر دستاویز اصلی ہے تو بعید از قیاس نہیں کہ احمد بخش خاں نے اسے کسی طرح دھوکے یا فریب سے حاصل کیا۔ لیکن اگر اسے لارڈ لیک کی طرف سے جان بوجھ کر صادر کیا ہوا حکم تسلیم بھی کر لیں تو سوال یہ ہے کہ آیا لارڈ موصوف گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے قبل ازیں منظور کیے ہوئے تصفیے میں تبدیلی کے مجاز تھے اور آیا حکومت پر اس کی پابندی لازم ہے؟ میرے خیال میں اس کا جواب نفی میں ہے اور شقہ چاہے اصلی ہو یا جعلی بادی النظر میں نصراللہ خاں کے اہلِ خاندان بہ طورِ وظیفہ زیادہ بڑی رقم کے مستحق ہیں۔

اس نوٹ میں محولہ تمام کاغذات ملاحظے کے لیے منسلک ہیں۔

شرح دست خط

جارج سونٹن

چیف سکریٹری، حکومت

۱۹/ اگست ۱۸۳۰ء

به خدمت:

جناب سی۔ نارسس،

چیف سکریٹری حکومت بمبئی، محکمہء امورِ سیاسی۔

جنابِ والا۔

مجھے عزت مآب نائب صدر کونسل کی طرف سے منسلکہ دستاویزات آپ کے ہاں ارسال کرنے اور یہ استدعا کرنے کی ہدایت دی گئی ہے کہ اصل فارسی دستاویز کے معائنے کے بعد، جس کے بارے میں ایک فریق کا کہنا ہے کہ یہ لارڈلیک کا اصل شقہ ہے اور دوسرا فریق اسے حتمی طور پر جعلی قرار دیتا ہے، عزت مآب گورنر جنرل صاحب اسداللہ کے دعوے کی حقیقتِ حال اور اس شخص کے اس ادعا کے تعلق سے کہ یہ دستاویز یا تو جعلی ہے یا دھوکے فریب سے حاصل کی گئی ہے براہ کرم اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

۲ عزت مآب گورنر صاحب ملاحظہ فرمائیں کہ مذکورہء صدر فارسی شقے کی پشت پر پرشین سکریٹری کے دفتر سے جاری کیے جانے والے مراسلوں کے ساتھ کیے جانے والے عمل درآمد کے برخلاف انگریزی میں کوئی نشانِ تصدیق نہیں ہے۔

۳ مجھے یہ استدعا کرنے کی ہدایت دی گئی ہے کہ اصل کاغذات میرے ہاں واپس بھجوا دیے جائیں اور یہ کہ لارڈلیک کے مبینہ اصل شقے کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ اسے نواب شمس الدین کے ہاں واپس بھیجا جاسکے۔

شرح دست خط

جارج سونٹن

چیف سکریٹری حکومت

فورٹ ولیم

۲۲/ اکتوبر ۱۸۳۰ء

به خدمت :

جارج سونٹن

چیف سکریٹری حکومتِ عالیہ ، مورخہ فورٹ ولیم ، محکمہ ٔ امورِ سیاسی ۔

جنابِ والا !

مجھے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ میں جناب کے اس مراسلے مورخہ ۲۲ / اکتوبر بہ
تعدد منسلکات بابتہ دعویِ اسداللہ خاں کی وصول یابی سے آپ کو مطلع کروں جس میں اس کے
میں عزت مآب گورنر صاحب سے ان کی رائے طلب کی گئی ہے ۔

جواب میں مجھے ہدایت دی گئی ہے کہ عزت مآب نائب صدر کونسل کے ملاحظے میں
رنے کی غرض سے عزت مآب گورنر صاحب کی تجویز مورخہ ۳۰ / نومبر کی منسلکہ نقل ارسال
جس میں انھوں نے امرِ بحث طلب کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے ۔

شرح دست خط

بمبئی محل سی ۔ نارسس

چیف سکریٹری حکومت

عزت مآب گورنر صاحب کی تجویز مورخہ ۳۰ / نومبر ۱۸۳۰ء

میرے خیال میں سند پر لارڈ لیک کے دست خط ثبت ہیں ۔ یہ سند اس وقت حاصل کی گئی تھی
تیرے ایسے امور جو فوجی کارروائی کی وجہ سے معرضِ التوا میں تھے فیصل کیے گئے ۔ شریف النفس
مد بخش خاں پر بہ جا طور پر لارڈ لیک اور ان کی جان پہچان کے سبھی لوگوں کو اتنا بھروسہ تھا اور نیز
باشندے ان کی اتنی عزت کرتے تھے اور مزید برآں وہ اتنے فراخ دل تھے کہ ان کی سیرت ہی کو
ور پر اصول اخلاق کے خلاف ان کے کسی فعل کی تردید میں بہ طور دلیل پیش کیا جاسکتا ہے ۔ اگر
، ایسے افعال سرزد ہوئے ہوتے تو میرے خیال میں بعض متعلقہ فریقوں کی طرف سے شکایتیں
بیش ہوتیں ۔

شرح دست خط

جارج میلکم

کتابیات

BIBLOGRAPHY (ENGLISH) کتابیات (انگریزی)

1. Ralph Russel & Khurshidul Islam : "Ghalib, Life & Letters (London 1969).
2. Akhtar Qamber : "The Last Mushairah of Delhi (a translation of Farhatullah Baig's Delhi ki Alhkri Shama). (New Delhi 1979).
3. Captain Mundy : The Journal of a Tour in India. Vol.1 (London 1832).
4. William Knighton : Tropical Sketches or Reminiscences of an Indian Journalist. Vol.1(London.1855).
5. W.H. Sleeman : Rambles and Recollections of an Indian Official. Vol. 2 (London. 1844)
6. National Archives of India (N.A.I.). Foreign Department Miscellaneous. No.208,

7. Ibid.. Foreign Political Consultations. 23 April 1833, Nos.80 - 81

8. S.A.I. Tirmizi : Persian Letters of Ghalib (New Delhi, 1969).

9. P. Spear : Twilight of the Mughals. (London 1951).

10. Yousuf Hussain : Persian Ghazals of Ghalib. (Ghalib Institute, 19

11. Q. Hyder, S. Jafri : Ghalib And His Poetry. (Bombay, 1970).

12. Emily Bayley : Memoirs. quotd in M.M. Kaye. The Golden Calm. (New York, 1

13. M. Dayal : Rediscovering Delhi. (New Delhi, 1982).

14. Bipan Chandra : Communalism in Modern India. (Delhi, 1984).

15. C.F. Andrews : Zakhullah of Delhi. (London 1929).

16. Philip Woodruffe : Men Who Ruled India. Vol. 1 (London, 1953).

17. Pat Barr : Memsahibs. (London. 1976, New Delhi reprint).

18. M. Sadiq : A History of Urdu Literature (Oxford, 2nd edition).

19. M. Mujeeb : Ghalib (Sahitya Academy, 1970).

20. H. Trevelvan : The India We Left (London, 1974).

21. N. Gupta : Delhi Between Two Empires (Oxford, 1981).

22. Veena Talwar Oldenberg : The Making of Colonial Lucknow. (Princeton, 1

23. Meenakshi Mukerjee : Reality And Realism. Indian Women As Prostagonists in Four Novels. Econimics And Political Weekly, Jan 14th 1984. Vol. XIX. No.2,

24. Annemarie Schimmel : A Dance of Sparks (Vikas, 1979).

25. Mahdi Hussain : Bahadur Shah II and the War of 1857 in Delhi. (Delhi, 19

26. Syed Mobarak Shah's narrative (trans. R.M. Edwards).

27. Curzon. Speeches. (Calcutta, 1900). Vol.I,

28. E. Hare : Memo of the Siege of Delhi. Kaye manuscripts, Commonwealth Office Library. Home Miscellaneous, No. 726.

29. C.J. Griffith : Narrative of the Siege of Delhi. ed. H.J. Yonge. (London, 1914).

30. Charles Raikes : Notes on the revolt in the N. Western provinces of India. (London. 1858).

31. N. Gupta : Military Security and Urban Development.

32. By An Old Indian : Calcutta to the Snowy Range. (London, 1866).

33. A. A Beg : Life and Odes of Ghalib. (Lahore, 1940).

BIBLIOGRAPHY (URDU) کتابیات (اردو)

١ دیوانِ غالب ، اردو : مرتبہ نور بنی عباسی ، غالب انسٹی ٹیوٹ ، ۱۹۸۵ء

٢ الطاف حسین حالی: یادگارِ غالب ۔

کتاب کے اردو ایڈیشن کے لیے بیش تر حسبِ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:

١ ڈاکٹر تنویر احمد علوی : اوراقِ معانی ، اردو اکادمی ، دہلی ۱۹۹۲ء

٢ ڈاکٹر سید معین الرحمن : غالب اور انقلابِ ستاون ، غالب انسٹی ٹیوٹ ، نئی دہلی ۱۹۸۸ء
(بہ شمول "دستنبو" ترجمہ: رشید حسن خاں)

٣ غالب کے خطوط ، مرتبہ خلیق انجم ، جلد اول تا چہارم ، غالب انسٹی ٹیوٹ ، نئی دہلی ۱۹۹۳ء

نوٹ : فارسی خطوطِ غالب اور "دستنبو" کی محولہ عبارتوں کے اردو تراجم کے لیے مترجم ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور جناب رشید حسن خاں کا شکر گزار ہے جن کی محولہ بالا کتابوں سے یہ تراجم لیے گئے ہیں ۔ غالب کی فارسی مثنوی "چراغِ دیر" کے محولہ اشعار کا اردو ترجمہ اختر حسن مرحوم کا ہے بہ جز دو اشعار کے جن کی نشان دہی ستارے (★) کے نشان سے کی گئی ہے ۔ ان کا ترجمہ مضطر مجاز نے کیا ہے ۔ ○●○